مرتبہ: دیا نراین نگم، بی۔اے،

نمبر ۱	جنوری ۱۹۳۵ء	جلد ۶۴

فہرست مضامین

تصاویر: تاج محل کا تخیل (رنگین) ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور۔ مہارتیند و ہریشچند۔

[illegible]

تاج محل کا تخیل

جلد ۶۴ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء نمبر ۱

ٹیگور کی شاعری

(از جناب سید مقبول حسین احمد پوری بی اے)

محبت ایک روحانی احساس ہے جس کی ایک کیفیت کا نام جذبہ ہے، عہد جدید کے علمائے علم النفس کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ حواس خمسہ دراصل ایک ہی کیفیت کی مختلف صورتیں ہیں اور[1] اصل شئے روح ہے۔ یہ حقیقت ہندوستان کے قدیم رشیوں کو پہلے ہی سے معلوم تھی کہ روح کان سے سنتی اور آنکھ سے دیکھتی ہے، اس کی نمایاں ترین مثال عہد موجودہ کی وہ علمی تحقیقات ہے جس کو نغمۂ الوان (Colour Music) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور جس کو حقیقت میں بصارت و سماعت کی تموجی کیفیتوں کا سنگم کہنا چاہئیے۔

شعر بھی انھیں کیفیات کا ایک نمونہ ہے اور جو شخص روزمرہ بول چال کو کیفیت کے سانچے میں ڈھال کر روح کو متاثر کرسکے وہی سچا شاعر ہے۔ چونکہ محبت بھی ایک قسم کا انسانی احساس ہے اسلئے حقیقی شاعر کو کسی شئے سے نفرت نہیں ہوسکتی۔ اُسے گناہ میں بھی حقیقی محبت کا پہلو نظر آتا ہے وہ کوئی دیوتا یا ولی، ریفارمر یا مُدبّر نہیں ہے[2] اور نہ نقاد یا مفسّر ہے۔ عالم خیال میں تمام دنیا بلکہ کل کائنات

---

[1] ملاحظہ ہو چھاندوگیہ اپنشدھ کے باب ششم کا مکالمہ جس کا یہ شبد قابل غور ہے:-

"آتم دیو کی ایک عجیب ترین خاصیت یہ ہے کہ جو شئے اُسمیں اددپت (منعکس) ہوتی ہے وہ اُسی کا رنگ قبول کرتی ہے۔"

خواہ اس انعکاس پر علم وجہل کے روشن و تاریک پہلوؤں سے غور کیا جائے یا محض وجدانی کیفیت یا احساس کے لحاظ سے۔

[2] نوٹ صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ ہو۔

اُسی کی ہے، جہاں جہاں دل کی حکمرانی ہے وہاں اُس کی شاعری کا سکّہ بھی رواں ہے۔ گو بمقتضائے بشریت اُس کے ذاتی فرائض کا دائرہ کسی خاص شعبۂ زندگی تک محدود ہوتا ہے۔

شاعر کی روح ایک طائرِ خوش نوا ہے جس کا نغمہ کسی سامع کا محتاج نہیں، بہ لحاظ بشریت اس کے دل میں یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ اس کی داستان کا کوئی سننے والا بھی ہو۔ اس کمزوری کا ایک پہلو شہرت کی خواہش ہے جو ایک ربّانی قوت کے ماتحت کارفرما ہوتی ہے، اور جب وہ ربّانی قوت اس خواہش کو مغلوب کرکے احساس روحانی کو اپنے رنگ میں رنگ کر بھولی بسری کیفیتوں کو اپنے مرکز کی طرف مائل کر لیتی ہے تو یہ مخصوص احساس اپنی معراج پر پہونچ جاتا ہے، پھر کسی خاص "رُخ" کی حاجت نہیں رہتی، سامنے قبلہ ہوتا ہے خواہ کوئی نماز پڑھے یا پروانہ وار طواف کرکے تصدّق ہو جائے۔

دنیا میں سبھی اس کعبۂ مقصود کو ڈھونڈھتے ہیں، کون قدم ہے جو اس کی طرف نہیں دوڑتا، اور کون شخص اس کی یاد میں غمگین نہیں ہوتا مگر سب کا مقصود ایک ہونے پر بھی اس کے حصول کے ذرائع مختلف ہیں۔ دنیاوی قبیلے کا طواف تو کسی بڑے طواف کی مشق اولین ہے۔ شاعرانہ احساس بھی کسی بڑے احساس کا ابتدائی مرحلہ ہے اور دنیوی محبت عشق حقیقی کی ایک ادنیٰ کیفیت ہے۔

سچا شاعر شہرت کا متمنّی نہیں ہوتا بلکہ اس کی شہرت طلبی میں ایک آرزو پوشیدہ رہتی ہے جو ممکن ہے واضح طور پر اسے محسوس نہ ہوتی ہو۔

اس تمہید کا بظاہر اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن مہرشی رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس حقیقت سے واقفیت ضروری ہے۔ مئی ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے جب ملک کی موجودہ سیاسی حالت کے متعلق لوگوں نے آپ کی رائے معلوم کرنے کی خواہش کی تو آپ نے فرمایا کہ "کیا ایک شاعر اس قسم کی باتیں سمجھنے کا اہل ہو سکتا ہے" واقعہ تو یہی ہے کہ کسی شاعر کو دنیا کے مزخرفات سے تعلق رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ تاہم بہتیرے آدمی ٹیگور کو سیاسی لیڈر سمجھتے ہیں اور بعضے اُن کی گوشہ گیری کے شاکی ہیں، اکثر نقادانِ فن بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ قدیم ایشیائی شاعری کے قدردان ٹیگور کے کلام میں تصوف کے متلاشی رہتے ہیں بعض برگشتہ خاطر اُن کی نیچریت کے معترف ہیں۔ بعض لوگوں کو ٹیگور کے کلام میں سیاست ہی سیاست نظر آتی ہے، لیکن اہل دل کے لئے اس میں جذبات ہی جذبات ہیں۔ افسوس اُردو زبان میں اس لفظ (جذبات) کی مٹی پلید ہوئی ہے اور بعض اصحاب اس سے جو مفہوم سمجھتے ہیں اس پہ

لہ ٹیگور اسکول کی شاعری اردو زبان میں آکر غلط فہمیوں کا نشانہ بن گئی ہے جس کی ذمہ داری ہمارے اہل قلم پر ہے۔

بیساختہ ہنسی آتی ہے۔ بہرحال اس کے حقیقی مفہوم پر بہت کم غور ہوتا ہے۔ تصوف اب اُردو زبان میں پرانی چیز ہو گئی ہے۔ لیکن بقول پروفیسر براؤن دنیا کا کوئی مذہب اس سے خالی نہیں ہے اور یہی تصوف کی خصوصیت ہے۔ بھگتی یا خدا کی تلاش، تمام دنیا کا مقصودِ اعظم ہے۔ گیتانجلی کا اقتباس ذیل ملاحظہ ہو۔ مہرشی ٹیگور بھی "تصوف" سے یہی مراد لیتے ہیں۔

"میرے سفر کی مدت دراز اور منزل کی راہ دُور ہے، میں سورج کی پہلی کرن کے رتھ پر آیا تھا، دنیا بھر کے بیابانوں میں بادیہ پیمائی کر چکا ہوں، صدہا ستاروں اور سیاروں پر اپنے نقش قدم چھوڑ آیا ہوں لیکن میرا قرب ہنوز دُور ہے اور وہ راستہ جو منزل مقصود تک جاتا ہے بہت نازک ہے مسافر کو منزل تک پہونچنے پر ایک دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹانی ہوگی، کیونکہ کوئی رہرو دنیا بھر کی خاک چھانے بغیر اس کعبۂ دل اور سجدہ گاہِ روح تک نہیں پہونچ سکتا ہے۔

میری نگاہیں ہر طرف دُور اور نزدیک بھٹک چکی ہیں، مگر اب جو میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اُس کو ہر جگہ موجود پاتا ہوں۔

یہ سوال کہ "تو کہاں ہے؟" آنسوؤں کی صدہا ندیوں میں حل ہو گیا۔ دنیا کے ذرہ ذرہ سے صدا آرہی ہے کہ ارے میں یہاں ہوں'

کیا اس تصوف اور منصور کے تصور میں کوئی فرق ہے؟ زمانۂ حال میں شریعت کا وہ زور نہیں کہ ٹیگور کو دار و رسن کا سامنا کرنا پڑے۔ ایک افسانے کے سلسلے میں ٹیگور نے اسی فلسفے کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے:۔

"ایک متوسط الحال بنگالی خاندان یعنی میاں بیوی، خاوند ضرورت سے زیادہ کفایت شعار ہے۔ بیوی نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس کے بخل کو برداشت کر رہی ہے، کچھ دن بعد گھر میں ایک نیا مہمان یعنی ننھا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ بیوی کو مجبوراً بچے کی تعلیم کے لئے حج کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بڑے میاں اس خدمت پر مامور ہوئے مگر لڑکا شریر ہے، اُن کی تعلیم و تربیت پر مطلق دھیان نہیں دیتا۔ چند روز بعد ان کے بجائے ایک غریب نوعمر طالب علم جو اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا ہے ماسٹر مقرر ہوتا ہے، اُستاد و شاگرد کی عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے اس لئے دونوں میں دوستی ہو جاتی ہے۔ قصہ مختصر کچھ دنوں بعد اُستاد کہیں ملازم ہو جاتا ہے، شاگرد سے اس کی دوستی قائم رہتی ہے مگر یہ بڑے کاریگر ہو گئے ہیں، چنانچہ ایک دن اپنے اُستاد کی نگاہ بچا کر اس کے مالک کی ایک امانتی رقم چُرا کر رفو چکر ہو گئے۔ نوعمر اُستاد مواخذہ کے خوف سے مجسّم غم بن جاتا ہے اور پولیس کا خوف دامنگیر ہے مگر اُسے کوئی پناہ نہیں ملتی۔ اس وقت

اُس کا کوئی ہمدرد نہیں ہے اور وہ اپنی زندگی سے عاجز ہے، لیکن ایک خیال سے کچھ ڈھارس بندھتی ہے اور وہ یہ کہ اس کی ماں ضرور اُسے اپنی آغوشِ محبت میں لیلے گی لیکن آہ وہ بھی موجود نہیں۔ یہ خیال کرتے ہی غریب کا سر چکرانے لگتا ہے۔ اتنے میں ایک گاڑیبان نظر آتا ہے یہ اُسے بلاکر کہتا ہے کہ مجھے کھلے میدان کی طرف لے چلو یہ کہہ اور ایک روپیہ دیکر وہ اُس کی گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے اور گاڑی چلنے لگتی ہے۔ اس وقت سرد ہوا چل رہی ہے۔ یہ کھلی ہوئی کھڑکی پر اپنا سر رکھدیتا ہے جس سے کچھ سکون حاصل ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، خواب میں اُسے اپنی ماں دکھائی دیتی ہے جو اسے آغوش میں لے لیتی ہے، رفتہ رفتہ یہ آغوشِ محبت اس کے ساتھ ہی تمام کلکتہ کو گھیر لیتی ہے اور کلکتہ ہی نہیں بلکہ تمام دنیا و مافیہا اس آغوشِ محبت میں سمٹا ہوا نظر آرہا ہے۔ سامنے گھڑی میں ایک بجا۔

رات کا سنسان وقت تھا،

گاڑیبان نے آواز دی، بابوجی! بابوجی! میں کہاں چلوں۔

میرے گھوڑے تھک گئے، بابوجی!

مگر بابوجی تو تمام کائنات میں پھیلے ہوئے تھے۔"

یہ ٹیگور کے تصوف کا نمونہ ہے۔ اب ان کی "نیچریت"۔ ملاحظہ ہو، گیتانجلی نمبر ۷۴:۔

" دن ختم ہو گیا، تاریکی کا سایہ تمام زمین پر پھیل گیا، اس وقت میں ندی کے کنارے صراحی بھرنے جاتا ہوں۔

شام کی ہوا پانی کے اُداس نغمے سے ہم آہنگ ہے، آہ مجھے دھندلکے میں بلاتی ہے، مگر سنسان گلی میں کوئی راہرو موجود نہیں ہے۔

ہوا نہایت تیزی سے چل رہی ہے اور دریا کی لہریں بھی سطح آب پر تیزی سے دوڑ رہی ہیں، کیا معلوم میں گھر لوٹ سکونگا یا نہیں، خبر نہیں کس سے ملنے کا اتفاق ہو۔ ندی اُترنے کے مقام پر ایک چھوٹی سی کشتی میں کوئی سُریلی بانسری بجا رہا ہے۔"

بادی النظر میں یہ ایک عام نیچرل سینری کا چربہ ہے کیونکہ دُور کی بانسری کی آواز تو اُردو زبان کے شعرا کو بھی جو ابھی تک معشوق کے زلف میں گرفتار ہیں سُہانی معلوم ہوتی ہے لیکن گیتانجلی کے آخری جملے کبھی مایوسی کا خیال پیدا ہی نہیں ہونے دیتے۔ واقعی جب زندگی کی دھوپ ختم ہونے کے بعد عدم کی تاریکی چھا جائیگی تو شہر خموشاں کے سناٹے میں اُسی نامعلوم شخص کی بانسری کا محبت بھرا نغمہ عدم و

ہستی کی فضاؤں میں تحلیل ہوتا ہوا معلوم ہوگا اُس وقت معلوم ہوگا کہ یہ نام نہاد نیچریت کچھ اور ہی چیز تھی۔ راقم الحروف نے ٹیگور کے اس خیال کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے، ملاحظہ ہو:۔

رات چاندنی، شام سنہری، چاند آوے اور سورج جاوے

ندی کنارے گھاٹ کے اوپر، دُور، بانسری کوئی بجاوے

کیا جانے رو ٹھے من کو بنتی کر کے کون منا وے

سچ ہے جیون مرن کے بھید کو کب کسی پنڈت نے پہچانا جی کر ایک پپیہے نے اور مر کر تتنگ نے جانا

غرض ٹیگور کا فلسفۂ نیچر یا تصوف بہت دلچسپ شے ہے، رہے "جذبات" وہ عام چیزیں ہیں، دلائل و براہین کا تعلق علم النفس سے ہے لیکن جذبہ دراصل مفارقت کی ایک کیفیت کا نام ہے جو یاس و سکون سے وابستہ ہوتا ہے اور جس کی تفصیل اشعارِ ذیل سے ہوتی ہے:۔

وداعِ یار و دیارم چو بگذرد بہ خیال　　شود منازلم از آبِ دیدہ مالا مال

فراق را نفسے چوں ہزار سال بود　　ببیں کہ چوں گذرد روز و ہفتہ و مہ و سال

یار و دیار کا خیال ایک طرف خوشی کا باعث ہو رہا ہے دوسری طرف جذبۂ محبت کو بیدار کر رہا ہے جس سے سکون کی کیفیت بھی حاصل ہوتی ہے، بہادر شاہ ظفر کے اشعار ہیں:۔

کیا مقدر نے دُور مجھکو وطن سے احباب سے مکاں سے　　کہ ایک مدت سے بےخبر ہوں چمن سے گلشن سے آشیاں سے

ہماری سیت پر آگئے ہو تو اب پلٹنا نہیں مناسب　　لحد تلک اور ساتھ چلئے سبھی چلے آئیں گے وہاں سے

یہ اشعار بھی اگر ایک طرف یاس و حرماں کی کیفیت لئے ہوئے ہیں تو دوسری طرف بیداریِ روح کا سامان بھی ان میں موجود ہے۔ ذیل کی سوہل بھی اسی خصوصیت کی پیاری تمثیل ہے:۔

ہری سنگھ بیاہ رچو رنگنا

آؤ رے بہنا　　بیٹھو مورے انگنا

کھولو رے پوتھی　　بچارو مورے لگنا

ہری سنگھ، ہری سنگھ، ہری سنگھ، سنگھنا

ہری سنگھ بیاہ رچو رنگنا

ہری سنگھ منگنی　　ہری سنگھ منگنا

آؤ رے بیرن　　لاؤ مورے کنگنا

ہری سنگھ، ہری سنگھ، ہری سنگھ سنگھنا

ہری سنگھ بیاہ رچو رنگنا!

اپنی بہن　　سہیلیاں　　محلہ والیاں

اِس میں بھی ایک طرف ماں باپ بھائی بہن کی جُدائی کا خیال اُن کی محبت کے جذبے کو بیدار کر رہا ہے، دوسری طرف شوہر کے گھرانے کا خیال فراق کی آگ کو بھڑکا رہا ہے اور جو خوشی اور سکون اس میں نمایاں ہے وہ بالکل ایک سطحی پہلو لئے ہوئے ہے۔ مہرشی ٹیگور کی تصانیف میں اس قسم کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں۔ اس وقت دیہات کا ایک عام مگر نہایت سُہانا گیت یاد آگیا جس کی ابتدا یہ ہے:۔

مہاراجہ کنوڑیا کھولو　　　رس کے بوندا پڑے!

یہاں اس کو تمام و کمال لکھنے کی ضرورت نہیں، لیکن اسے ٹیگور کے مندرجہ ذیل نغمہ کی تمہید سمجھنا چاہیئے، لکھتے ہیں:۔

"بادل اُمڈے چلے آتے ہیں، اندھیرا پھیل رہا ہے۔

اے میرے دل کے مالک تو مجھے حالتِ انتظار میں اکیلا دروازے پر کیوں روکے ہوئے ہے۔

اگر تو مجھے اپنا رخِ زیبا نہیں دکھاتا بلکہ اس طرح الگ تھلگ چھوڑے دیتا ہے تو پھر میں موسلا دھار بارش کے ان دراز لمحوں کو کیسے گذار سکونگا۔

میں دُور دراز آسمان کے اُس اندھیرے پر نظر قائم کئے ہوں اور میرا دل اُس بے چین ہوا کے ساتھ آہ و بکا کر رہا ہے۔"

اسمیں وصل کی تمنا کا اظہار ہے اور فصل تو موجود ہی ہے، دونوں کی اتصالی کیفیت بذات خود ایک پیام سکون ہے۔ لیکن جذبات کی بہترین مثال ٹیگور کا وہ افسانہ ہے جو "گھر آنے" (Home-Coming) کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا خاکہ یہ ہے:۔

"دو بھائی تھے، بڑا بھائی لڑکوں کے ایک گروہ کا پیشرو تھا، ایک دن کھیل ہی کھیل میں دونوں بھائیوں میں کچھ تکرار ہو گئی، چھوٹے نے بیوہ ماں کے پاس جا کر بڑے کی جا بیجا شکایت کی، ماں نے اس کو بلا کر بُرا بھلا کہا۔ اسی اثنا میں لڑکوں کا ماموں بھی آگیا، اور بڑے لڑکے کو اپنے ساتھ لے گیا۔ لیکن لڑکا سیلانی مزاج واقع ہوا تھا، کچھ ممانی کے لعن طعن سے اور کچھ مروجہ تعلیمی نظام کے جکڑبندیوں سے اُسے بڑی تکلیف ہوئی، ماں کی جدائی، وطن سے دُوری، دوستوں کی مفارقت اور مُمانی کے جلے کٹے فقرے سوہانِ روح ہو گئے۔ اس پر پڑھنے لکھنے کی فکر نے آگ میں ایندھن کا کام کیا، وہ زندگی سے عاجز تھا ایک دن اُس نے اپنے ماموں سے پوچھا کہ مجھے گھر کب بھیجو گے جواب ملا تعطیل میں، مگر ابھی تعطیل کے کئی مہینے باقی تھے آخر ایک

روز اُس کی مُمانی نے اُسے پھر بُرا بھلا کہا جس سے اس کو دلی تکلیف ہوئی، سر میں درد ہونے لگا بخار آ گیا، وہ خود گھر جانے کے لئے تیار ہوا لیکن پانی برسنے لگا، غریب بُری طرح بھیگ گیا۔ بخار دُونا ہو گیا اور گھر کی یاد میں وہ کہیں لڑکھڑا کر گر گیا، ماموں نے تلاش کیا، نہ پایا، آخر پولیس کی امداد سے ملا، ماموں اُسے اُٹھا کر گھر لے آیا، مُمانی اس حالت پر بھی لعن طعن سے باز نہ آئی، مرض بڑھتا گیا۔ آخر حالت بہت ابتر ہو گئی۔ ڈاکٹر بلایا گیا، جس نے حالت ناگفتہ بہ بتلائی۔ دراصل لڑکے پر سرسامی کیفیت طاری تھی، علالت کی خبر پا کر ماں بھی آ ئی۔ دروازہ زور سے کھول کر کمرے میں داخل ہوئی اور بھرّائی ہوئی آواز سے چلائی کہ "میرے بچے، میرے جگر کے ٹکڑے، میرے لعل!" ——— بچّے نے آہستہ سر کو حرکت دی اور کچھ دیکھے بغیر کہا "اماں! تعطیل کا زمانہ آگیا!"

اتنے میں دنیوی زندگی کی تعلیمگاہ اُس کے لئے بند ہو گئی اور اُس کی سیلانی روح نے جسم کے بندھنوں کو توڑ دیا۔"

اس سے بڑھکر مفارقت کی کوئی دوسری کیفیت پیش کرنا جو یاس وسکون کے اتصال سے وابستہ ہو مشکل ہے۔ بہر حال جذبہ کے اصطلاحی مفہوم کی اس سے بخوبی تشریح ہوتی ہے۔ دراصل یہ ایک روحانی کیفیت ہے جسے اصطلاح میں آپ جذبہ کہہ سکتے ہیں۔ ہنگری اسٹونس (Hungary Stones) میں اس قسم کی متعدد جذباتی کہانیاں ہیں جو کابلی والے" کے قصّے کی طرح حقیقی جذبات پر مبنی ہیں۔

ٹیگور کے تصوف، فلسفہ اور جذبات کا اندازہ متذکرہ بالا مثالوں سے کم وبیش ضرور ہو گیا ہو گا اب ان کے سیاست وپالیٹکس پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہیئے۔　　　اکثر احباب ادب کے معاشری پہلو کو سیاست سمجھتے ہیں اور مفہوم کی غلط فہمی سے حیات ظاہری کو حیات باطنی سے کوسوں دُور تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پہلو جو زندگی کی جدوجہد کا رنگ لئے ہوئے ہو سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ٹیگور دراصل مشرقی روحانیت کو مغربی جمہوریت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی کیفِ روحانی کی ایک صورت ہے جو زندگی سے ہم آہنگ ہو کر اس طرح نمودار ہوتی ہے۔ مہرشی ٹیگور نے اس کیفِ روحانی کو دو طریقوں پر زندگی کے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایک کی بنیاد محض کیفیت پر ہے اور دوسری حُسن وخوبصورتی کا پہلو لئے ہے۔ اور یہ ٹیگور کے ایک کامیاب نقاش اور حقیقی مصوّر ہونے کی بدولت ہے انکے کلام میں جو روحانی کیف پیدا ہوتا ہے اُس کی بنیاد نغمۂ روح اور وجدانِ طبیعت پر ہے۔ ٹیگور اپنے وقت کے ایک کامیاب مغنّی

بھی ہیں اور اس اعتبار سے اُن کو خضرِ عصر کہنا بیجا نہ ہوگا۔

غرض یہ جذبہ جو دراصل منتہائے مقصودِ حیات ہے اور سطحی طور پر سیاسی جذبہ سمجھا جاتا ہے تمدنِ جدید کی جان اور مسیحی عقیدے یعنی "Mellinium" کا معراجِ کمال ہے۔ اس کی تمثیل گیتانجلی کا وہ مشہور نغمہ ہے جس پر ہمارے ممدوح کو "نوبل پرائز" ملا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ اس نظم کو اردو میں ترجمہ کرکے ہدیۂ ناظرین کیا جائے۔ اسی لئے ان جذبات کو اردو میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی پہلے انگریزی عبارت ملاحظہ ہو، ٹیگور فرماتے ہیں:-

Where the mind is without fear
and the head is held high,

Where knowledge is free,

Where the world has not been broken up
into fragments by narrow domestic
walls;

Where words come out from the depth of
truth;

Where tireless striving stretches its arms
towards perfection;

Where the clear stream of reason has not
lost its way into the dreary desert sand
of dead habit;

Where the mind is led forwards by Thee
into ever-windening thought and
action ·····

Into that heaven of freedom,
my Father, Let my country awake!

ترجمہ

جہاں دل کو ہو خوف سے بے نیازی
جہاں سربلندی سے ہو سرفرازی
جہاں علم ہو عام اور مفت حاصل
گھروں میں نہ دیوارِ تفریق حائل
جہاں گفتگو ہو کھری اور مدلل

جہاں سعی ہو کاوشوں کی مکمل
جہاں عقل کی بات جی میں سمائے
نہ خُو اور خصلت سے بیکار جائے
تری رہنمائی سے تخیلِ انساں
جہاں ہو عمل اور وسعت کی خواہاں
خدایا اُس عالم میں بیدار کردے
ہمارے وطن کو خبردار کردے!

حقیقی آزادی دراصل ایسی ہی آزادی ہے۔ شاعر چاہتا ہے کہ جیسا اُس کا دل ہے ویسا ہی سب کا دل ہو جائے۔ اے کاش یہ خوبصورت شاعرانہ دعا بارگاہ احدیت میں قبول ہو جائے اور ہمارا ہندوستان جس نے حقیقی آزادی کو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا واقعی دنیوی جنت ہو جائے۔ دراصل یہ مناجات ہندوستان کے ہر باشندے کی (بلا امتیاز مذہب وملت) دعا اور جزوِ عبادت ہو سکتی ہے۔

حسنِ معاشرت کا حقیقی نمونہ دیکھنے کے بعد اسکا شاعرانہ پہلو بھی دیکھیے۔ جیسا اوپر لکھا گیا ہے ٹیگور ایک کامیاب نقاش اور حقیقی مصور ہیں چنانچہ اس کا اثر ان کی انشا پردازی پر بھی پڑنا ضروری ہے، ان کی تصنیف "گارڈنر" (Gardner) میں ایسے صدہا نغمے ملیں گے جو حسنِ خاموش کہے جا سکتے ہیں، خصوصاً ذیل کا مکالمہ:-

"خادم: ملکہ مجھ پر رحم کرو

ملکہ: کچہری برخاست ہوگئی ہے اور میرے سب ملازم چلے گئے، تم اتنی دیر کرکے کیوں آئے؟

خادم: کیا کروں اُن سب کے رخصت کے بعد میری حاضری کی نوبت آئی، میں یہ درخواست لیکر آیا ہوں کہ آپ کون سی خدمت اپنے اِس خادم کے سپرد کرنا چاہتی ہیں؟

ملکہ: جب تم اتنی دیر میں آئے تو تم سے کیا توقع کیجائے۔

خادم: مجھے اپنے باغ کا مالی بنا لیجئے۔

ملکہ: یہ کیا احمقانہ درخواست ہے۔

خادم: میں اپنے سب کام چھوڑ دونگا، اپنے برچھی بھالے سپرد خاک کردونگا، مجھے دور دراز ملکوں میں نہ بھیجئے، مجھے نئی مہموں کو سر کرنے کے لئے مامور نہ کیجئے بلکہ اپنی پھلواری کا مالی بنا لیجئے۔

ملکہ: تمہارے فرائض کیا ہونگے؟

خادم: آپ کی فرصت کے دنوں میں خدمتگذاری کرنا، ہری بھری روشوں کو تر و تازہ رکھنا، جن پر آپ ہر صبح ٹہلیں گی، اور جہاں ہر پھول جاں نثاری کا دعویٰ کرتا ہوا آپ کے قدم میمنت لزوم کا خیر مقدم کریگا۔

میں آپ کو سیتاپرن کی شاخوں میں جھولا جھلاؤنگا جہاں نوخیز چاند پتوں کے اوٹ سے آپ کا دامن چومنے کی کوشش کرتاہے میں اُس چراغ میں خوشبودار تیل ڈالونگا جو آپ کے سرہانے روشن ہوتا ہے، میں آپ کے پائدان کو صندل و زعفران سے حیرت انگیز طریقے پر آراستہ کرونگا۔

ملکہ: اچھا تم اس کا معاوضہ کیا لوگے؟

خادم: آپ کی چھوٹی سی مٹھی کو جو کنول کی کلیوں سے بھی زیادہ نازک ہے اپنے ہاتھ میں لینے آپ کی سیمیں کلائی میں گجرے پہنانے، آپ کے گلابی پاؤں میں مہندی لگانے اور خاک کی اُس پپڑی کو جو آپ کے پیر سے چھوٹ کر گری ہو آنکھوں میں لگانے کی اجازت چاہتا ہوں

ملکہ: میرے خادم تمہاری درخواست منظور ہے، تم میرے باغ کے مالی ہوئے"

اور وہ مالی خود بدولت ہی ہیں۔ کیا شاعر کے فرائض ملکہ حسن و محبت کی خدمت کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں۔ اس کا جواب پہلے ہی دیا جاچکا ہے کہ شاعر اس روحانی احساس کا مصور ہے جو کسی شے سے وابستہ ہو کر ایک کیفیت پیدا کر سکے۔ اس کی غیر فانی مصوری ہر قسم کی مادی جکڑ بندی سے آزاد ہے۔ یہاں پر شیکسپیئر کے ایک شعر کا ترجمہ پیش کرنا بے موقعہ نہ ہوگا جو اس کے ڈرامہ "Mid Summer night Dream" میں ایک روح کی زبانی کہا گیا ہے جو اپنے آپ کو ملکہ پری کی خادمہ سمجھکر کہتی ہے کہ میں وادی اور پہاڑی، جنگل اور جھاڑی، باغ اور پھلواری سب جگہ پھرا کرتی ہوں میری رفتار چاند سے بھی زیادہ سبک ہے۔ سہ

میں ملکہ پری کی باندی ہوں		اور یہ ہے میرا کام
جب سبزے پر وہ پیر رکھے		تو شبنم کا دوں جام

مگر شیکسپیئر روحانی تار کو زیادہ نہیں چھیڑتا۔ ایسی ہی ایک تمثیل جس میں روحانیت غالب ہے قدیم تاریخ ہند میں بھی ملتی ہے جو مہاتما بدھ کی اُس گفتگو کی یاد دلاتی ہے جو اس برگزیدہ ہستی نے دوران سفر میں ایک ادنیٰ آدمی سے کی تھی۔ بدھ بھگوان ایک باغ میں چلے جارہے ہیں، جاروب کش جو باغ

کی روشوں سے زرد پتیوں کو سمیٹ رہا ہے بدھ بھگوان کو دیکھتا اور جھک کر سلام کرکے کہتا ہے:-

سوامی! میں میلا اٹھاتا ہوں،
مہاراج! میں گرد و غبار میں اٹا رہتا ہوں،
بھگوان! لوگ مجھ سے بچکر چلتے ہیں کہ کہیں دھوکے سے مجھے چھو نہ لیں۔
لیکن میں کسی قسم کا اتیاچار نہیں کرتا، اور نہ سچ بولنے میں کبھی پس وپیش کرتا ہوں۔
کیا آپ مجھے اپنا بھکشو (برگزیدہ مرید) بنالیں گے؟"
بدھ بھگوان کہتے ہیں:-
"ادھر آ او بھکشو میں تجھے نروان کی بشارت دیتا ہوں:"

(رومیش دت۔ تمدنِ ہند)

غرض ٹیگور بھی تکمیلِ معاشرت کی بنیاد قدیم روحانی اخوت پر قائم کرتے ہیں۔ سوسائٹی کی بلندی و پستی کے معیار سے قطع نظر کرکے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا جائے تو اُن کی تصانیف مثلاً "گھر میں اور گھر سے باہر" وغیرہ میں سوسائٹی کے متعلق ان کے تخیلات و تصورات کی پوری تفصیل ملتی ہے۔

کامل شاعر وہی ہے جس میں ہر قسم کا کمال ہو، ٹیگور اس حقیقت کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ ان میں غالب کا فلسفہ (گیتانجلی[1] ۱۴ و ۲۱) خسرو کی موسیقیت (گیتانجلی ۴۵ و ۶۷) اور صائب کی تشبیہات ہیں (گیتانجلی[1]) مذہب کے اعتبار سے وہ مہاتما بدھ کے پیرو ہیں، یا بقول خواجہ حافظ:-

"مباش در پئے آزار و ہرچہ خواہی کن"

وہ ایسے ناصح نہیں ہیں کہ دنیوی تکالیف کی کوئی اہمیت ہی نہ سمجھیں۔ ایذا رسانی اُن کے نزدیک ایک بیماری ہے۔ اس لئے وہ ان زحمتوں کو جو دوسروں کی ایذا رسانی سے پیدا ہوتی ہیں ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ اُن کا کوئی خاص خدا نہیں ہے، اور مذہب کے معاملے میں وہ خاموش ہی رہتے ہیں۔

انشا پرداز کی حیثیت سے اُن کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی ٹریجڈی (حزنیہ کہانیاں) بھی طربیہ پہلو لئے ہوتی ہے۔ اُن کے یہاں در اصل حزن و حرماں کا نام و نشان ہی نہیں۔ ان کا ہیرو طرب مجسم ہوکر زندگی کے اسٹیج پر آتا ہے۔ اگر اس کے متعلقین رنج و الم میں مبتلا ہو جائیں تو اُسے کوئی غم نہیں ہوتا وہ در اصل "ہمہ گریاں شوند و تو خنداں" کے مصداق ہے۔ اس بیان کا ثبوت ٹیگور کے افسانوں سے بخوبی ملتا ہے۔

---

[1] گیتانجلی میکملن کمپنی ایڈیشن ۱۹۱۹ء

ایک اور خاص بات ٹیگور میں یہ ہے کہ مادی دولت اور دنیوی شان و شوکت سے اُنھیں کوئی بیر نہیں، وہ شاہ و گدا کو ایک ہی اسٹیج پر کھڑے ہوئے دیکھتے ہیں اور چونکہ اُن کا تعلق ایک متموّل گھرانے سے ہے اُن کی تصانیف میں کہیں زمانے کی کس مپرسی کا دُکھڑا نہیں ہے۔

شاعری حال و قال اور مثال کا مجموعہ ہوتی ہے احساس کی یہ کیفیت اور اس کا اظہار اُس روحانی تکمیل پر مبنی ہے جس کو علم کہتے ہیں۔ ٹیگور ہر جذبے کو پہلے اپنی روحانیت کی میزان میں تولتے اور پھر اُسے موسیقی کے ساز سے ملاتے ہیں اور آخر میں اپنی مصوری کی مدد سے اُسے شاعری کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔

کاش اُن کے نغمے انگریزی کی طرح ہندوستانی زبان میں بھی خود اُنھیں کے دماغ و قلم سے منتقل ہوئے ہوتے،

بہرحال ٹیگور کی شاعری ایک پیام سکون ہے جسمیں اُس دنیائے سرمدی کی جھلک دکھائی دیتی ہے جس کا خالق محبت کی روح اور حسن کی جان ہے اور جس کا خواب صرف شاعر ہی دیکھ سکتا ہے۔ بقول شاعر:-

اگر آئے بھی تو دل میں وہ اُمید بن کے آئے
نہ تو عقل ہی میں آئے، نہ خیال میں سمائے

نوٹ۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور سنہ ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد مہرشی دیوندر ناتھ نہایت برگزیدہ بزرگ اور برہمو سماج کے پیرو تھے۔ اِسی وجہ سے ڈاکٹر ٹیگور کے خیالات بھی بہت کچھ برہمو سماج کا اثر لئے ہوئے ہیں، اور شاید اسی وجہ سے آپ کا خاندان رسوم و رسوم کا چنداں پابند نہیں ہے ڈاکٹر ٹیگور کا خاندان نہایت متموّل و امیر خاندان ہے۔ ہر علم و فن کے اہل کمال اسمیں موجود ہیں لیکن ڈاکٹر ٹیگور کو کسی مدرسہ یا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ نہیں ملا، دولت کو علم سے بیر رہتا ہے لیکن آپ کا خاندان علم و دولت دونوں سے مالا مال ہے، ٹیگور نے بطورِ خود ہی تحصیلِ علم کی ہے، اور موجودہ طرز تعلیم کے موافق نہیں ہیں اسی لیے انھوں نے شانتی نکیتن میں ایک عظیم کی یونیورسٹی قائم کی ہے۔ انگریزی زبان کے شاعر ورڈسورتھ کی طرح ٹیگور بھی نیچر ہی کو اپنا اُستاد مانتے ہیں

خطرۂ جنگ

(از منشی تلوک چند محروم بی۔ اے)

رگِ زمانہ میں مضطر ہے، بیقرار ہے خوں ۔۔۔ سوار ہے سرِ اقوام پر بَلا کا جنوں
امان و امن سے اس کا مزاج برہم ہے ۔۔۔ یہ اقتدار عدوّے سکونِ عالم ہے
فساد و فتنہ کا سب ساز و برگ ہے تیّار ۔۔۔ سلاح خانوں میں سامانِ مرگ ہے تیّار
بڑھائے جاتے ہیں لشکر شمار سے باہر ۔۔۔ بتائے جاتے ہیں کمتر، دیار سے باہر
قضا کے دیو فضاؤں میں اڑتے پھرتے ہیں ۔۔۔ اجل رسیدوں پہ کب دیکھیے یہ گرتے ہیں
ہوا میں رستے بنے ہیں سپاہیوں کے لئے ۔۔۔ فلک پہ اُڑتے ہیں ظالم تباہیوں کے لئے
حکیم محوِ عمل ہیں کہ رُونما ہو جائے ۔۔۔ وہ نسخہ، جس سے جہاں دفعتہً فنا ہو جائے
بہانہ چاہیئے میدان میں اُترنے کا ۔۔۔ اشارہ ہونے کو ہے مارنے کا، مرنے کا!
قیامت آہ! نئی بحر و بر پہ آئے گی ۔۔۔ فضاؤں میں بھی اماں زندگی نہ پائیگی!

نہیں ہے رحمتِ ربِّ کریم کا خواہاں
جہاں ہے پھر کسی جنگِ عظیم کا خواہاں

قطعہ[1]

(از نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی مرحوم)

پھر انگڑائی لینے کو ہے جرمنی ۔۔۔ یہ ظاہر ہے صاف اُسکی انگلیٹ سے
ہوائی جہازوں نے جھاڑے ہیں پَر ۔۔۔ ہیں توپیں بھی پورے دِنوں پیٹ سے

---

[1] یہ قطعہ نواب علی حیدر طباطبائی مرحوم نے جولائی ۱۹۲۲ء میں زمانہ میں طبع ہونے کو عنایت فرمایا تھا مگر اس وقت یہ شائع نہیں ہوسکا۔ اب جب پیشینگوئی ہر حیثیت سے پوری ہو رہی ہے ہم اُس عنایت کی یادگار، یعنی استادِ مرحوم کو زمانہ کیا تحفہ ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں۔ جس احتیاط سے یہ قطعہ دفترِ زمانہ میں محفوظ رکھا گیا۔ افسوس اس کی داد دینے کے لئے مولانا طباطبائی آج اس عالمِ فانی میں ہمارے درمیان موجود نہیں ہے مگر اُن کا کہنا کیسا سچ ثابت ہے۔ (ایڈیٹر)

مذہب میں حکومت کی مداخلت

(از مسٹر مائی دیال جین بی۔اے (آنرز) بی۔ٹی۔انبالوی)

یہ مسئلہ ہمیشہ سے متنازعہ رہا ہے کہ حکومت کو مذہب میں مداخلت کرنا چاہیئے یا نہیں؟ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب اس مسئلہ کی موافقت و مخالفت میں علماء و مفکرین کی دو جماعتیں نہ رہی ہوں، مثلاً ہندوستان میں پنڈت ایشور چند۔ ودیا ساگر، بہرام جی مالاباری، جسٹس راناڈے، مسٹر گوکھلے اس بات کے حق میں تھے کہ سماجی اصلاح کے لئے حکومت کی امداد سے مناسب و ضروری قوانین وضع کرانا چاہیئے آجکل مسٹر رنگا ائیر، سر ہری سنگھ گوڑ، رائے ہربلاس شاردا، اور کسی حد تک مہاتما گاندھی بھی اس معاملے میں ان اصحاب کے ہم خیال ہیں۔ مگر مرحوم مسٹر تلک، پنڈت مدن موہن مالویہ۔ مسٹر ایم۔ کے آچاریہ اور بعض مسلمان لیڈر ان کی رائے اس کے برعکس ہے۔ یہ وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جنکی راسخ الاعتقادی مخلصی بہی خواہی، فضیلت علمی اور صائب الرائی پر کوئی شخص شک و شبہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بہرحال سوال یہ ہے کہ کس گروہ کو دلیل راہ بنایا جائے؟

اس سوال کے جواب میں اگر اجمالاً یہ کہا جائے کہ چند خاص اصحاب کو چھوڑ کر باقی تمام بزرگوار بعض موقعوں پر مذہبی معاملات میں سرکاری مداخلت کے حق میں اور بعض موقعوں میں اس کے خلاف تھے تو حقیقت کے برخلاف نہ ہوگا۔ بات یہ ہے کہ بحث و تمحیص میں رہنمایانِ ملک کو ایک پہلو ضرور لینا پڑتا ہے لیکن حقیقت عموماً دونوں پہلوؤں کے بیچ کا راستہ ہوتی ہے۔ پس اس قسم کے مسائل میں ہمیشہ صرف ایک پہلو کو اختیار کر کے کوئی نتیجہ نکالنا مفید نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی کبھی یہ روش بہت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ بالغ نظری و دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے مسائل کے تصفیہ میں حالات گرد و پیش کے مطابق روش اختیار کی جائے۔

اس سلسلے میں قابلِ غور سوالات یہ ہیں:-

(۱) حکومت کو رعیت کے مذہبی اُمور میں مداخلت کا اختیار ہونا چاہیئے یا نہیں؟

ے یہ مضمون ہندی رسالہ سرسوتی الہ آباد کے ایک مباحثے کے سلسلہ میں لکھا گیا تھا۔ اب لالہ ستر سین صاحب کی عنایت سے "زمانہ" میں شائع ہو رہا ہے۔ ایڈیٹر

(۲) ہندوستان میں موجودہ حالت اور مستقبل میں حکومت کی مذہبی پالیسی کیا ہونا چاہیئے؟
شق اول کا تعلق اصول سے ہے، اور شق دوم کا عمل سے۔ قبل اس کے کہ اس مضمون پر اظہار خیالات کیا جائے بہتر ہوگا کہ لفظ مذہب (دھرم) کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ اس لفظ کی کوئی جامع تشریح کرنا بہت دشوار ہے۔ ہندوستان میں یہ لفظ اتنے وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ عموماً زندگی کے تمام امور اس کے اندر آجاتے ہیں۔ اصول مذہب۔ فلسفہ۔ پوجا پاٹھ۔ سماجی رسم و رواج۔ بیاہ شادی اور کھانا پینا سبھی باتیں مذہب (دھرم) میں شامل ہوگئی ہیں اور اس معاملے میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی ہمخیال ہیں۔

یہاں پر ضمناً ناظرین کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرنا بیجا نہ ہوگا کہ مذہب میں مداخلت کا سوال یورپ میں عیسائیوں اور یہودیوں کے تنازعہ کے وقت پیدا ہوا یا اُس وقت جب عیسائی رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں منقسم ہوگئے تھے۔ اس فرقہ بندی سے یورپ کے ہر ملک میں شاہ وقت اور رعایا کے درمیان صرف معمولی تنازعے نہیں بلکہ بڑے خون خرابے ہوئے۔ مذہبی اختلافات کی وجہ سے بادشاہ رعیت پر جور و تعدّی کرتے تھے، اور رعیت کی طرف سے بادشاہ کو معزول کرنے کی کوشش ہوتی تھی۔ ان داستانوں سے تاریخ یورپ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ انگلینڈ میں شاہانِ ٹیوڈر و اسٹوارٹ کا عہد تو اس طرح کے مظالم کے لئے خاص طور پر مشہور ہے۔ لیکن وہاں مذہب میں مذہبی عقائد، طریقۂ عبادت دعا اور پادریوں کا طرز عمل اور رویّہ سب کچھ شامل تھا۔ اور عقد و نکاح، قانونِ وراثت اور میخواری وغیرہ اُمور سوسائٹی سے متعلق سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے وہاں یہ اصول قائم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، کہ اگر بادشاہ و رعایا کا مذہب و فرقہ ایک ہو تو بادشاہ مذہبی معاملات میں بھی مداخلت کا مجاز ہے ورنہ نہیں۔ مگر ہندوستان کے متعلق اس مسئلہ پر رائے دینے سے پہلے ضروری ہے کہ مذہب (دھرم) کا مفہوم واضح کردیا جائے۔ اور خواہ ہم کو مذہب کی تقسیم پسند ہو یا نہ ہو لیکن ملک کی موجودہ حالت میں اس قسم کی تقسیم کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ گو یہ کام ملک کے علما و فضلا اور لیڈروں کا ہے۔ تاہم میری رائے میں لفظ مذہب (دھرم) کا مندرجہ ذیل مطلب ہونا چاہیئے:۔

(۱) اصولِ مذہب (۲) طریقۂ عبادت و عمل (۳) تمدنی مسائل مثلاً بیاہ شادی، قانون وراثت وغیرہ وغیرہ

ان تینوں شعبوں کے متعلق حکومت کی کیا پالیسی ہونی چاہیئے؟ اس مضمون میں اس سوال پر اظہار خیال کیا جائیگا۔

اس وقت ہندوستان میں برطانیہ کی حکومت ہے، جس کا شاہی مذہب عیسائیت ہے اور جبتک انگلستان کا سیاسی اقتدار قائم رہیگا یہاں کا شاہی مذہب عیسائیت ہی رہیگا، اور گو اس شاہی

مذہب کا اثر رعایا پر نہیں پڑ رہا ہے تاہم نگاہِ غور سے دیکھا جائے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہے۔ لیکن حکومت خود اختیاری کی ترقی کے ساتھ جیسے جیسے ہمارے ملکی نمایندوں کو ملک کے نظم و نسق میں دخل ملتا جائے گا مذہب (دھرم) گورنمنٹ کی پالیسی سے الگ ہوتا جائیگا۔

۱۸۵۷ء کے اعلان کے مطابق حکومت کی واضح پالیسی یہی ہے کہ اس کو اہل ملک کے مذہب میں مداخلت کا کوئی مجاز نہیں ہے اور ہم اہل ہند کو اپنے اصول و مذہب میں تبدیلی کرنے نہ کرنے کا کامل اختیار حاصل ہے۔

دوسری شق کسی حد تک پہلی شق سے مختلف ہے، ہمارے مذہبی افعال کا اثر بیشک دوسروں کے مذہبی عقائد اور امن عامہ پر پڑ سکتا ہے، اس لئے حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہر مذہب کے پیرووں کو اپنے مذہبی جذبات و عقائد کے مطابق عمل کرنے کی آزادی حاصل ہے، لیکن اُنھیں یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ دوسروں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے، اور امن عامہ میں خلل نہ پڑے حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر مذہب کے پیرووں کو ایک نظر سے دیکھے اور ہر شخص کے لئے ایسا انتظام کرے کہ وہ اپنے مذہبی کاموں کو بلا خوف و مزاحمت انجام دے سکے۔ اس معاملہ میں عوام کو نہایت فراخدلی اور رواداری سے کام لینا چاہیئے۔ چنانچہ حق و انصاف کی رو سے کسی ہندوستانی کو سنکھ کی آواز، بقر عید کی قربانی، جینیوں کے برہنہ سادھوؤں اور مورتوں، اور سکھوں کے جھٹکے پر چراغ پا نہ ہونا چاہیئے۔ اسی لئے ہماری رائے جدید نظام حکومت کے آئین و ضوابط میں ایک ایسی دفعہ ضرور ہونا چاہیئے جس کی رو سے ملک کا ہر باشندہ اپنے مذہبی ارکان کو آزادی کے ساتھ انجام دے سکے۔

اِس سلسلہ میں اچھوتوں اور سادھوؤں کا مسئلہ بھی ہماری توجہ کا محتاج ہے، ظاہر ہے کہ کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں سادھو اور درویش نہ ہوں۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی کئی لاکھ اصلی و نقلی سادھو ہیں، اور جن میں کچھ فیصدی چھوڑ کر باقی ملک و سوسائٹی کے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہیں۔ سوسائٹی اِن سے نجات چاہتی ہے مگر اس کے پاس ان کی روز افزوں ترقی کو روکنے کی کوئی طاقت نہیں ہے، اگر حکومت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے، اور ملک اس کی پشت پر ہو تو آسانی سے اس بلائے بے درماں سے نجات مل سکتی ہے لیکن فقیروں کے متعلق کوئی قانون وضع کرنا بھی مذہب میں مداخلت کہا جا سکتا ہے مگر جس نظام سے سوسائٹی کا مفاد مقصود ہو اور ریا کار انسان راہ راست پر لائے جاسکیں وہ کسی

طرح قابل سرزنش نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس میں کامیابی اُسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ملک میں سادھو سدھار کا جذبہ موجود ہو اور پبلک کی رائے اُس کے حق میں ہو جائے۔

یہی حال اچھوت پن کے انسداد کی تحریک کا ہے۔ دکن کے بعض مندروں میں ہریجنوں کے داخلہ کی اجازت اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک کہ موجودہ قانون میں ترمیم نہ کی جائے، اسی لئے لیجسلیٹو اسمبلی میں "مندر پرویش بل"[1] پیش کیا گیا تھا۔ بہت سے آدمی اس مسودہ قانون کو مذہب میں بیجا مداخلت تصوّر کرتے ہیں، مگر وہ اس بات کو بھلا دیتے ہیں کہ یہ اس مداخلت کا ردّعمل ہے جو حکومت نے پہلے کی تھی، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ مسودہ قانون پاس بھی ہو جاتا تب بھی ہریجنوں کو کوئی سہولت حاصل نہ ہو سکتی، تاوقتیکہ خود ہندوؤں کے دلوں میں انقلاب پیدا نہ ہو، اور یہ ہندو عوام میں تبلیغ اور پرچار ہی سے ممکن ہے۔ اسی لئے مہاتما گاندھی اس کے لئے پبلک میں بھی ہمدردی پیدا کر رہے اور اسمبلی کے ممبروں پر بھی اثر ڈالنا چاہتے ہیں۔

شق سوم۔ بیاہ شادی۔ قانون وراثت اور رسم ورواج وغیرہ مجلسی مسائل کے متعلق ہے مغربی ممالک میں اس طرح کے تمام امور خاص مجلسی سمجھے جاتے ہیں، اور مذہب سے ان کا کوئی تعلق یا واسطہ نہیں سمجھا جاتا، اس لئے وہاں حسب ضرورت اِن میں تبدیلی کرنے میں کسی دقّت یا دشواری کا سامنا نہیں ہوتا، مگر اسکے برعکس ہندوستان میں یہ معاملات بھی مذہب کا جزو سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ اُمور ایسے نہیں ہیں جن میں اصول مذہب کی طرح کوئی تبدیلی نہ ہو سکے۔ قدیم زمانہ میں بھی اس قسم کی مثالیں آسانی سے پیش کیجا سکتی ہیں جن سے اس بات کا بخوبی ثبوت ملتا ہے کہ حسب ضرورت وقتاً فوقتاً رسم ورواج میں تبدیلی ہوتی رہی ہے، مثلاً چاروں ورنوں کے باہمی ازدواج، سوئمبر کی رسم اور مختلف طرح کی شادیاں جو کسی زمانہ میں ہندوستان میں عام طور پر رائج تھیں، اب تقویم پارینہ ہو چکی ہیں اور اس وقت عوام کو ان کے نام سے بھی وحشت ہے۔ اسی طرح جو مجلسی رسمیں آج کل رائج ہیں اور جزو مذہب سمجھی جاتی ہیں وہ ممکن ہے کسی زمانہ میں سوسائٹی کو مجبوراً اختیار کرنا پڑی ہوں اور رفتہ رفتہ اُنھوں نے مذہبی شکل اختیار کر لی ہو۔ لیکن ان میں سے بعض رسم ورواج سوسائٹی کی موجودہ حالت میں مضر ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ اُن میں تغیّر وتبدّل نہ کیا جائے۔ دراصل ہمیں ان کی

[1] یہ بل اسمبلی میں پاس نہ ہو سکا اور مسٹر رنگا آئر کو اسے واپس لینا پڑا۔

تبدیلی کو خوش آمدید کہنا چاہیئے

اس کے علاوہ ایک بات اور غور طلب ہے اور وہ یہ کہ اکثر ایک ہی مذہب کے پیرو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مختلف رسم ورواج کے پابند ہیں۔ اور سب اپنی اپنی جگہ ان کو اپنے مذہب کا ضروری جزو خیال کرتے ہیں، اس قدر تفریق کے باوجود کسی کو ان کے مذہبی اصولوں کے ایک ہونے میں انکار نہیں ہے۔ ان سب باتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مختلف رواجات گردوپیش کے حالات کے ماتحت رائج ہوئے ہونگے یعنی ضرورت وقت کے لحاظ سے ان کی ابتدا ہوئی ہوگی۔

یہی حال قانون وراثت کا ہے، اکثر ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں اور ذاتوں میں مختلف قانون اور جداگانہ رواج پایا جاتا ہے، اس میں بھی حسب ضرورت تغیر وتبدل نہ کرنا سراسر نادانی ہے زمانۂ قدیم میں اس قسم کے مسائل کا تصفیہ منو۔ بھاردواج۔ شنکر۔ برہسپتی۔ پراشر اور سومدیو وغیرہ واضعان قانون کی تصانیف کی مدد سے کیا جاتا تھا۔ اور راجہ کسی عالم مذہبیات کی صلاح ومشورہ سے ان میں ترمیم کر دیتا تھا۔ یا پنچایتیں رسوم ورواجات میں ضروری تغیر وتبدل کر دیا کرتی تھیں۔ لیکن اب کچھ اور ہی حالت ہے، نہ وہ راجہ رہے اور نہ اُس وقت کے علمائے دین اور نہ طاقتور پنچایتیں۔

اِن دھرم شاستروں کو مرتب ہوئے ایک عرصہ ہو چکا۔ اب ہماری سوسائٹی کی ساخت وضروریات میں بہت کچھ فرق ہو گیا ہے۔ اس لئے سوسائٹی کو جدید علم مجلس کے اصولوں اور موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے بموجب روزمرہ زندگی کے قواعد وضوابط مرتب کرنا چاہیئے، تاکہ مختلف مذہبوں کے مقلدین کے مجلسی رسم ورواج میں جو نقائص اور خامیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ رفع ہو جائیں۔
خوشی کی بات ہے کہ ہندو دھرم شاستر میں ضروری ترمیمات کرنے کی غرض سے پونا میں ایک بااثر کمیٹی قائم ہو گئی ہے۔ کیا اچھا ہو اگر دوسرے مذاہب کے حامیان بھی اسی طرح کی انجمنیں قائم کریں۔

لیکن یہ تمام تجویزیں بیکار رہیں گی جب تک حکومت ان کی پشت پر نہ ہوگی، کیونکہ کوئی اصلاح اُس وقت تک عوام کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتی جبتک کہ وہ قانون کی صورت اختیار نہ کرلے۔ اور کسی تجویز کو قانون کی حیثیت دینا حکومت کا کام ہے۔ اس لئے اگر اس ذریعہ کو محض اس خیال سے ترک کر دیا جائے کہ اس میں مذہب کے اندر حکومت کی مداخلت ہوتی ہے، تو ظاہر ہے کہ سماجی اصلاح کا کام قطعی رُک جائیگا، اور سوسائٹی کا ہر فرد جدید وقدیم آئین مجلس میں سے اپنے لئے جو

مفید سمجھے گا اس پر عمل پیرا ہو گا۔ اس طرح اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ کی مثل صادق آئے گی۔ بہرحال حق وراثت کا معاملہ قانونی شکل اختیار کئے بغیر کسی کے قابل قبول ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا کوئی شخص اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ ستی کی رسم۔ دختر کشی۔ انسانی قربانی۔ غلامی اور کسی حد تک بچپن کی شادی وغیرہ مذموم رسمیں حکومت کی امداد و حمایت سے آسانی سے دور ہو گئی ہیں!

خلاصہ کلام یہ کہ تمدنی مسائل کے تصفیہ اور مفید ملک مجلسی آئین وضوابط وضع کرنے کے لئے حکومت کی مداخلت یا حمایت کوئی مذموم و قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ یہ مداخلت اُسی صورت میں جائز ہو سکتی ہے جب حکومت اور رعیت دونوں ہم مذہب ہوں، قدیم تاریخ سے عدم واقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ قدیم زمانہ میں ایسے حکمراں گذرے ہیں جو رعایا کے ہم مذہب نہیں تھے تاہم اُنھوں نے مجلسی آئین وضوابط میں کامیابی کے ساتھ انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کے برعکس ایسے حکمران بھی گذرے ہیں جو رعایا کے ہم مذہب تھے مگر اس معاملے میں ناکامیاب رہے۔ جس کی وجہ سے انھیں اپنے تخت اور تاج کو الوداع کہنا پڑا۔ زمانۂ حال میں حکومت انگریزی اور امان اللہ خاں معزول شاہ افغانستان کی مثال اس دعوے کا ثبوت ہے۔

ہندوستان کے تمدنی ریفارمروں کو یہ بات کبھی نظرانداز نہ کرنا چاہیئے کہ مجلسی اصلاح کا کوئی مشورہ اُس وقت تک قانون کی شکل اختیار نہیں کر سکتا، جب تک کہ اُس کے حق میں کافی تبلیغ نہ کیجائے۔ اور عوام کی رائے اس کے موافق نہ کر لی جائے۔ بفرض محال اگر کوئی مسودہ قانون رائے عامہ کو پس پشت ڈالکر پاس بھی کر دیا جائے تو اس سے بہت کم لوگ فائدہ اُٹھا سکیں گے، اس کے علاوہ مجلسی اصلاح کا کام زیادہ تر سوسائٹی کے اندر ہی ہونا چاہیئے اور حکومت سے کم سے کم امداد لینا چاہیئے۔ مگر ناگزیر حالات میں حکومت سے امداد لینے میں پس وپیش کرنا خلاف مصلحت ہے اس لئے اس بارے میں مخالفت کے باوجود بھی رہنمایانِ ملک کو اپنی کوششیں جاری رکھنا چاہیئے۔ تعلیم واخبارات کی اشاعت کے ساتھ یہ کام بھی آسان ہوتا جائیگا۔

یہاں پر یہ بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ کونسلوں اور اسمبلی کے مختلف مذاہب ماننے والے اور مغربی تعلیم وتربیت پائے ہوئے ممبروں کو جو مجلسی و مذہبی اصولوں کے لحاظ سے نہیں بلکہ سیاسی اصولوں کے ٹکٹ پر منتخب کئے جاتے ہیں کیا حق حاصل ہے کہ وہ عوام کے مذہب یا سماج کے متعلق قانون بنانے کی کوشش کریں۔ یہ سوال بظاہر مشکل ہے لیکن درحقیقت یہ کوئی مشکل سوال نہیں ہے

کیونکہ رائے دیتے وقت ووٹران اپنے نمایندہ کے مذہبی، مجلسی اور سیاسی خیالات بھی مدنظر رکھتے ہیں آئندہ انھیں انتخابات کے وقت اور زیادہ محتاط رہنا چاہیئے۔ لیکن کوئی تجویز قانون کی صورت نہیں اختیار کر سکتی جب تک اسمبلی کے کثیر التعداد ممبران اس کے حق میں نہ ہوں۔ سیاسی پارٹیوں کے ممبران اور سرکاری حکام مذہبی و مجلسی مسائل پر رائے دینے میں قطعی آزاد ہوتے ہیں، اور برٹش گورنمنٹ ایسے مسائل میں بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے کام لیتی ہے۔ جب تک کسی تجویز کے موافق زبردست رائے عامہ معلوم نہ ہوجائے، وہ اسے قانون کی شکل نہیں دیتی۔ سول میریج بل، Civil Marriage Bill اور شاردا بل مدتوں تک اسمبلی میں زیر بحث رہے۔ شاردا ایکٹ (قانون انسداد شادی صغرسنی) کی خامیاں اسی حقیقت کا انکشاف کرتی ہیں کہ حکومت نے شادی صغرسنی کو روا رکھنے کا کام اپنے ذمہ نہ لے کر رعایا پر چھوڑ دیا۔ آہستہ آہستہ اس کی خامیاں دور ہوجائیں گی۔

غزل جناب برق دہلوی، بی اے

دل جو صورت گر معنی کا صنمخانہ نہ بنے
آنکھ جس شئے پہ پڑے جلوۂ جانانہ بنے

کیف ساماں جو تری نرگس مستانہ بنے
نگہ ہوش ربا گردش پیمانہ بنے

نقش وحدت جو خیال رخ جانانہ بنے
کعبہ جس پر ہو فدا دل وہ صنمخانہ بنے

آتش عشق بہر رنگ ہے جاندادۂ حسن
سرد ہو جائے جو یہ آگ تو پروانہ بنے

سوز اور ساز میں باقی نہ رہے کوئی حجاب
شمع ایسی جلے خاکستر پروانہ بنے

کیوں نہ رودادِ محبت ہو سراپا رنگیں
خون امید اگر سرخی افسانہ بنے

ظرف مے ٹوٹ کے بھی ہونے نپائے بیکار
ہو شکستہ کوئی شیشہ تو وہ پیمانہ بنے

بیخودی پردۂ حائل کو اگر وا نہ کرے
نگہ شوق حجاب رخ جانانہ بنے

تا در یار پہنچتا ہے وہ خود رفتۂ شوق
اپنی ہستی سے جو اس راہ میں بیگانہ بنے

کیوں نہ بیساختہ ہو شعلۂ عریاں پہ نثار
کشش حسن جو سوز دل پروانہ بنے

اُتنے ہی ہوگئے ہم منزل عرفاں کے قریب
جس قدر رسم و رہ دہر سے بیگانہ بنے

سر بسجدہ ہوں جہاں ہم وہیں کعبہ بن جائے
ہم زمیں بوس جہاں ہوں وہ صنم خانہ بنے

سعی ناکام سے میں ہاتھ اٹھاؤنگا نہ برق
میری بگڑی ہوئی تقدیر بنے یا نہ بنے

ملامت نہ کر

(شاعرِ عصر حضرت جوش ملیح آبادی)

ہم نشیں ترکِ وفا پر اُسے توبیخ نہ کر قید ہوتی ہے کہیں بوئے چمن، موجِ گہر
جلوۂ شبنم و نورِ سحر و بانگِ طیور اِن کی تسخیر کا دنیا میں کسے ہے مقدور

ہم نشیں ترکِ وفا پر اُسے توبیخ نہ کر
وہ بھی تھی بوئے چمن، خندۂ گل، موجِ گہر

ڈال دے پاؤں میں خورشید کے زنجیرِ گراں تابشِ ذرۂ ناچیز میں یہ زور کہاں!
کس لئے خاک میں ملتا نہ ہر آنسو میرا ہم نشیں اُس کے لئے تنگ تھا پہلو میرا

پوچ اُس دل کو مرے جس نے اُسے رام کیا
اُس نے دو دن بھی جو چاہا تو بڑا کام کیا

عقیدت

کس بلا کی ہے عقیدت مجھکو تیری ذات سے اللہ اللہ اپنی دھن کا کس قدر پکا ہوں میں
قتل کے ہنگام سے محفوظ رہنے کے لئے تیری ہی تلوار کے سائے میں آ بیٹھا ہوں میں

شکوہ

روبرو اُس کے گیا میں اِس قدر مدت کے بعد اِس کا کیا غم اُس نے ادنیٰ سی عنایت بھی نہ کی
مجھکو تو صرف اِسکا شکوہ ہے کہ اُس نے مجھ سے جوش اتنے دن تک دُور رہنے کی شکایت بھی نہ کی

رباعیات

دریا کے عمق میں جا، حبابوں کو نہ دیکھ اوراقِ چمن اُلٹ، کتابوں کو نہ دیکھ
بکھرے ہوئے اِک ذرۂ خاکی کے حضور ڈوبے ہوئے لاکھ آفتابوں کو نہ دیکھ

*

انساں یہ ہے کس درجہ خرافات کا بار دن کا ہے کبھی وزن، کبھی رات کا بار
پیدا ہو بشر میں کیا حکیمانہ مزاج عقلوں پہ ہے صدیوں کے روایات کا بار

*

ہاں خود یہ نہ کھول حسن کا باب اے دل شعلہ کی ہے زندگی تب و تاب اے دل
افسردہ نہ بن کہ لوگ پہچانتے ہیں، چہرے نہیں چہروں کی فقط آب اے دل

بھوپال کے دفینے

(از رائے زادہ منشی گوبند پرشاد۔ آفتاب، بی۔ اے)

وسط ہند کی عظیم الشان ریاست بھوپال تقریباً دو سو میل طول میں دریائے نربدا سے سیراب ہوتی ہے، اور اسی قدر لمبائی میں کوہ بندھیاچل کا سلسلہ خوش سواد وادیاں پیدا کرتا ہوا چلا گیا ہے۔

جین مت کے قدیم مندروں کے آثار ساری ریاست کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور بندھیاچل کی فلک رفعت چوٹیوں کے درمیان جہاں جہاں خوش منظر وادیاں واقع ہیں اکثر پرانے مندروں کے کھنڈر موجود ہیں۔ جن میں سنگتراشی اور دورِ قدیم کی صنّاعیوں کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں

جین مت اور بودھ مت کے یہ آثار تاریخ والوں کے لئے عمدہ میدان تحقیق وتفتیش مہیا کرتے ہیں، اس لئے نربدا ریسرچ سوسائٹی کو بھوپال کے وسیع رقبہ پر خاص توجہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہی علاقہ نربدا کے پانی سے سب سے زیادہ سیراب ہوتا ہے۔

قدیم ہندوؤں کا زمانہ پردۂ قدامت میں پوشیدہ ہے جس کا ذکر کرنا فضول ہے لیکن عہد قدسیہ بیگم صاحبہ خلد آشیان میں یہاں انھیں جینیوں کے زمانہ کا ایک مندر وسط بلدہ بھوپال میں، زمین سے برآمد ہوا تھا جس میں ایک کروڑ روپیہ سے زائد کا دفینہ ملا تھا۔ کہتے ہیں کہ رانی سال لی کے زمانے میں یہاں سبھا منڈل کے نام سے ہندوستان کی ایک مہتمم بالشان سنسکرت یونیورسٹی قائم تھی جس میں ہزارہا پروفیسر تعلیم دیتے تھے، شاید اسی زمانے یا اس سے پہلے کا یہ دفینہ ہو، مگر افسوس ہے کہ جب برآمد ہوا تو اس کی تاریخی تحقیقات کسی نے نہیں کی ورنہ قیمتی معلومات دستیاب ہونا ممکن تھا۔

میرے والد مرحوم رائے منشی خوشی لعل صاحب (جو ریاست ہذا میں پینتالیس برس تک مسلسل ریونیو سکرٹری رہے) فرماتے تھے کہ انھوں نے اِس دفینہ کے سامان میں کفِ دست

ے برابر طلائی اشرفیوں کا ایک دو فٹ مکعب ڈھیر دیکھا تھا اور بیش قیمت جواہرات کا ایک بوٹا سا طاؤس بھی اوس میں تھا۔

ایسے بڑے دفینے کے برآمد ہونے سے دل میں قدرتاً خیال پیدا ہوتا ہے کہ جین مذہب کے ریخی حالات معلوم کرنے کے لئے یہاں دوسرے دفینوں کا بھی سراغ مل سکتا ہے لیکن جینیوں ے بعد مغل بادشاہوں کے عہد میں یہ علاقہ ویران ہو چکا تھا۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر ہاتھیوں شکار کھیلنے دو ایک مرتبہ بھوپال کے حدود میں آیا تھا۔ یہ معلوم کرنا بہت دشوار ہے کہ مہاراجہ بوج کے تعمیر کردہ تالاب کا بند جو یہاں بھوجپور کے مندر کے سامنے تعمیر کیا گیا تھا، اور جسکی الی کی ہوئی جگہ میں آج کل ریاست کا پرگنہ تال آباد ہے، وہ کب مسمار ہوا اور اُس کے مسمار ہونے سے قرب وجوار کے علاقہ پر کیا اثر پڑا؟ کہتے ہیں کہ شاہان مالوہ میں ہوشنگ شاہ وری نے مدت دراز تک ہوشنگ آباد میں اپنی فوج کی چھاؤنی ڈالے رکھی جس کی وجہ سے الاب کا یہ بند بالکل توڑ دیا گیا تھا اسی سخت یورش کی یادگار دیدۂ ہوشنگ آباد ہے۔

ممکن ہے کہ ہوشنگ شاہ ہی نے بند تالاب مذکور توڑنے کے بعد اس تمام علاقہ کو ویران کردیا ہو جس کے سبب سے اکبر بادشاہ کے زمانے میں یہاں ہاتھیوں کا جنگل بن گیا ہو۔

اگر رانی سال ملی کے خاندان کا مہاراجہ بھوج کے بند کی تعمیر سے کوئی واسطہ نہ ہو تو قیاس غالب یہی ہے کہ یہ بند مہاراج بھوج کے دورِ حکومت کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مہاراجہ بھوج کے زمانہ میں بھوجپور کا مندر جو اب شکستہ حال میں ہے بڑی آب وتاب پر تھا۔ اس وقت بھی شاید ہندوستان میں اتنے بڑے کھمبے اور کسی مندر میں لگے ہوئے نہ ملیں گے۔ یہ قریب ہی کے پہاڑ سے تراشے گئے ہونگے۔ یہ ستون بہت موٹے اور اونچے ہیں، وسط میں شیومورتی کا چبوترہ بہت فراخ اور مورتی اس قدر بڑی ہے کہ دو آدمی ہاتھ پھیلا کر اُس کے گرد بہ مشکل حلقہ کرسکتے ہیں۔

اِسی مورت کی وجہ سے یہ مندر جس میں سنگتراشی کے بہترین نمونے دکھائی دیتے ہیں ہندوؤں کا تعمیر کردہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ شیو مورت جو اوپر سے ٹوٹی ہوئی ہے کسی دوسری مورت کا سنگاسن تھی جو توڑ ڈالی گئی ہے تو پھر ستونوں کے اوپر جو سنگین مورتیں تراشکر بنائی گئی ہیں اُن کو غور سے دیکھنے پر بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہندوؤں ہی کا مندر تھا۔ اس کے اردگرد جو جین مذہب کی مورتیں ہیں وہ جینی عہدِ حکومت کے تسلط

شاہد ہیں۔ اور اگر اس مندر کی تعمیر جین مذہب کے قبل مان لیجائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے، اس ہندو مندر کی بیشمار دولت کہاں گئی۔

میرے ایک مرحوم دوست منشی سعد اللہ صاحب کو جن کی ساری عمر بھوجپور کے آس پاس نت کرنے میں بسر ہوئی۔ ایک دن اسی جگہ کے ایک نالے میں ایک سادھو کے ساتھ غسل کا فاق ہوا، اس کے دَوران میں اس سادھو نے سورج کی طرف ہاتھ اُٹھا کر اُن سے کہا کہ اس ب وجوار میں مجھے بیشمار طلائی ظروف دفن نظر آرہے ہیں۔ یہ سنکر مرحوم ہنس دیئے، مگر اس یشن ضمیر سادھو نے اُن کے گھر کی تجوری میں جو زر وزیور رکھا ہوا تھا اُس کو شمار کرانا شروع دیا۔ اس پر مرحوم دنگ ہوگئے، اور سادھو سے نہایت منت سماجت سے وہ جگہ دریافت کی ماں اُسے طلائی ظروف مدفون نظر آرہے تھے۔ سادھو نے ایک پہاڑ کی جڑ میں وہ دیوار بتائی و پتھر اور چونے سے بہت مضبوط تعمیر کی گئی ہے۔ منشی صاحب مرحوم مجھ سے اکثر کہتے رہے کہ م اُس جگہ کو اپنی نظر سے دیکھ لو، لیکن مجھے کبھی وہاں جانے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔

البتہ یہ خیال اکثر آیا کہ حسب روایت قدیم مہاراجہ بھوج نے تالاب کے بند اور مندر کی تعمیر کے وقت ایک بڑا ہَوَن کیا تھا، قدیم رسم کے بموجب ہَوَن میں سونے چاندی کے برتنوں میں خوشبویات بھر کر آگ کے نذر کردیتے ہیں، اور ہون کے بعد یہ برتن برہمنوں اور پجاریوں کی نذر کردیے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں عجب نہیں کسی برہمن نے اِن برتنوں کو اِس دیوار کے عقب میں دفن کردیا ہو۔

بہرحال اگر یہ مندر ہندوؤں کا اور مہاراجہ بھوج کا تعمیر کردہ ہے تو یہ امر قرین قیاس ہے کہ اسی قرب وجوار میں کوئی دفینہ ہوگا۔

مگر عہد مغلیہ سے اس قدر پہلے زمانہ کے دفینوں کی تحقیقات بہت دشوار ہے۔ قلعہ رائسین جو رانا سانگا کے زمانے کا مشہور قلعہ تھا اکثر موقعوں پر مہاراجگان اودے پور کا قیامگاہ رہا ہو ممکن ہے کہ اُن کے وقت کا تھوڑا بہت دفینہ اب بھی یہاں ہو، یا کنور گڑھ میں جو بالکل قلعہ چتوڑ کا نمونہ ہے موجود ہو۔ اسی طرح جوکی گڑھ میں بھی گونڈوں کے دفینے موجود ہوسکتے ہیں۔

عہد مغلیہ میں جب دہلی کی سلطنت کو وسعت ہوئی اور سڑکیں تعمیر ہونے لگیں تو دوراہہ پر سے ایک شاہی سڑک مالوہ کے جنگلوں سے گزرتی ہوئی دکن کو جاتی تھی جس پر جگہ جگہ سرائیں اور مسافرخانے بنے ہوئے تھے، اِسی طرز کی ایک سرائے کے کھنڈر ڈونڈا لاوا تحصیل اچھاور میں

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

اب تک موجود ہیں۔

موضع ڈونڈا الاوا میں جہاں جینیوں کی پرانی مورتیں اکثر ملتی ہیں، اور بہت سے کتبے بھی موجود ہیں، قدیم دفینوں کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ لیکن معدنیات کے تجسس کے سلسلے میں جب مجکو اس جگہ جانا پڑا تو ریاست ٹونک کے پاس چھوٹی سی ریاست لاوا کے تاریخی حالات میرے دماغ میں گردش کرتے رہے اور میں نے ٹاڈ صاحب کے راجستھان کا مطالعہ کیا تو اس میں یہ دیکھا کہ رانا اودے پور نے کسی وقت تین دن کے لئے اپنی حکومت خاندان ڈونڈا کو دے دی تھی، چنانچہ اس کے بادشاہ نے خزانہ ڈھونڈنے کے سوائے اور کوئی دوسرا کام اپنی تین دن کی حکومت میں نہیں کیا۔ اور جب یہ خاندان تباہ ہوا تو اس کا وارث ایک کمسن بچہ تھا جسے لئے ہوئے اس کی والدہ عرصہ دراز تک معہ خزانہ و جواہرات بھوپال کے جنگلوں میں پناہ گزین رہی۔

اس قسم کے واقعات سے قیاس ہوتا ہے کہ اس وقت شاید لاوا اور ڈونڈوا دونوں قوموں کا کوئی مشترکہ قلعہ یہاں موجود ہو جس کی وجہ سے یہ مقام مشہور ہوا۔ تھوڑے دن ہوئے یہاں راجپوت آباد تھے لیکن اب نقل مکان کرکے پاس کے دیہات میں آباد ہو گئے ہیں۔ اس لئے روایت اور تاریخ دونوں سے موضع ڈونڈا الاوا کے قرب و جوار میں دفینوں کی موجودگی کا قیاس غالب ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس امر کی تحقیق ممکن ہے

عہد مغلیہ کے وسط میں ابو الفضل کے قاتل مہاراجہ نرسنگھ دیو والی اورچھا کو بڑا عروج حاصل ہوا، اس نے جہانگیر بادشاہ کی نظر عنایت سے بہت بڑا خزانہ جمع کر لیا تھا، چنانچہ اس کے بیٹے جھجار سنگھ کی نسبت تاریخ ہندوستان میں تحریر ہے کہ اس نے ایک خاص آدمی کی امداد سے اپنا بیشمار خزانہ علاقہ بھوپال کے جنگلوں میں کنوئیں کھدوا کر ان میں دفن کر دیا تھا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں جب جھجار سنگھ کے خلاف لشکر کشی کی گئی تو جھجار سنگھ کا ہونہار بیٹا وکرماجیت سیہور ہی کے پاس قتل کیا گیا، اور شاہجہاں کے امرا خاص نے ڈیڑھ کروڑ روپیہ کے قریب ان کنوؤں سے برآمد کرکے شاہجہاں کے خزانہ میں داخل کیا تھا، اسی وقت بھوپال میں ٹکسال قائم ہوئی۔

اس سے قیاس ہوتا ہے کہ مہاراجہ جھجار سنگھ کے اور بھی دفینے بھوپال کے جنگلی کنوؤں اور غاروں میں پوشیدہ ہونگے۔ بھوپال کے جنگلوں کی حالت دیکھتے ہوئے یہ قیاس نہیں ہوتا ہے کہ جھجار سنگھ کا کل خزانہ امراے شاہجہاں نے برآمد کر لیا تھا۔ تاریخ سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ

اس برآمد شدہ خزانہ کا زیادہ حصہ خود علاقہ اورچھا میں برآمد ہوا تھا۔ ایسی صورت میں ریاست کے اکثر جنگلی کنوئیں تحقیقات کے قابل معلوم ہوتے ہیں۔

بہرحال تمام روایات اور تاریخی شہادتیں اس بات کی متقضی ہیں کہ تاریخی کاغذات کی دیکھ بھال کی جائے، اور اس دورِ جدید میں سائنس کی حیرت انگیز ایجادات سے جو خزانے برآمد کرنے کے لئے طبعی حالات ارضی دریافت کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی ہیں فائدہ اُٹھانا چاہیئے مقناطیسی قوتوں، برقی طاقتوں، کشش ارضی کے پیمانوں اور زلزلہ کے آلات کے ذریعہ سے اب دفینوں کا معلوم کرنا آسان ہوگیا ہے۔ بشرطیکہ مقامی حالات کے جاننے والے اور اہل تاریخ اپنی تحقیق سے ان آلات سے سروے کرنیوالوں کی امداد و اعانت کریں۔ ریاست بھوپال جیسے زرخیز مقامات ضرور اس قابل ہیں کہ اُن کی پوری تحقیقات کی جائے۔ یہ آلات کچھ ایسے بیش قیمت بھی نہیں ہیں، پیمائش اور سروے میں ضرور مصارف ہونگے۔ لیکن پہلے خاص خاص مقامات کا سروے کرلیا جائے اور اگر اس کا کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو تو پھر سائنٹیفک طریقے سے ریاست کے پورے رقبہ کا سروے کرکے اس بات کی تحقیق ہوسکتی ہے کہ ریاست میں دفائن موجود ہیں یا نہیں۔

سالِ نو مبارک

خوش خوش ہے فضائے کائناتی ہر سمت   دولھا ہے نیا۔ نئے براتی ہر سمت
ہے آج نیا سال۔ نئی امیدیں   دنیا کی دھڑک رہی ہے چھاتی ہر سمت

خورشیدِ فلک نے اپنا زانو بدلا   گیتی نے لباسِ سال ہر سو بدلا
اے اہلِ زمانہ ہو مبارک تم کو   دنیا نے پھر ایک بار پہلو بدلا

نیاز حسن گوالیاری

منھ اندھیرے کا جادو

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا رَین کا جاگا نیند کا ماتا
نیند کا ماتا۔ دھوم مچاتا انگڑائیاں لیتا۔ بل کھاتا
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

رُخ پر سرخی، آنکھ میں جادو بھینی بھینی بَر میں خوشبو
بانکی چتون، سمٹے ابرو نیچی نظریں بکھرے گیسو
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

نیند کی لہریں گنگا جمنی جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا۔ مسکی ساری ہلکی مہندی دھندلی بندی
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

ڈوبا ہوا رُخ تابانی میں انوارِ سحر پیشانی میں
یا موجِ گہر طغیانی میں یا چاند کا ٹکڑا پانی میں
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

رخسار پہ موجِ رنگینی کچّی چاندی۔ پکّی چینی
آنکھوں میں نقوشِ خود بینی مکھڑے پر سحر کی شیرینی
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

آنکھوں میں غلطاں عشرت گاہیں نیند کی سانسیں جیسے آہیں
بکھری زلفیں، عریاں باہیں جان سے ماریں جس کو چاہیں
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

ململ میں دل کی بستی ہے طوفانِ بلا میں ہستی ہے
آنکھ میں شب کی مستی ہے اور مستی دل کو ڈستی ہے

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

کچھ جاگ رہی کچھ سوتی ہے | ہر موج صبا منھ دھوتی ہے
ناشستہ رخ یا موتی ہے | انگڑائی سے جزبز ہوتی ہے

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

پھیلا پھیلا آنکھ میں کاجل | اُلجھا اُلجھا زلف کا بادل
نازک گردن پھول سی ہیکل | سرخ پپوٹے نیند سے بوجھل

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

رنگت پھیکی نیند کے مارے | پھیکے پن میں شہد کے دھارے
جو بھی دیکھے جان کو وارے | دھرتی ماتا بوجھ سہارے

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

رُباعیّات

(حضرت جوش ملیح آبادی)

(۱)

آہوں سے کہیں دل کا بھلا ہوتا ہے | نکلے جو بھڑاس بھی تو کیا ہوتا ہے
جی کھول کے روتا ہوں تو بڑھتا ہے غم | یہ ابر برسنے سے سوا ہوتا ہے

(۲)

اب خواہش لذات نہیں ہو سکتی | اب دن کے سوا رات نہیں ہو سکتی
در کس لئے کھٹکھٹا رہی ہے دنیا | کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

اَبیات

(حضرت جوش ملیح آبادی)

اُبھار کر مٹائے جا، بگاڑ کر بنائے جا | کہ میں ترا چراغ ہوں جلائے جا بجھائے جا
فغاں! کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے | سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا
شبابِ فتنہ کے قدم کی چاپ سن رہا ہوں میں | ندیم! عہدِ شوق کی کہانیاں سنائے جا

بھارتیندو ہریشچندر

(از جناب اقبال ورما سحر ہتگامی)

بھارتیندو ہریشچندر کا نام نامی دَورِ جدید کے ہندی ادیبوں میں چوٹی پر رکھے جانے کا مستحق ہے جن کی پچاس سالہ برسی کی تقریب میں ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی طرف سے ملک بھر میں عموماً اور بنارس میں خصوصاً ایک یادگاری جشن منانے کا انتظام ہو رہا ہے! اس کے لئے ۲۵۔۲۶، اور ۲۷ جنوری ۱۹۳۵ء کی تاریخیں مقرر کی گئی ہیں۔ اس موقع پر سبھا نے مرحوم کے اعزاز میں ایک یادگاری کتاب بھی شائع کرنیکا بندوبست کیا ہے[1] جس کی ترتیب و تکمیل کا کام مرحوم کے نواسے بابو برج رتن داس جی کے سپرد ہوا ہے۔ یہ کتاب بھارتیندو جی کے ناٹکوں، نظموں اور مضامین کا مجموعہ ہوگی اور چار بڑی بڑی جلدوں میں شائع کیجائیگی۔

بھارتیندو جی کا نام ملک کے ہر علمی و ادبی طبقہ میں مشہور ہے۔ اُن کی خداداد ذہانت و قابلیت کا حال یہ تھا کہ اُنھیں صرف پینتیس ۳۵ سال کی عمر ملی تھی اور وہ باقاعدہ تعلیم و تربیت سے بھی بے بہرہ تھے، مگر محض اپنے شوق و مطالعہ کی بدولت وہ استعداد حاصل کر لی کہ ملک کی شائد ہی کوئی زبان ہوگی جسے اُنھوں نے نہ سیکھ لیا ہو، مرہٹی۔ گجراتی۔ پنجابی۔ بنگالی، وہ سبھی زبانیں جانتے تھے اُنھوں نے اٹھارھویں سال سے لکھنا شروع کیا اور تقریباً اٹھارہ سال ہی کے اندر ایکسو پچھتر ۱۷۵ چھوٹی بڑی کتابیں لکھ ڈالیں، جن میں اٹھارہ ناٹک ہیں، بعض اصل اور بعض ترجمہ۔ ہندی ناٹک نویسی میں ان کو اپنے طرز کا موجد کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اُن کے ناٹکوں میں "ستیہ ہریشچندر" اور "چندراولی" بہت مشہور ہیں، خصوصاً اول الذکر کو تو وہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی نصیب ہوئی کہ وہ شاید ہی کسی کمپنی یا کالج میں نہ کھیلا گیا ہو۔

بھارتیندو جی صرف ناٹک نویس ہی نہ تھے بلکہ اچھے ایکٹر بھی تھے۔ اُنھیں ناٹک کے ہر پہلو سے دلچسپی تھی، انگریزی میں بھی اُنھیں اچھی لیاقت حاصل ہوگئی تھی، چنانچہ شیکسپیئر کے مشہور ناٹک "مرچنٹ

---

[1] یادگاری جشن کیلئے پچیس روپیہ دان دینے والوں کو یہ جلد مفت نذر ہوگی۔

آف وینس" کا ہندی ترجمہ بھی انھیں نے کیا ہے، اور بھی بہت سی تصانیف میں ناول، نظمیں، سفرنامے، اور تاریخی، مذہبی اور مزاحیہ سبھی قسم کی کتابیں ہیں۔ متفرق مضامین ان کے علاوہ ہیں، اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی طبیعت کتنی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ دماغ بھی بلا کا تھا، باتیں کرتے جاتے تھے اور لکھتے جاتے تھے۔ برجستہ اشعار کہنے کے عادی تھے۔ بڑی بڑی نظمیں بات کی بات میں لکھ ڈالتے تھے، بعض کتابیں ایک ہی دن میں لکھی ہوئی ہیں۔ اِنھیں خصوصیات کی بنا پر ہندی اخبارات نے ۱۸۸۰ء سے انھیں بھارتیندو کے اعزازی لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔

بھارتیندو ہرلیشچندر ایک کامیاب اڈیٹر بھی تھے۔ اُنھوں نے ۱۸۶۸ء میں "کوی بچن سدھا" نامی ماہوار رسالہ جاری کیا، جس میں ہندی کے نئے اور پرانے شعرا کا کلام چھپتا تھا۔ کچھ دنوں بعد وہ پندرہ روزہ اور پھر ہفتہ وار ہو گیا۔ اور اُس میں تمدنی اور سیاسی مضامین بھی نکلنے لگے۔ ۱۸۷۳ء میں "ہرلیشچندر میگزین" جاری کیا، اور آٹھ نمبروں کے بعد اس کا نام تبدیل کر کے "ہرلیشچندر چندر کا" کر دیا۔ یہ رسالہ بھارتیندو کی نثر کا اولین نمونہ ہے۔ اُن کے چند مشہور ناٹکوں کی تکمیل بھی انھیں دنوں میں ہوئی تھی۔ اسی دوران میں عورتوں کے فلاح و بہبود کے لئے اُنھوں نے "بالا بودھنی" نامی رسالہ بھی جاری کیا، اُس وقت ہندی زبان کس مپرسی کی حالت میں تھی، مگر بھارتیندو جی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُن کے رسالوں کے لئے مضمون نگاروں کی ایک خاصی جماعت تیار ہو گئی اِس زمرہ میں پنڈت بدری نارائن چودھری، پنڈت بالکرشن بھٹ، پنڈت پرتاپ نارائن مشر، پنڈت امبکادت ویاس، پنڈت رادھا چرن گوسوامی، بابو طوطا رام اور لالہ سری نواس داس کے اسماء گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر اصحاب نے ناٹک نویسی میں بھی بھارتیندو کی تقلید کی۔

یوں تو عموماً بھارتیندو جی کی ساری عمر ہندی زبان کی خدمت کرتے ہوئے گزری، لیکن ان کی زندگی کی اہم ترین خدمت یہ ہے کہ ہندی کی موجودہ صورت کے وہی بانی ہیں۔ اِس جدید ہندی کو "کھڑی بولی" کا نام دیا گیا ہے۔ اِسے اُردو کا تتبع کہنا چاہیئے اور یہی "ہندوستانی زبان" بھی کہی جا سکتی ہے۔ اِس زبان کی ابتدا دراصل منشی سدا سکھ لال نیاز دہلوی اور سید انشاء اللہ خاں انشا کے ہاتھوں ہوئی۔ منشی جی نے "شریمد بھاگوت" کا ترجمہ کھڑی بولی میں "سکھ ساگر" کے نام سے کیا تھا اور سید صاحب نے اسی طرز پر رانی کیتکی کی کہانی تحریر کی۔ اس کے بعد ۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے یوروپین ملازموں کو ہندوستانی زبان سکھانے کے لئے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ایک محکمہ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی زیرِ نگرانی قائم ہوا، جنھوں نے ہندی زبان میں کتابیں لکھنے کے لئے پنڈت للو لال اور سدل مشر

کو مقرر کیا۔ اول الذکر نے "پریم ساگر" نامی کتاب لکھی۔ ان چاروں میں سے کسی کا اسلوب بیان خامیوں سے مبرّا نہیں ہے۔ اُن کی زبان میں وہ صفائی اور پاکیزگی نہیں ہے جو کھڑی بولی کی امتیازی خصوصیت ہے۔

بھارتیندو جی نے جہاں ہندی نثر کی کایا پلٹ کر دی وہاں نظم میں بھی بہت کچھ اصلاح کی۔ نظم میں اُن کو پُرانی ہندی ہی زیادہ مرغوب تھی مگر اُنھوں نے اُس میں سے بہت سے الفاظ اور ترکیبیں خارج کر دیں۔ نئی ہندی میں نظمیں اُس وقت سے لکھی جانے لگیں جب پنڈت مہابیر پرشاد دُویدی نے رسالہ سرسوتی کا چارج لیا۔

بھارتیندو جی کبھی کبھی اُردو میں بھی لکھتے تھے۔ اُن کی اُردو نثر بہت دلکش اور قابلانہ ہوتی تھی۔ نمونہ کے طور پر چند سطریں درج کی جاتی ہیں۔ خوشی کے عنوان سے لکھتے ہیں:۔

"حسب دلخواہ آسودگی کو خوشی کہہ سکتے ہیں، یعنی جو ہمارے دل کی خواہش ہو وہ کوشش کرنے سے یا اتفاقیہ بغیر کوشش کئے بر آدے، تو ہم کو خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ خوشی زندگی کے پھل کو کہتے ہیں۔ اگر خوشی نہیں ہے تو زندگی حرام ہے۔ کیونکہ جہاں تک خیال کیا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بھی تمام زندگی کا نتیجہ خوشی ہے۔ ایسی خوشی کے ہم تین درجے قائم کر سکتے ہیں یعنی آرام۔ خوشی۔ اور لطف۔ آرام وہ حالت جسمیں تکلیف کا ایک حصہ یا بالکل تکلیف رفع ہو جائے۔ خوشی وہ حالت ہے جس میں آرام کا حصہ تکلیف کی مقدار سے زیادہ ہو جائے، اور لطف وہ حالت ہے جسمیں تکلیف کا نام بھی باقی نہ رہے۔۔۔۔۔۔"

اُردو نثر کے علاوہ وہ نظم بھی لکھتے تھے اور رسا تخلص کرتے تھے، ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دل مرا لے گیا دغا کر کے — بے وفا ہو گیا وفا کر کے
ہجر کی شب گھٹا ہی دی ہم نے — داستاں زلف کی بڑھا کر کے
شعلہ رو! کہہ کہ کیا ملا تجھکو — دل جلوں کو ستا ستا کر کے
وقتِ رحلت جو آئے بالیں پر — خوب روئے گلے لگا کر کے
سرو قامت! غضب کی چال سے تم — کیوں قیامت چلے بپا کر کے
خود بخود آج وہ جو بہت آیا — میں بھی دوڑا خدا خدا کر کے

بھارتیندو جی بنگال کے سیٹھ امی چند اگروال کے خاندان سے تھے۔ سیٹھ جی کے لڑکے رتن چند اور فتح چند بنارس جاکر آباد ہو گئے تھے۔ فتح چند کے پوتے ہرکھ چند نے اچھا نام اور روپیہ پیدا کیا۔ اُن کے لڑکے گوپال چند تھے جو گردھر داس کے نام سے ہندی کے مشہور شاعر گذرے ہیں، یہی بھارتیندو جی کے پتا تھے۔

یہ ایک بڑے رئیس ہونے کے علاوہ چالیس کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ لائبریری کا نام "سرسوتی بھون" تھا جس کے لئے ڈاکٹر راجیندر لال متر لاکھ روپیہ تک قیمت دلانے کو تیار تھے۔ اس طرح بھارتیندو جی کو ترکے میں لکھوکھا کی جائداد کے علاوہ ادبی خصوصیت بھی ملی تھی۔ وہ ۹۔ ستمبر ۱۸۵۰ء کو پیدا ہوئے تھے اور چھ سات برس کی عمر سے تک بندی کرنے لگے تھے، پڑھنے لکھنے میں اُن کا جی نہ لگتا تھا۔ نو سال کی عمر میں اُن کے والد کا انتقال ہوگیا اور وہ بالکل آزاد ہوگئے۔ اُس وقت بنارس کے رؤسا میں صرف راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند ہی انگریزی جانتے تھے۔ بھارتیندو بھی انھیں سے پڑھنے لگے۔ مگر ۱۸۶۵ء میں اپنی والدہ کے ساتھ تیرتھ جاترا کو چلے گئے اور سلسلۂ تعلیم منقطع ہوگیا۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد ۱۸۶۶ء میں اُنھوں نے خود ایک انگریزی اسکول کھولا، پڑھتے بھی تھے اور پڑھاتے بھی، طلبا کو کھانا کپڑا، پڑھنے کا سامان سب مفت دیا جاتا تھا۔ بھارتیندو نے اس اسکول کو بارہ سال تک اپنے صرفہ سے چلایا، پہلے اس کا نام "چوکھمبا اسکول" تھا، اب وہی "ہرشچندر ہائی اسکول" کے نام سے مشہور ہے۔

۱۸۷۰ء میں وہ آنریری مجسٹریٹ ہوگئے مگر وہ اس سے جلد ہی مستعفی ہوگئے۔ وہ پورے رئیس تھے اُن کا ظاہر و باطن یکساں تھا اُن کے سینہ میں ایک فطری شاعر کا دل تھا، جس سے طبیعت میں استغنا کے ساتھ لاأبالی پن بھی تھا۔ اُن کی خودداری پر غرور کا گمان ہوتا تھا تاہم اُن کی زندہ دلی کا یہ حال تھا کہ ہولی میں وہ ہلڑ مچانیوالوں میں شامل ہوکر رنگ میں نہا جاتے۔ کبیر گاتے اور خوب دھما چوکڑی مچاتے تھے۔ دیوالی کے موقع پر اُن کے یہاں تیل یا گھی کے بجائے عطر کے چراغ جلتے تھے، جسم پر بھی عطر ہی کی مالش کراتے۔ غرض اُن کے اخراجات فضول خرچی کی حد تک بڑھے ہوئے تھے۔ سائل کو نا امید کرنا جانتے ہی نہ تھے، جو چیز جسے پسند آئی فوراً دیدی اور دیدینے کے بعد اس کا خیال بھی نہ کیا، البتہ ایک مرتبہ انھیں بھی پچھتاوا ہوا، بادشاہوں کی تصویروں کا ایک مرقع جو انھیں بہت پسند تھا اُنھوں نے کسی کو دیدیا۔ لیکن پھر اُسے پانچسو روپیہ دیکر واپس لینے کی کوشش کی مگر اسمیں اُنھیں کامیابی نہ ہوئی۔ سخنور ہونے کے علاوہ وہ سخن فہم بھی تھے۔ کسی نظم پر خوش ہوجاتے تو شاعر کو ہزاروں روپیہ انعام دے ڈالتے تھے۔ اس طرح بیس بائیس سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے تین چار لاکھ کی آبائی ریاست خورد برد کردی اور آخر میں مقروض ہوگئے۔ لیکن عشرت پرستیوں میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔

مہاراجہ صاحب بنارس نے بلاکر سمجھایا کہ "بتوا! گھر دیکھکر کام کرو۔" تو کتنا معقول جواب دیا کہ "یہ دولت میرے کتنے ہی بزرگوں کو کھا گئی ہے، اب میں سب کے بدلے اِسے کھا جاؤنگا۔" اس پر مہاراجہ صاحب دم بخود ہوگئے۔ بھارتیندو کی نانی کے پاس بھی خاصی جائداد تھی۔ وہ بھارتیندو کی فضول خرچیوں سے واقف تھیں

لہ ہندی شاعری میں اُنھیں پنڈت لوکنا تھ جی سے تلمذ تھا۔

اور اپنی کل ملکیت اُن کے چھوٹے بھائی کے نام ہبہ کرنا چاہتی تھیں۔ قانونی رکاوٹ تھی مگر اولوالعزم شاعر نے اپنی دست برداری داخل کرکے بلا پس و پیش اس رکاوٹ کو دور کر دیا اور اس طرح تقریباً دو لاکھ کی جائداد کی پرواہ نہ کی۔

اُن کے بہت سے مشاغل تھے جو اگلے وقتوں کے رئیسوں کے شایان شان سمجھتے تھے۔ گانا بجانا، کبوتر بازی، شطرنج، تاش غرض ان سب سے انھیں دلی رغبت تھی۔ حکم، چڑی، اینٹ، پان کو سنکھ، چکر، گدا، پدم[1]، کے نام دے رکھے تھے اور تاش کی تصاویر کو دیوی دیوتاؤں کے نام دیدیے تھے، وہ ہندو دھرم کے بڑے پابند اور سری کرشن جی کے بڑے بھگت تھے۔ دل میں حب الوطنی کے ساتھ سودیشی کی قدردانی کا بھی خیال تھا، اُن کی شادی چودہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی مگر ایک بنگالی عورت ملکا (मल्लिका) بائی سے بھی تعلق ہوگیا تھا، زندگی میں تو انھوں نے بیوی کا کوئی خاص خیال نہیں کیا، لیکن جب ریاست اودے پور کے سفر کے دوران میں انھیں محسوس ہوا کہ موت قریب ہے تو انھوں نے اپنے بھائی کو لکھا کہ اپنی بھاوج کی ہر طرح سے دلجوئی کرنا اور ملکا کی بھی لاج رکھنا۔ یہ سفر ۱۸۸۲ء میں ہوا، مہارانا سجن سنگھ والی میواڑ اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ انھیں سے ملنے بھارتیندو جی اودے پور گئے تھے۔ واپسی پر وہ بیمار ہوگئے۔ علمی مشاغل کے ساتھ ہر قسم کی بے عنوانیاں بھی جاری ہیں جن سے تپ دق ہوگیا۔ مرنے کے کچھ قبل ۲ جنوری ۱۸۸۵ء کو شدت کا بخار ہوگیا۔ ۶ کی صبح کو طبیعت کچھ سنبھلی۔ جب خادمہ نے حال پوچھا تو ہنسکر بولے:-

"ہمارے جیون ناٹک کا پروگرام نت نیا تیا چھپ رہا ہے، پہلے دن بخار کی، دوسرے دن درد کی، تیسرے دن کھانسی کے سین ہو چکے، دیکھیں لاسٹ نائٹ (آخری رات) کب ہوتی ہے؟"

یہی رات اُن کی "آخری رات" تھی، نو بجے رات کے قریب وہ یکایک پکار اُٹھے "کرشن! رادھا کرشن! رام! آتے ہیں! آنکھ دکھلاؤ!" اور دس بجتے بجتے اُن کی روح پرفتوح قالب عنصری سے پرواز کر گئی، ہندی کا ماہتاب بدر کامل ہونے سے پہلے ہی غروب ہوگیا! افسوس!!

بھارتیندو خود بھی حسین تھے، حسن کے قدردان تھے، وہ خوشنما کھلونوں اور تصویروں کے بھی بیحد شائق تھے، بناؤ سنگار سے دلی رغبت تھی۔ درحقیقت وہ سراپا حسن پرست اور مزاج سے عاشق زار تھے۔ حسن و عشق ہی اُن کی نظموں کا موضوع ہوتا تھا، اُن کے کلام میں صفائی اور بندش میں نفاست تھی، مگر شاعرانہ جذبات کا طرز اظہار پرانے طریقے ہی پر ہوتا تھا۔ تغزل کے دلدادہ تھے

---

[1] وشنو بھگوان کے چاروں ہاتھوں میں یہی چار چیزیں رہتی ہیں۔

موجودہ ہندی شعرا میں بھی یہ رنگ موجود ہے، مگر اس وقت زیادہ تر رمزیہ شاعری کی ترقی ہے۔ بھارتیندو کی شاعری اپنے وقتی رواج کے مطابق بیانیہ شاعری تھی، وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اُس کی ہو بہو تصویر کھینچ دیتے تھے، ایک کبت ملاحظہ ہو:-

بھولی سی بھری سی چونکی جکی سی تھکی گوپی دُکھی سی رہت کچھ ناہیں سُدھ[1] دیہ کی
موہی سی لُبھائی کچھ مودک[2] سے کھائے سدا بسری سی رہے نیک[3] کھبر نہ گیہہ[4] کی
رِس بھری رہے کبوں[5] پھولی نہ سمات انگ ہنس ہنس کہے بات ادھک اُمیہہ[6] کی
پوچھے تے[7] کھسانی ہوئے اُتر[8] نہ آوے تاہ[9] جانی ہم جانی یہ نسانی ہے سنیہہ[10] کی

भूली सी भरी सी चौंकी जकी सी थकी गोपी दुखी सी रहत कुछ नाही सुधि देह की
मोही सी लुभाई कुछ मोदक से खाये सदा विसरी सी रहे नेक खबर न गेह की
रिस भरी रहे कबौं फुली न समात अंग हस हस कहे बात अधिक उमेह की
पूछे ते खिसानी होये उत्तर न आवे ताहि जानी हम जानी यह निसानी है सनेह की

محاکات کی کتنی اعلیٰ مثال ہے، کوئی گوپی سری کرشن کے عشق میں مبتلا ہے سریع الحس شاعر نے اُن مختلف حالتوں کا ایک مرقع پیش کر دیا ہے جس سے جنونِ عشق کا اظہار ہوا کرتا ہے، اِن حالتوں کو کس خوبی سے بیان کیا ہے، خود فراموشی، حیرت، تکان، رنج، محبت، بیخودی، خاموشی، بیخبری، غصہ، خوشی، ہنسنا، جواب نہ دینا وغیرہ ساری علامتیں اِس خوبی سے یکجا کر دی ہیں کہ پڑھنے والے کے دل پر ایک سراسیمگی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ بھارتیندو کو سری کرشن جی سے بے انتہا عقیدت تھی جنھیں اُن کی ابتدائی زندگی کے لحاظ سے حسن و عشق کا دیوتا ہی کہنا چاہیئے، اُسی زندگی سے اُنھوں نے حسن و عشق کا سبق لیا تھا اور حقیقی و مجازی دونوں پہلوؤں سے اُنھوں نے طبع آزمائی کی۔ عشق مجازی کا نمونہ ہم اوپر کے کبت میں دکھلا چکے، اب عشق حقیقی سے متعلق بھی ایک چھوٹی سی نظم ملاحظہ ہو۔

پیارو پیئے[11] کیول[12] پریم میں
نہیں گیان میں نہیں دھیان میں، نہیں کرم[13]، کُل[14]، نیم[15] میں
نہیں مندر میں، نہیں پوجا میں، نہیں گھنٹا کی گھور[16] میں

[1] ششدر۔ [2] لڈو۔ [3] ذرا۔ [4] گھر [5] کبھی۔ [6] جوش مندی [7] سے۔ [8] جواب۔ [9] اُس کو۔ [10] عشق [11] پائیے [12] صرف [13] اعمال [14] خاندان [15] مذہبی قاعدے [16] شور

ہریچند وہ باندھیو ڈولے ایک پریم کے ڈور میں

प्यारो पैये केवल प्रेम में ।
नही ज्ञान में नही ध्यान में नही करम कुल नेम में ।
नहिं मंदिर मे नहिं पूजा में नहिं घंटा की घोर में ।
'हरी चद' वह बांधयो डोले एक प्रम की डोर में ।

(آہ پریم میں کتنی کشش ہے کہ سرب شکتیمان (قادرِ مطلق) بھگوان بھی اُس سے اپنا گلا نہیں چھڑا سکتے! یہ طاقت اور کسی میں نہیں، نہ گیان میں، نہ دھیان میں، نہ کرم دھرم میں اور نہ پوجا کے کسی ظاہری سامان میں، جبھی تو بھارتیندو جی نے اپنے نباد کے لئے پریم ہی کا سہارا پکڑا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ دنیا والے تھے، پس اُن کے پریم میں جہاں حقیقت تھی وہاں مجاز بھی تھا)

اب اُن کی دیگر نظموں کے بھی کچھ نمونے دینا ضروری ہیں، جس طرح اُن کے ناٹکوں میں "ستیہ ہریشچندر" مشہور ہے اُسی طرح اُن کی نظموں میں "بھارت دُردشا" ہے، ایک بند حسب ذیل ہے: ۔

انگریز راج سُکھ ساج[1] سجے سب بھاری　　پَے دھن بدیس چل جات یہی اَتِ[2] خواری
تاہو[3] پے مہنگی، کال[4]، روگ بستاری　　دِن دِن دُونے دُکھ دیت اِیش[5] ہا ہا ری
سب کے اوپر ٹکس کی آفت آئی　　ہا ہا بھارت دُردشا نہ دیکھی جائی

آخر میں مزاحیہ نگاری کے متعلق اُن کے چورن کا بھی ذائقہ لے لیجئے، دیکھئے کیسا چٹ پٹا ہے۔

ہندو چورن اس کا نام　　ولایت پورن اس کا کام
چورن جب سے ہند میں آیا　　اس کا دھن بل سبھی گھٹایا
چورن علے لوگ جو کھاویں　　دُونی رشوت تُرت بچاویں
چورن سبھی مہاجن کھاتے　　جس سے جمع ہضم کر جاتے
چورن کھاتے لالا لوگ　　جن کو عقل اجیرن[6] روگ
چورن کھائیں اڈیٹر ذات　　جن کے پیٹ پچے نہیں بات
چورن صاحب لوگ جو کھاتا　　سارا ہند ہضم کر جاتا
چورن پولس والے کھاتے　　سب قانون ہضم کر جاتے

---

[1] سُکھ کے سامان۔ [2] بہت بڑی۔ [3] اُس پر۔ [4] قحط۔ [5] ایشور۔ [6] عقل کا اجیرن۔

آجکل کی ادبی بدعتیں

(از میر ولی اللہ صاحب بی۔اے ایل ایل بی)

نکتہ آفرینی مشکل ہے اور نکتہ چینی آسان، ایک استاد کا قول بھی ہے:۔

گفت آسان گیر بر خود کارہا کز روے طبع
سخت می گیرد جہان بر مردمانِ سخت کوش

اس لئے اگر کوئی خوش ہو یا نا خوش، آج ہم اس آسان کام پر ہاتھ ڈالتے ہیں، جو سامنے آیا اس کی عیب جوئی کرینگے اور رطب و یابس کہتے چلے جائیں گے، کیونکہ "ملا آن است کہ چپ نشود"

(۱)

ایک صاحب نے علمی دنیا پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ فغانی شیرازی کے دیوان کو جو اب تک صرف صریر خامہ کا ہمنوا تھا، مشینوں پر چڑھا دیا ہے اور نہایت محنت اور لیاقت سے مختلف قلمی نسخوں کا مقابلہ کرکے ادبیات فارس کے اس گرانمایہ سفینے کو مرتب کرکے شائع کر دیا ہے۔ علم و ادب کی یہ خدمت قابل صد آفرین و تحسین ہے۔ اور ہم فارسی خواں پبلک کی طرف سے ان صاحب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

دیوان کے شروع میں آپ نے کلام فغانی پر ایک مختصر سا تبصرہ بھی لکھا ہے جس کے ضمن میں فغانی کا ایک شعر لکھکر اس کی شرح یوں رقم فرمائی ہے:۔

ایں وعدۂ یار است کہ صد بار شکستی — یک بار دگر از تو پذیرفتم و رفتم

"کیا دوستی کا وعدہ یہی ہے جو تو نے سو بار توڑا کیونکہ تو عہد شکن ہے، میں نے بھی ایک اور دوست ڈھونڈھ لیا ہے اور تجھ کو خیرباد کہتا ہوں"

یہ شعر فغانی کی "طبیعت کی آزادی" کے عنوان کے نیچے مثال کے طور پر لکھا ہے۔ اس عنوان کی تمہید آپ نے اس طرح لکھی ہے:۔

"فغانی کی طبیعت آزاد اور ہمت عالی تھی، ان کے اشعار سے ظاہر ہے کہ عشق و عاشقی کی گھاتوں

میں بھی وہ خوددار تھے، اور کسی سے دب کر نہیں رہتے تھے، بلکہ معشوق کی کجروی اور وعدہ فراموشی کا منہ توڑ جواب دیتے تھے۔"

فی الحقیقت، اس شعر سے عاشق نے معشوق کا منہ تو توڑ دیا ہے، لیکن سچ پوچھئے تو ساتھ ہی اپنا منہ بھی ایسا بگاڑا ہے کہ عاشق و معشوق دونوں ٹھٹنے نظر آتے ہیں، وہی بات ہے :-

گر تم نہیں تو اور کوئی مہ جبیں سہی

لیکن غور فرمائیے، کیا غنی کی عاشقی اور شاعری اتنے ہی پانی میں تھی؟

بات یہ ہے کہ حضرت شارح کسی کاتب کی ستم ظریفی کا شکار ہو گئے۔ شعر در اصل یوں تھا:-

ایں وعدۂ ناراست کہ صد بار شکستی
یک بار دگر از تو پذیرفتم و رفتم

یعنی ایسے جھوٹے وعدے تو سو دفعہ کر چکا ہے اور سو دفعہ توڑ چکا ہے، لیکن آج ایک دفعہ پھر ہم نے یہ جھوٹا وعدہ سن کر اسے سچا سمجھ لیا ہے۔

عاشق جانتا ہے کہ معشوق کے وعدے جھوٹے ہیں لیکن پھر بھی خود فریبی کرتا ہے اور جب کبھی نیا وعدہ ہوتا ہے اُسے سچا سمجھ بیٹھتا ہے۔ عاشق کے دل کی یہ سائیکالوجی غنی کشمیری نے خوب بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں :-

حریف یاس نتواں شدن دلہائے مشتاقاں
دروغے چند صرفِ وعدۂ امیدواراں کن

کسی کاتب نے "ناراست" کو "یاراست" بنادیا۔ اور "یک بار دگر" کو "یک یار دگر"۔ پھر کیا تھا بات ثریا سے گر کر تحت الثریٰ پر جا لگی۔ کسی نے سچ کہا ہے ؏

عاقلاں در پئے نقطہ نروند

لیکن اس کا کیا علاج کہ دنیا "نکتے" کو نہیں سمجھتی "نقطے" کو دیکھتی ہے۔ اندھیر ہے۔

(۲)

تھوڑا عرصہ ہوا ایک فتحپوری صاحب نے اپنے کسی مضمون میں کسی چیز کو "معرکۃ الآرا" لکھدیا۔ اس پر ایک اور صاحب بگڑ بیٹھے اور فرمایا واہ! مولانا آپ کی عربی دانی معلوم ہوئی، "معرکہ" عربی لفظ ہے اور "آرا" (از مصدر آراستن) فارسی۔ ان مختلف زبانوں کے دو لفظوں میں الف لام لگا کر یہ کیا گنج العرشی ترکیب پیدا کی۔

معترض صاحب کی یہ اصلاحی کوشش قابل شکریہ ہے، لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ معرکہ عربی النسل ہے تو آرا (جمع رائے) بھی آنا فارسی نژاد نہیں کہ دونوں میں رشتۂ اتحاد ناممکن ہو، بس یہی سمجھیئے کہ "خرِ ما ہم چنداں نرنبود"

لیکن ہماری حماقت ملاحظہ ہو کہ خود نکتہ چیں ہو کر اوروں کی نکتہ چینی پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔

(۳)

آجکل نئی روشنی نے تمام دنیا کو ریسرچ اسکالر بنا دیا ہے، جسے دیکھو اسلاف کی غلطیاں نکالنے میں دن رات ایک کر رہا ہے ایک طبقہ اصلاح زبان کے پیچھے ایسا ہاتھ دھو کر پڑا ہے کہ زبان بچاری الاماں الاماں پکار اُٹھی ہے۔

پُرانے الفاظ اور پُرانی ترکیبیں زبان پر چڑھی ہوئی تھیں، ہم غریب ان سے مانوس ہو چکے تھے، اب یہ حضرات مُصر ہیں کہ انھیں چھوڑ دو اور ہماری ٹکسال کے گوڑھے ہوئے لفظوں کو رائج کرو۔ ورنہ بےتُک سمجھے جاؤ گے۔ زمانۂ حال کے ان علاموں کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔

بعض کہتے ہیں کہ "ذمہ وار" نہ کہا کرو "ذمہ دار" کہا کرو۔ چنانچہ آجکل تمام پڑھے لکھے لوگ ذمہ دار ہی بولتے ہیں، اور پھر یہ جتانے کے لئے کہ ہم بڑے وہ ہیں، ہر تقریر میں خواہی نخواہی تین چار دفعہ ذمہ دار اور ذمہ داری کے الفاظ کو دُہرا لیتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ہم ذمہ وار کی جگہ ذمہ دار کہنا تو درکنار سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ کسی کو ذمہ دار کہتے ہوئے سُن لیں تو سچ مچ روح کو صدمہ ہوتا ہے۔

کوئی ان سے پوچھے کہ بھائی ذمہ وار کیوں غلط ہے۔ اگر غلط ہے تو قصوروار اور سزاوار کو بھی قصوردار اور سزادار بنا ڈالئے، بلکہ اُمیدوار بھی زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ع

نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں

بعض کہتے ہیں کہ بھائی اپنے نام کے ساتھ "آپ کا تابعدار" نہ لکھا کرو، ایسا کرنے سے تو گویا اپنے آپ کو آقا اور مالک بنا رہے ہیں۔ کیونکہ اسم اور سامرل کر اسم فاعل بنتا ہے، تابع دار یعنی تابع رکھنے والا مطیع بنانے والا

اب یہ کون کہے اور کہکر گالیاں کون سنے کہ بھائی جس گریمر کی رو سے اسم اور امر ملکر اسم فاعل بنتا ہے اسی گریمر کے بموجب اسم اور امر ملکر اسم مفعول بھی بن جاتا ہے۔ کیا "دست گیر" "دست گیرندہ" اور "دست گرفتہ شدہ" دونوں معنوں میں نہیں آتا۔ کیا "دلگیر" دل پکڑنے والے کو کہتے ہیں۔ یا اُس کو جس کا دل پکڑا ہوا ہو۔ اور کیا اس قسم کے اور بیسیوں الفاظ نہیں۔ جو دونوں معنوں میں استعمال ہوتے

ہیں۔ پھر تابعدار کو بھی تابع داشتہ شدہ سمجھئے اور ہم تابعداروں کی جان بخشی کیجئے۔

کچھ عرصے کی بات ہے کہ ہمارے ایک دوست نے کلوپیٹرا (ملکۂ مصر) کے متعلق ایک اُردو مضمون لکھا اور کلوپیٹرا کو نہایت جلی قلم اور مولویانہ انداز سے "قلوبطرا" تحریر فرمایا۔ مضمون کا شائع ہونا تھا کہ دنیائے ادب میں ہلچل مچ گئی۔ اس پر انجمن اصلاحِ زبان نے ایک کانفرنس منعقد کی جس میں قرار پایا کہ اس انجمن کے صدر یعنی مدیر بحرِ علوم کے اس طوفان بدتمیزی کو روکنے کے لئے ایک مقالہ تحریر فرمائیں۔ چنانچہ آں حضرت نے سچ مچ ایک مقالہ تحریر فرما دیا۔ اور قلوبطرا پر لعن طعن کرکے اُردو حروف میں مضمون لکھنے والے اصحاب کو اس قاعدۂ کلیہ کی طرف توجہ دلائی کہ غیر زبانوں کے ناموں کو ق ط ع ص ض وغیرہ حروف سے لکھنا جائز نہیں بلکہ کسرت۔ الف اور سین سے لکھنا چاہیئے

اب ان علامہ سے اگر کوئی پوچھ لیتا کہ جناب یہ قاعدۂ کلیہ آپ کہاں سے لائے تو یقین جانیئے اتنی گالیاں سنتا کہ عمر بھر یاد رہتیں۔

لیکن اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ ابوعلی سینا کو اویسینا اور ارسطاطالیس کو ارستو اور ارستاتالیس کوئی نہیں لکھتا۔ سقراط کو سکرات کوئی نہیں لکھتا یوکلیڈ کو لوگ اقلیدس ہی لکھتے ہیں۔ اکلیدس کبھی نہیں لکھا۔ قسطنطنیہ کو کنستنتینیہ لکھ کر دیکھئے تو سہی کہ ترک لوگ کیا کہتے ہیں۔

پھر اگر اس بیچارے نے کلیوپیٹرا کو قلوبطرا لکھ دیا تو لاحول کون سی داڑھی ہوگئی کہ آپ کو اس قدر غصہ آیا۔

(۴)

آجکل مزاحیہ نویسی کا زور شور ہے، تمام دنیا مزاحیہ نویس بن گئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سبھی اہل قلم مزاحیہ مضامین لکھ سکتے ہیں اور اُردو رسالوں کے ایڈیٹروں کو اُن کے شائع کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی سے یہ کہدے کہ بھائی آئندہ مزاحیہ مضمون نہ لکھا کرو، کیونکہ تمھارے مضمون بالکل بیہودہ ہوتے ہیں تو یقیناً وہ اُسے قتل کرڈالے یا خودکشی کرلے۔ بہرحال کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا ہے کہ وہ لوگوں کو مزاحیہ نویسی یا ہزالیت سے روکے تاہم اس قدر عرض ضرور ہے کہ مزاحیہ مضمون نگاروں کو بازی بازی بار لیش بابا ہم بازی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اور اگر یہ درست ہے کہ بابا کی داڑھی سے کھیلنا اچھا نہیں تو بچاری اماں کی انگیا سے یا بھابھی جان کے پاجامے سے اٹھکھیلیاں کرنا کون سی شرافت ہے۔

کچھ عرصہ ہوا ایک رسالے میں "بھابھی جان" کا ایک شاہکار شائع ہوا تھا۔ عنوان پر نظر پڑتے ہی

خیال آیا کہ ہندوستان کے بھائی جان تو بالکل نابکار ہوچکے، یہ کونسی خوش نصیب بھابھی جان ہیں جنھوں نے شاہکار کر دکھایا۔ مضمون شروع سے آخر تک پڑھا، لیکن غم وغصہ کی اس حالت میں کہ اگر مضمون نگار نزدیک ہوتا تو کسی پٹھان کو تیس روپے دیکر اُسے اُس کے حوالہ کردیتا، بندۂ خدا نے بھابھی جان کے حمل ٹھہرنے کے وقت سے لیکر وضع حمل تک کے تمام کوائف وحوادث کا بیان کیا ہے، اور وجود حمل کی تمام جسمانی اور نفسی علامات کو ظاہر کیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک جگہ ایک شعر بھی زیب رقم فرمایا ہے جس میں بھابھی جان کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ اس محبت کا مزا نو مہینے کے بعد معلوم ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس پر کمال یہ ہے کہ یہ تمام قصہ آپ نے اپنی بھابھی جان کے متعلق لکھا ہے۔

مضمون نگار کہہ سکتا ہے کہ نہ اس کا کوئی بھائی ہے نہ کوئی بھابھی، اور ہم یہ مان بھی لیں گے کہ اس کا بھائی کوئی نہیں، اور چونکہ اس کا بھائی نہیں اس لئے اس کی بھابھی بھی کوئی نہیں، لیکن چچا کا کوئی لڑکا ہوگا، ماموں کا بیٹا ہوگا، خالہ صاحب اولاد ہوگی، یہ بچارے کیا کہتے ہونگے، اور ان کی بی بیاں کیا سمجھتی ہونگی۔ اور اگر یہ سب بھی کچھ نہیں، اور شجرۂ نسب کی تمام شاخیں کٹ چکی ہیں تو کم ازکم یہ امر تو مسلمہ ہے کہ اور لوگوں کے بھائی اور بھابھیاں ہیں۔ وہ پڑھکر کیا کہیں گے۔

یہ مضمون پڑھکر ہمیں اپنے شہر کا جمعہ توبرہ (بھانڈ) یاد آگیا، یہ شخص زمینداروں کے مجمع میں اپنی ولادت باسعادت کے تمام حالات تفصیل کے ساتھ بیان کرکے لوگوں کو ہنساتا اور پیسہ پیسہ کرکے روزانہ اچھی خاصی رقم پیدا کرلیتا ہے۔

اگر کوئی ایڈیٹر صاحب چاہیں تو ہم ان کے رسالے کے لئے جمعہ توبرہ کا یہ تصنیف شدہ مزاحیہ مضمون لکھواکر بھجوا سکتے ہیں، عنوان یہ ہوگا،

"اماں جان کے وضع حمل کی کہانی"

(جمعے توبرے کی زبانی)

صرف اتنی بات ہے کہ جمعہ توبرہ اپنی کوئی تصنیف اشاعت کے لئے مفت نہیں دیتا۔ حیف ہے کہ جمعہ توبرہ تو اپنی تصنیف سے پیسے کمائے اور بھابھی جان کا شاہکار جیسا علمی شاہکار مفت چھپ جائے۔

(۵)

ایک زمانہ تھا کہ اسکولوں کے نصاب تیار کرنے پر ملک کے مشہور ترین فاضل اور ادیب مقرر ہوتے تھے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئیے، کیونکہ زبان ومحاورہ کی صحت کی سب سے زیادہ ضرورت نصاب کی

١٨٠١٥

کتابوں میں ہے: بچپن کے سیکھے ہوئے غلط لفظ نقشِ حجر کی طرح تمام عمر ذہن انسانی پر متصرف رہتے ہیں۔ آخر عمر تک جب کبھی کسی لفظ کی صحت وعدم صحت کا شک دل میں آتا ہے تو اکثر اسکول کے وقت کا پڑھا ہوا کوئی فقرہ یا شعر یاد آجاتا ہے، جو اس لفظ کی صحت کی سند کا کام دیتا ہے۔ لیکن آجکل یہ حالت ہے کہ نصاب تعلیم کی کتابیں ایسے اصحاب تصنیف کر رہے ہیں جنھیں زیادہ سے زیادہ "نیم خواندہ" کہا جاسکتا ہے۔ ہمارے صوبے کے اسکولوں میں اُردو کی ایک کتاب پڑھائی جاتی ہے جس میں ایک منظوم کہانی ہے، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

"یوں کہا لڑکے نے دیکھی شیخ کی جب کہ تَشَکُّل
ایسا بوڑھا آدمی اتنی نہیں تجھ میں عَقَل"

اس عَقَل اور اس تَشَکُّل پر شاعری او مصنفی کی جرأت! اندھیر ہے۔

(۹)

آجکل ایک صاحب اُردو کی ڈکشنری تالیف فرمار ہے ہیں، اور سچ پوچھیے تو تالیف نہیں بلکہ تصنیف فرمارہے ہیں

اس کتاب کا نام کچھ اور ہے لیکن صحیح نام "جامع الاغلاط" ہونا چاہیے، کچھ عرصہ ہوا کہ ہم لاہور گئے، اور حسب معمول شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب، اندرون لوہاری دروازہ، لاہور، کی دوکان پر بھی حاضری دینے چلے گئے۔ رسالوں اور اخباروں میں اس کتاب کے اشتہار دیکھے تھے، شیخ صاحب سے اس کتاب کا ایک حصہ مانگا، اور تفریحًا ورق گردانی کرنے لگے، اسمیں قطعًا مبالغہ نہیں کہ صرف پانچ منٹ کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت ہم پر روشن ہوگئی کہ کتاب خطرناک غلطیوں کا ایک پلندہ ہے۔

لوگ کہتے ہیں اور بالکل سچ کہتے ہیں کہ نقل را ہم عقل باید، اس میں شک نہیں کہ مختلف لغات کو سامنے رکھکر ایک جدید لغت کا تیار کرلینا چنداں مشکل نہیں ہوتا، پھر بھی تھوڑی بہت عقل ضرور درکار ہوتی ہے۔

اس تالیف کی بے اعتدالیوں کے "مشتے نمونہ از خروارے" پر نظر کیجیے اور فاضل مؤلف کی محنت کی داد دیجیے: "آزادگاں" کو آزادی کی جمع بتایا ہے، حالانکہ فارسی گریمر کے مبتدیوں کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آزادگاں آزادہ کی جمع ہے نہ کہ آزادی کی

"آزادہ کے معنی لکھے ہیں، وہ شخص جس کی رہائی اس کے اپنے ہاتھ میں ہو، یہ ایجاد بندہ ہے گویا آزادہ وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو ایک کمرے میں قید کرکے اندر سے زنجیر لگالے اور جب چاہے

دروازہ کھولکر باہر نکل جائے۔ حال یہ ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی جانتا ہے کہ آزادہ آزاد منش آزاد طبیعت اور آزاد خیال آدمی کو کہتے ہیں۔

"آذر" کے ماتحت لکھا ہے (۱) آگ۔ (۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام وغیرہ وغیرہ اور آگے چلکر لفظ "آزر" کے سامنے صرف یہ لکھدیا ہے کہ دیکھو آذر۔

گویا فاضل مؤلف کے نزدیک "آذر" اور "آزر" ایک لفظ ہے۔ سچ یہ ہے کہ "آذر" فارسی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں آگ (وغیرہ) اور "آزر" غیر فارسی لفظ ہے جو نام ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ یا چچا کا۔

انھی باتوں کی تحقیق کے لئے ایک طالب علم کو ڈکشنری کی ضرورت ہوتی ہے، اگر ڈکشنری کا یہ حال ہو تو یقیناً کار طفلاں تمام خواہد شد۔

لفظ "آزرد" (ماضی مطلق از مصدر آزردن) کو اول تو اردو ڈکشنری میں لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی، ورنہ جمید، خرامید، نوشید، آشامید وغیرہ تمام الفاظ کو بھی جمع کر لیتے، اور تعداد لغات کو بڑھا لیتے۔ لیکن اگر لکھ ہی دیا تھا، تو آزردن مصدر لازم بھی ہے اور متعدی بھی، دونوں معنی لکھے جانے ضروری تھے، صرف ایک معنی پر اکتفا کرنا طالب علم کو غلطی میں ڈالنا ہے۔

ہم اس کتاب پر مفصل تبصرہ کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں، لیکن یہ امر فرصت پر منحصر ہے یہاں صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ اگر ہم بادشاہ وقت ہوتے تو اس کتاب کی تمام جلدیں بحق سرکار ضبط کر کے انھیں نذر آتش کر دیتے۔ ایسی کتابوں کی تدوین بچوں کے کھانے کے میز پر زہر کی شکر اندود گولیاں رکھ دینے کے برابر ہے۔

انتہائے ستم یہ ہے کہ ہندوستان اور پنجاب کے بڑے بڑے آدمی یعنی بڑے بڑے خان بہادر اور رؤسا، اس کتاب کی تعریف میں اس قدر رطب اللسانی کر رہے ہیں کہ زبانیں خشک ہوئی جاتی ہیں۔!

(۷)

اس زمانے میں اُردو شاعری کا اس قدر زور ہے کہ سبھی شاعر بن گئے ہیں، خواہ نظم در کنار صحیح نثر لکھنی بھی نہ آتی ہو۔ بہر حال اس وقت خدا جھوٹ سے بچائے ہندوستان کی چونتیس کروڑ آبادی میں سترہ کروڑ انسان ضرور شاعر ہونگے۔ اس میں شک نہیں کہ شعر کہنا بنی آدم کا پیدائشی حق ہے، اور اس لئے کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ کسی دوسرے کو شعر کہنے سے روکے۔ لیکن اُردو

رسالوں کے ایڈیٹروں کا اتنا فرض ضرور ہے کہ وہ غلط اشعار کو شائع نہ کریں۔ یا کم از کم اپنے رسالے کے سرورق پر یہ لکھدیا کریں کہ اس رسالے کے اجرا سے علم و ادب کی خدمت مقصود نہیں، صرف اپنی شکم پروری مطلوب ہے۔ مختلف رسالوں کے تازہ نمبروں سے چند اشعار منتخب کئے گئے ہیں ان پر غور فرمائیے:

ایک صاحب جو حد سے زیادہ مائل بہ شعر ہیں، فرماتے ہیں:۔

شایانِ نظر ساقیِ کوثر کے ہو گئے دو چار میکدے تو مرے گھر کے ہو گئے

'نظر' بسکونِ ثانی کتنا پُر لطف ہے۔ (اسناد پر بحث نہ فرمائیے)

تو چھو نہ آشیانہ کو میں عندلیب کو بجلی سے یہ اشارہ کہ گل تر کے ہو گئے

کیا روزمرہ ہے، حذفِ فعل نے پہلے مصرعہ میں جان ڈال دی ہے۔

آتے ہی اُن کے رنگِ قیامت بدلگیا فتنہ تمام ایک ہی ٹھوکر کے ہو گئے

آپ کچھ سمجھے؟

پونچھیں جو عاشقوں کی دعائیں الگ الگ رشتہ ہزار گوشۂ دلبر کے ہو گئے

ہم تو کچھ نہیں سمجھے!

یہ غزل غیر مطبوعہ ہی سہی، لیکن کیا ضرورت کہ اسے مطبوعات میں شامل کیا جائے۔

ایک اور صاحب اپنی سلیم الطبعی کا یوں ثبوت دیتے ہیں:۔

ع "مدت گزر گئی ہے چیخ و پکار کرتے"

رسوم و قیود کی پابندیوں سے آزاد ہو کر چیخ و پکار چیخ چیخ کر اور پکار پکار کر داد ایجاد طلب کر رہی ہے لیکن انصاف کہاں؟

ایک اور لطیف نازک خیالی ملاحظہ ہو:۔

جس طرح ملفوف ہو شیرازۂ قرطاس میں برگ گل یا موسمِ گل کا وداعی ارمغاں

شیرازۂ قرطاس! اور اس میں کسی شئے کا ملفوف ہونا، سبحان اللہ کیا بندش ہے۔

ایک اور صاحب فرماتے ہیں، حُسنِ بیان ملاحظہ ہو:۔

خاکساری کی خاک اُڑاتے ہو یہ جزا ہے اگر سزا کیا ہے

کچھ نہیں ہے بجز فریبِ عشق کیا بتائیں کہ دل میں کیا کیا ہے

لفظ عشق کو اگر عشق پڑھا جائے تو سچ مچ شعر کا لطف آجائے۔

ایک اور صاحب کا زمزمہ عشق اس طرح شروع ہوتا ہے :-

نقشۂ باغِ جناں تیغ خوں آشام میں ہے
دولتِ لطفِ بقا قتل کے انجام میں ہے

یہ خون آشام کا نون غنہ، سبحان اللہ!

ایک مشاعرہ کی غزل کا مطلع سنئیے :

پیاس بیمارِ محبت کی بجھانے کے لئے
شربتِ دیدار کافی ہے پلانے کے لئے

پیاس کی جگہ بھوک ہوتی تو شعر خوب رواں ہوتا، لیکن پھر شربت کی جگہ حلوا شعر میں کیونکر سماتا۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے :

کھینچئے شمشیر جھوٹوں آزمانے کے لئے
دیکھیئے کون آئے گا پھر سر کٹانے کے لئے

"جھوٹوں آزمانے کے لئے" خوب ہے اور بہت خوب، ممکن ہے کہ وہاں کے محاورے کے مطابق صحیح بھی ہو۔

ایک اور شاعر نے نعت لکھی ہے، خدا ان کی سعی کو مشکور فرمائے، کہتے ہیں :

اگرچہ سیدِ عرب و عجم ہے آقا ہے
مگر یہ خلق محب العوام ہے ساقی

عَرَب بروزن غَرَب سے شعر میں روانی تو ضرور پیدا ہو گئی ہے، اور پھر ضرورتِ شعری کے مقابلے میں زیر و زبر چیز ہی کیا ہے۔

نظم کے نمونے تو دیکھے، نثر کا ایک نمونہ بھی دیکھ لیجئے۔ ایک صاحب نے ایک مضمون کے دوران میں دوستوں کی قسمیں بیان کی ہیں :-

"کالجی۔ مدرسی۔ دفتری۔ تھیٹری۔ سینمائی۔ سفری۔ ریلی۔ موٹری۔ سڑکی راہی۔ مکانی۔ کمری۔ بستری۔ اتفاقی۔ ناگہانی۔ بازاری۔ دکانی۔ دسترخوانی۔ وقتی جباری (جبریہ کوئی دوست بن گیا ہو) سگریٹی۔ چائیوی۔ کوٹھاوی۔ ہوٹلی۔ باغی پارکی۔ جنگلی۔ دریائی۔ حمامی۔ ندوی۔ فالوی۔ کارخانوی۔ رسالوی۔ خطی۔ (اسے خبطی نہ پڑھ لیجئے) مضمونی۔ غزلی۔ ادبی۔ غیرادبی۔ جنگی۔ (معاف کیجئے یا رے معروف کہیں نسبتی

ہوگی اور کہیں توصیفی)"

ممکن ہے اس فہرست میں ادبیت بھی ہو اور مزاح بھی، لیکن ہمیں دونوں میں سے ایک چیز بھی نظر نہیں آتی۔

رسالوں کے ایڈیٹر اور مالک علم و ادب کی اس طرح خدمت کر رہے ہیں، !

(۹)

تاج محل آگرہ پر سیکڑوں مضمون پڑھے، سیکڑوں نظمیں دیکھیں، ہزارہا آدمیوں سے اس کی تعریفیں سنیں، اسکی رنگارنگ تصویریں نظر سے گذریں، آخر نہ رہا گیا، اُٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے ٹکسلہ کے راستے آگرہ جا پہونچے۔ تاج محل دیکھا اور جیسا سُنا تھا ویسا ہی بلکہ اُس سے بھی بڑھ چڑھکر پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاج کی تعمیر میں جس خوبی تدبیر اور حسنِ تعمیر سے کام لیا گیا ہے اسکو لفظوں میں ادا کرنا مشکل ہے۔

ممتاز محل شاہجہاں بادشاہ کی ملکہ کا نام تھا جن لڑکیوں کا نام ممتاز محل ہوتا ہے انھیں عام طور سے "تاج" کہکر پکارتے ہیں۔ عمارت کا نام روضۂ ممتاز محل ہے۔ لوگوں نے اسے مخفف کر کے صرف ممتاز محل اور پھر اُسے بگاڑ کر "تاج محل" بنا دیا ہے، بلکہ مزید تخفیف کر کے بعض لوگ تاج محل کو صرف "تاج" بھی کہتے ہیں۔

محکمہ آثار قدیمہ نے تاج محل پر ایک بورڈ آویزاں کیا ہے، جس پر لکھا ہے "تاج محل" اور نیچے اس کا انگریزی ترجمہ دیا ہے "کراؤن پیلیس" (Crown Palace) کراؤن بزبان انگریزی تاج شاہی اور پیلیس محل شاہی کا مترادف ہے۔ اس ترجمے کو دیکھکر ہماری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی کیونکہ ماہرین فنون آثار قدیمہ میں بعض لوگ خان بہادر بھی ہیں اور شمس العلما بھی، ان کی خان بہادری پر ہمیں اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں، لیکن ان کی شمس العلمائی پر ضرور افسوس آتا ہے۔

رباعیات فرحت

عشق کی مستیوں میں ہستی کیسی	بت پرستی میں خود پرستی کیسی
بیخودی نے شراب دی ہے ایسی	بھولا نہ جہاں کو میں تو مستی کیسی

یارب غمِ عشق کی ہے مستی کیسی	ڈوبی ہے اسی رنج میں ہستی کیسی
خود پرستی کا اور مجھ پر الزام	خود کو بھولا ہوں خود پرستی کیسی

کوثر کی ہوس سے مے پرستی اچھی	امید نعم سے فاقہ مستی اچھی
گر وصل نہو تو ہجر سے بہتر موت	نادیدہ خدا سے بت پرستی اچھی

گنگا دھر ناتھ فرحت

یاس

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ بی۔اے ایل ایل۔بی)

اے یاس رو کشِ ستمِ آسماں ہے تو | باغِ مراد کے لئے دورِ خزاں ہے تو
ڈرتے ہیں تیرے ظلم سے شیدائے آرزو | دل میں چھپائے ہیں گلِ رعنائے آرزو
ٹکڑے دل و جگر کے ہیں قطرے لہو کے ہیں | یہ پھول آرزو کے عجب رنگ و بو کے ہیں
پروردۂ بہار پہ جور و جفا نہ کر | پیراہنِ حیات کو اِن کے قبا نہ کر
تو کس لئے جہاں میں عدوئے مراد ہے | خلقت تمام سر خوشِ بوئے مراد ہے

(۲)

کہنا کسی کا مان لے۔ ایسی نہیں ہے تو | روئے زمیں پہ گردشِ چرخِ بریں ہے تو
اہلِ جہاں کے دل پہ نمایاں جو داغ ہیں | صہبائے آرزو کے یہ خالی ایاغ ہیں
ویراں کیا ہے تو نے گلستانِ آرزو | مرجھا کے رہ گئے گلِ خندانِ آرزو
تو نے اُڑائی خاک حریمِ بہار میں | عظمت لکھی گئی تری خطِ غبار میں
جس دل میں آئی تو اُسے برباد کر گئی | ذوقِ طلب کہاں ہے؟ تمنا کدھر گئی
اب کیا دھرا ہے ہستیِ ناپائدار میں | حرماں نصیب روتے ہیں شبہائے تار میں

(۳)

اے یاس تیرے ظلم کی گو انتہا نہیں | تو وہ مرض ہے دہر میں جسکی دوا نہیں
لیکن خفا ہو تجھ سے نہ خلقِ خدا ابھی | باقی ہے ایک رخ تری تصویر کا ابھی
باغِ جہاں میں قدرتِ حق کا ظہور ہے | ہر نیک و بد میں ربطِ نہانی ضرور ہے
تیری جفا میں عنصرِ لطف و وفا بھی ہے | ظلمت کے ساتھ ساتھ نمودِ ضیا بھی ہے
ڈالا ہے آرزو نے عجب پیچ و تاب میں | ہم کو سکوں نہیں ہے جہانِ خراب میں

گو دیکھنے میں نازشِ رنگ و بہار ہیں ۔۔۔ یہ پھول آرزو کے حقیقت میں خار ہیں
کوشش سے تیری حسرت و ارماں فنا ہوئے ۔۔۔ جن سے خلش تھی دل میں وہ پیکاں فنا ہوئے
کیوں مضطرب ہو کوئی تمنا کے واسطے ۔۔۔ تو نے سکوں دیا ہے ہمیشہ کے واسطے

تو محفلِ سُرورِ حقیقی کی صدر ہے
اے یاس! تیری رمز شناسوں میں قدر ہے

وقت

(از حضرت تسکین سوردنی)

نغمۂ فردا میں آوازِ فغانِ دوش ہے ۔۔۔ زندگی صد انقلابِ دہر در آغوش ہے
دیکھ اگر حاصل ہے تجھکو دیدۂ فطرت نظر ۔۔۔ سُن اگر تو صاحبِ ادراکِ فہم و ہوش ہے
کارفرمائے جہاں ہیں وقت کی نیرنگیاں ۔۔۔ ذرہ ذرہ شرحِ اسبابِ تغیر کوش ہے
ہستیِ انساں اک قطرہ ہے لیکن مضطرب ۔۔۔ وقت اِک بحرِ رواں ہے اور پھر خاموش ہے
اک حقیقت در حجاب۔ اک رازِ عالم آشکار ۔۔۔ وقت میں خود شاہدِ روزِ ازل روپوش ہے

تا ابد یہ دَورِ سامانی بدل سکتی نہیں
کوئی طاقت حکمِ ربّانی بدل سکتی نہیں

شرحِ اسرارِ بقائے کائناتِ بے حساب ۔۔۔ انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب
بے ثباتی میں ہے استحکامِ فطرت کا ثبوت ۔۔۔ ہر تغیر ہے دلیلِ ارتقائے کامیاب
کارگاہِ دہر اِک معمورۂ اضداد ہے ۔۔۔ جن کو ہے دنیا و ما فیہا سے یکسر انتساب
وجہ تغیراتِ عالم، رازِ تعمیرِ حیات ۔۔۔ حاملِ صد موت و ہستی جوں حباب اندر حباب
منفرد لیکن باندازِ تسلسل مشترک ۔۔۔ ہیں یہ اضداد اتفاقِ وقت ہی سے بہرہ یاب

سچ تو یہ ہے منبعِ اسرارِ قدرت وقت ہے
اس جہانِ ناتواں کی تاب و طاقت وقت ہے

مرزا رفیع الشان

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

بادشاہ اودھ مرزا محمد علی شاہ کے سب سے چھوٹے فرزند مرزا رفیع الشان نقی علیخاں بہادر تھے جو شاہانہ تزک و احتشام سے لکھنؤ میں زندگی بسر کرتے تھے محمد علیشاہ کے بعد یہ اس واسطے تخت سلطنت پر نہیں بیٹھ سکے کہ بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے مرزا امجد علیشاہ ولیعہد تھے اسلئے یہ سلطنت سے محروم رہے انکی والدہ کا نام امراؤ بیگم تھا۔

شاہی زمانہ میں مرزا رفیع الشان اور مرزا اعظم الشان نقی علیخاں انکے بڑے بھائی دونوں کوٹھی ظلوربخش اور نوربخش میں نہایت تزک و احتشام سے رہتے تھے۔

انکے کئی محل تھے اور کثیر الاولاد تھے۔ اڑتیس ۳۸ اولادیں تھیں بعض کے نام جو معلوم ہو سکے یہ ہیں۔

خاص محل سے مرزا محمد عسکری اور اکبر الشان تھے۔

اکبر الشان کو نواب ممتاز الدولہ کی صاحبزادی بیاہی تھیں دوسرے محل سے نواب منصور علیخاں اور نواب جمیل الشان تھے نواب جمیل الشان کو نواب حاجی بیگم کی بیٹی بیاہی تھیں۔

نواب حاجی بیگم صاحبہ محمد علیشاہ بادشاہ کی پوتی تھیں جمیل الشان امین آباد میں اور منصور علی خاں کٹرہ میں رہتے تھے۔

ایک بیٹے نواب والاشان تھے جنکو نواب منگا کی بیٹی بیاہی تھیں۔ نواب منگا نواب بہو بیگم کے خاندان سے ہیں۔

کچھ بیٹے کشمیری محلے میں رہتے تھے نواب باقر صاحب نواب چھوٹے مرزا صاحب نواب ننھے مرزا صاحب نواب پیارے مرزا صاحب نواب محمد عسکری صاحب نواب منے صاحب نواب اغن صاحب۔

جب غدر ہوا تو معلوم نہیں مرزا رفیع الشان اور مرزا عظیم الشان کہاں چلے گئے کئی مہینے کے بعد جب تسلط ہوا تو لکھنؤ آئے اور نواب گورنر جنرل بہادر نے دربار خاص کیا

عالیشان خیمہ نصب کیا گیا فرش قالین کا بچھایا گیا دو رویہ کرسیاں ۔ سامنے سنہری مسند اور مسند پر کرسی پر تکلف کارچوبی رکھی اور مسند کے پہلو میں دو کرسیاں لگائیں ۔ اسکے پیچھے عملہ چوبدار وغیرہ کھڑے ہوئے خاندان شاہی لباس زریں سے آراستہ ہو کر درخیمہ تک آیا چیف کمشنر نے مرزا قمر قدر اور نواب محسن الدولہ کو براتب خلوت میں طلب کیا ۔ بیڈن صاحب سکریٹری نے تمام شہزادوں کو داہنی طرف کی کرسیوں پر بٹھایا ۔ بمن صاحب ڈپٹی سکریٹری نے درجہ دوم کے رؤسا کو انکی جگہ پر بٹھایا فاسٹ سائیٹ صاحب سکریٹری چیف کمشنر نے درجہ سوم کو دست چپ کی کرسیوں پر بٹھایا ۔

نواب گورنر جنرل بہادر چار بجے برآمد ہوئے ۔ سلامی کی توپ چلی پہلے مرزا قمر قدر ، نواب مصطفےٰ علیخاں ، مرزا دارا سطوت ، مرزا سلیمان قدر سے نواب گورنر جنرل نے ہاتھ ملایا ۔ اسکے بعد مرزا خورم بخت ، یحییٰ علیخاں ، مرزا عظیم الشان ، محمد تقی علیخاں ، مرزا رفیع الشان ، محمد نقی علیخاں پیش ہوئے انسے ہاتھ ملایا پھر اپنی اپنی کرسیوں پر سب بیٹھے ۔

اسکے بعد درجہ دوم کے نواب محسن الدولہ ، عظمت الدولہ ، نواب سرفراز الدولہ ، نواب امتیاز الدولہ ، معز الدولہ ، نظام الدولہ ، اقتدار الدولہ ، غضنفر الدولہ ، جرات الدولہ ، حشمت الدولہ ۔ مرزا ابو تراب خاں ان سب نے نیم قد خم ہو کر ہاتھ ملایا ۔ اسکے بعد درجہ سوم کے لئے فاسٹ سائیٹ صاحب سکریٹری چیف کمشنر اٹھے نواب ممتاز الدولہ ، مرزا بیدار بخت ، مرزا خورم بخت ، جلیل الشان پسر مرزا عظیم الشان وغیرہ سب اسی طرح سلام کر کے اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے ۔

گورنر جنرل نے اسپیچ دی جسکا منشا یہ تھا کہ تم سب گورنمنٹ کے خیر خواہ اور فرمانبرداری میں مستعد بنے رہو ۔

غدر کے بعد نواب رفیع الشان نے دلارام کی بارہ دری کرایہ پر لی اور اسی میں معہ اولاد قیام فرمایا ۔

نواب جہان آرا بیگم جو محل ثانی نواب اشرف جہاں بیگم سے نواب رفیع الشان کی بیٹی تھیں ۔ بچپنے سے نہایت ذکی و شوخ تھیں حضرت واجد علیشاہ بادشاہ انکو بجلی کہتے تھے ۔ امجد علی بادشاہ کے عہد حکومت میں پیدا ہوئی تھیں غدر کے بعد انکی شادی نہایت دھوم دھام سے نواب

ذکاء الدولہ خلف نواب حاجی بیگم سے ہوئی جو آغا مرزا کے نام سے مشہور تھے سوا لاکھ نقد اور چڑھاوے میں ہیرے کے کڑے سترہ جوڑی اور بیشمار جہیز ملا تھا۔ مگر افسوس انکے شوہر نواب ذکاء الدولہ عرف آغا مرزا نے شادی کے دس سال بعد ۱۲ ماہ شوال ۱۲۷۴ھ کو انتقال فرمایا۔ نواب جہان آرا بیگم ابتک بقید حیات ہیں اور ستاسی روپیہ وثیقہ پاتی ہیں انکی مصیبت کی داستان بہت طویل ہے جسکے لیئے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ نواب رفیع الشان کو گورنمنٹ نے امام باڑہ حسین آباد کا متولی بنایا۔ محمد علیشاہ کے زمانے میں انھیں چار ہزار تین سو روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ مگر غدر کے بعد ایک ہزار وثیقہ کا اور تین سو پنشن کا مقرر ہوا۔

سنتے ہیں غدر کے زمانے میں مرزا عظیم الشان اور رفیع الشان معہ اہل و عیال نواب مغل صاحبہ کے گاؤں میں گئے انھوں نے کہا کہ تمہاری جماعت کے سبب سے باغی ہمکو بھی لوٹ لینگے بہتر ہے تم کہیں اور چلے جاؤ۔ آخر مچھرہٹہ کی طرف بھاگ گئے اور وہاں پناہ لی تین مہینے کے بعد آئے ایک مکان میں چندے قیام کیا کیونکہ انکے محل نور بخش ظہور بخش پر گورنمنٹ نے قبضہ کرلیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد دلارام کی بارہ دری کرایہ پر لی اور مرزا عظیم الشان نے درگاہ کے قریب مکان لیا۔

۱۲۸۴ھ کے بعد جب نواب ذکاء الدولہ کا انتقال ہوگیا اور عدت کے بعد نواب جہان آرا بیگم اپنے والد کے یہاں تشریف لائیں اسی زمانہ میں نواب رفیع الشان مہاجن کے قرضدار تھے اسلیئے ایک لاکھ کی نالش کی تھی جس سے نواب کو بہت تشویش تھی۔ نواب جہان آرا بیگم نے کہا کہ میرا زیور بیچ کر آپ اپنا قرضہ ادا کردیں۔ انکے پاس بہت جواہرات تھے۔ کچھ انہیں سے بیچ کر قرض ادا کیا گیا۔

نواب عظیم الشان اور رفیع الشان کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے صرف آٹھویں دن مکان پر دربار کرتے تھے۔ حسین بخش انکے داروغہ تھے انھیں کی معرفت سب امور انجام پاتے تھے۔ گورنمنٹ سے صرف تیرہ سو روپیہ ملتا تھا وہ انکے خرچ کو کافی نہیں ہوتا تھا اسلیئے مہاجنوں سے قرض لینا پڑتا تھا کیونکہ کثیر الاولاد تھے اور چار ہزار روپیہ ماہوار کے خرچ کرنے والے کو اتنی سی آمدنی کیسے پوری پڑ سکتی تھی۔ حیدری بیگم اختیار محل کے نام سے مشہور تھیں۔ انکا خرچ بھی بہت زیادہ تھا اسی طرح گوہر بیگم سردار جہاں بیگم انکے علاوہ بہت سی حرمیں تھیں۔ رنگیلی۔ کریمن۔ مہتاب بخش ان حرموں کا بھی بہت خرچ تھا۔ غرض ہر وقت دلارام کی

بارہ دری بھری رہتی تھی۔ بڑی چہل پہل تھی۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس گھر میں شادی رچی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ فلک ناہنجار یہ سامان بھی نہ دیکھ سکا۔ ابھی نواب ذکاء الدولہ کے انتقال کو چار برس ہوئے تھے کہ یکم ماہ دسمبر ۱۸۸۹ء مطابق ۷ ربیع الثانی بروز یکشنبہ ۱۳۰۷ھ کو نواب رفیع الشان نے انتقال فرمایا گھر بھر میں ایک کہرام تھا کہ اودھ کی سلطنت کا چراغ گل ہو گیا۔

محلہ بالا گنج میں نواب کا قایم کیا ہوا ایک باغ تھا جسکا نام جہانگیر باغ تھا اسکے وسط میں مدفون ہوئے قبر نہایت پختہ بنی تھی اور اسپر روشنی بھی ہوتی تھی مگر وہ باغ بھی انکے ورثا نے بیچ ڈالا اور اب اسمیں کھیتی ہوتی ہے قبر کا نام و نشان بھی نہ رہا سچ ہے اللہ بس باقی ہوس، رہے نام اللہ کا

ریویو

راج ہیرلڈ اس نام کا ایک علمی و ادبی نظر فریب میگزین لکھنؤ سے مسٹر کما کھیا دت رام کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے جس کے ابتک دو نمبر نکل چکے ہیں۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انگریزی اردو ہندی نظم و نثر کے مضامین اپنے اپنے رسم الخط میں شائع ہوتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے نمبر میں سلطان المطابع (انگریزی) اردو ڈرامہ کی ارتقائی تاریخ پر ایک مجمل نظر (اردو) اور کنال (ہندی) میں شائع ہوئے ہیں جو دیکھنے کے قابل ہیں۔ مضامین عموماً تصاویر اور بلاکوں سے مزین ہوتے ہیں، پرچہ سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا جاتا ہے جس سے اڈیٹر صاحب کی قابلیت نظر آتی ہے قیمت سالانہ دس روپیہ اور فی پرچہ ایک روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ: دفتر راج ہیرلڈ لکھنؤ۔

ڈابر جنتری و کلنڈر امسال بھی کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کے کارخانہ سے ڈابر جنتری و کلنڈر شائع ہوئے ہیں کلنڈر میں سری کرشن جی اور سرادھا جی کی خوبصورت اور دیدہ زیب رنگین روغنی تصویر ہے۔ اور جنتری کی سبھی پرانی خصوصیات اس میں بھی موجود ہیں۔

سکھ سنچارک کمپنی کا کلنڈر متھرا کی مشہور سکھ سنچارک کمپنی نے بھی انگریزی و ہندی میں روغنی کلنڈر شائع کیا ہے جس میں ایک نوجوان ماں اپنے خوبصورت بچہ کو دودھ پلا رہی ہے۔ تصویر کا پس منظر دریا اور پہاڑ بھی بہت دلفریب ہے۔

اِتحاد

(از جناب فیاض الدین احمد خاں صاحب فیاض گوالیاری)

ہمالہ میں پہاڑوں کے فرازِ برفپوشی سے
گدازِ دل ہوا پیدا کسی کی گرمجوشی سے
شعاعی برچھیوں پر تل کے شانِ خود فروشی سے
نشیبوں میں چلی پگھلی ہوئی چاندی خموشی سے
چٹانوں سے جو رشتہ یخ کا کوہستان میں ٹوٹا
ہنسی فطرت کہ برسوں کا جمود اک آن میں ٹوٹا

چٹانیں ہل گئیں اک زلزلے کی شان تھی پیدا
جہاں افسردگی تھی ہو گئی واں زندگی پیدا
کشش تھی سیلِ برف و آب میں اس طرح کی پیدا
کہ ہر ذرہ کو ہمراہی کی حسرت سی ہوئی پیدا
پرانے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑا کوہ پاروں نے
نئی دُھن میں نیا رستہ لیا آفت کے ماروں نے

بہا کر لے چلا کچھ کو بچے اک تیز رو دھارا
جو تھوڑی دُور چلکر ہو گئے ٹکرا کے صد پارا
کہاں تھا اب وہ اگلی سطوت و شوکت کا نظارا
کسی کو لوٹ نے توڑا کسی کو پھوٹ نے مارا
بڑی طاقت تھے جب تھے متحد اپنوں کے پہلو میں
مگر اب تو پڑے تھے دوسری طاقت کے قابو میں

لڑھکتے سر کے بل، آپس میں ٹکراتے چلے پتھر
اُچھلتے شور کرتے۔ چیختے۔ سر پھوڑتے پتھر
نہ ٹھوکر کھا کے بھی سنبھلے۔ وہ پتھر کے رہے پتھر
رُکیں آپس میں پنچائیں، سمجھ پر پڑ گئے پتھر
بڑھے تعداد میں لیکن گھٹے وہ قدر و قیمت میں
کہ جب میدان تک پہنچے صفر تھے زور و قوت میں

وہ میٹھے جا رہے تھے ہر قدم پر پست فطرت تھے
کسی کمزور کا دل تھے کسی بیکس کی ہمت تھے
وہ مائل مختصر ہونے پہ یوں ساعت بساعت تھے
ابھی کچھ تھے ابھی کچھ بھی نہیں تھے بے حقیقت تھے
بنے پتھر سے کنکر اور کنکر سے بنے ذرّے
گھٹے ذرّے بھی پھر اتنے کہ مٹی ہو گئے ذرّے

سزا دی پھوٹ کی قدرت نے ان سرکش جتھا نونکو جنھوں نے چھوڑ کر اپنوں کو اپنا یا پرایوں کو
مٹایا یوں کہ مٹی میں ملا یا کوہ پاروں کو سبق لیکن محبت کا دیا مٹی کے ریزوں کو

کروروں آفتیں سہکر بنے جب نیک وہ ذرّے
تو بالآخر ہوئے آپس میں ملکر ایک وہ ذرّے

نہ تھیں وہ سختیاں باقی نہ شانِ انفرادی تھی زمانے نے بہت کچھ اُن کو اب نرمی سکھادی تھی
کنارے پر ندی نے ان کی تہ ایسی جمادی تھی جو تھیں بنجر زمینیں اُن پہ اک جنت بسادی تھی

محبت کی بدولت تھیں یہ زرخیزی کی شانیں اب
کہ تھیں پہلے سے بڑھکر کارآمد وہ چٹانیں اب

سبق فیاض ذرّاتِ گلی سے یہ ملا ہمکو کیا ہے تفرقوں نے گو بہت ہم سے جدا ہمکو
فلک نے پیس کر گو کر دیا ہے خاکِ پا ہمکو مگر اک متحد مرکز پہ آنا ہے ذرا ہمکو

ذرا ملجائیں تو دنیا میں کچھ کر کے دکھا دینگے
زمینِ ہند کو اک آن میں جنت بنا دیں گے

قیامت ہو جو یوں بھر ملیں اور ہم نہ مل پائیں اُفق میں فوق و تحت اکثر ملیں اور ہم نہ مل پائیں
شفق میں دونوں وقت آکر ملیں اور ہم نہ مل پائیں اندھیرے میں مہ و اختر ملیں اور ہم نہ مل پائیں

شرف ہر چیز پر اللہ نے انساں کو بخشا ہے
حقیقت ہے یہ کوئی یا فقط دعویٰ ہی دعوےٰ ہے

وہ انساں ہیں کہ اب یوں اُنس پر مائل نہونگے ہم وہ موجیں ہیں کہ اب لذت کشِ ساحل نہونگے ہم
وہ ذرّے ہیں کہ مٹتے جائیں گے یکدل نہونگے ہم ملیں گے کیا کبھی ہم جب کسی قابل نہونگے ہم؟

ملے فطرت کے ہاتھوں تو کہاں امکانِ خودداری
ہمیں خود ہوش آجائے تو ہے کچھ شانِ خودداری

ستاروں میں کشش کے ساتھ خودداری کا جوہر ہے محبت نور ہے اُن کا تو غیرت اُن کا محور ہے
ہٹیں زاید تو آفت ہو ملیں زاید تو محشر ہے نظامِ کائنات اِک جذبۂ خودداری کا مظہر ہے

نئی دھن میں ہے لیکن اُنس و اُلفت کیلئے انساں
فنا کا منتظر ہے آدمیت کے لئے انساں

ملو مٹی میں کیوں، دنیائے خار و خس میں ملجاؤ ذرا اُبھرو نمودِ غنچۂ نورس میں مل جاؤ

ضرورت متحد ہونے کی ہے آپس میں ملجاؤ　　رہوگے تاکجا تم بے بسی کے بس میں؟ ملجاؤ!
ہٹو ہٹ دھرمیوں سے توڑ پھینکو ضد کی زنجیریں
پلٹ دو عالمِ امکاں میں انسانوں کی تقدیریں
خدا فیاض کے کمزور بازو میں یہ طاقت دے　　کہ دنیا کو ہلا ڈالے وہ جب درسِ اخوت دے
زمانہ ناشناسِ قدر ہے اللہ ہمت دے　　جسے چاہے وہ عزت دے جسے چاہے وہ ذلت دے
وطن کا گنبدِ بے در کہ گم ہے سب کی یاد اسمیں
مرے نالوں سے گونجے گی صدائے اتحاد اسمیں

دردِ ہجر

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے)

میں وہ ذرہ تھا کہ کثیف تھا جو فضائے عالمِ راز میں　　تو قضا و قدر نے مل دیا مجھے خاکپائے مجاز میں
پئے مثالِ خار کھٹک رہا تھا نگاہِ آئینہ ساز میں　　کہا لفظِ کن تو گرا دیا مجھے گلستانِ مجاز میں
نہ ہے دخل محفلِ راز میں نہ بقا ہے بزمِ مجاز میں　　بڑی مشکلوں کا ہے سامنا مجھے اس نشیب و فراز میں
نہ مجھے کہیں جو جگہ ملی تری بزمِ عشوہ و ناز میں　　مرے دردِ دل نے بٹھا دیا مجھے بزمِ شوق و نیاز میں
جو ہیں حشر خیز یہ شوخیاں ترے حسنِ عشوہ طراز میں　　تو ہزار کربِ بلا بھی ہیں مرے عشقِ درد نواز میں
نہیں کچھ بھی خلد سے منتیں مرے شیخِ حد نماز میں　　ہیں ہزار عشق کی منزلیں مرے دل کی جستِ دراز میں
مجھے کیوں کیا ہے جلاوطن مری کیا خطا تھی بتاؤں کیا　　کہ جو قید لاکے یوں کر دیا ہے دیارِ دور و دراز میں
میں تھا اک قطرۂ مضطرب کہ جو اشک بن کے رواں ہوا　　مرا اضطراب نہ رکھ سکا مجھے چشمِ محفلِ راز میں
مجھے ہو وطن کا شرف عطا جو یہ اضطراب کہ ہو خودی　　غمِ حرص چھوڑ کے منقلب ہو سکون و شوق و نیاز میں
تجھے شیخ خلد کی چاہ ہے مجھے ذوقِ لطفِ نگاہ ہے
تجھے اس کا حس نہیں بوالہوس جو مزہ ہے سوز و گداز میں

زہر یا تریاق

(ترجمہ پنڈت جگن ناتھ ترکھا عابد جونیانی، بی۔اے)

ستیندر بی۔اے کا امتحان پاس کر چکا تو ایک دن اُس کی ماں نے کہا "بیٹا! لڑکی تو بہت خوبصورت ہے، گلاب کے پھول کی طرح، مگر تمہارا بھی اُسے دیکھ لینا ضروری ہے"۔

"نہیں اماں! ابھی بیاہ کی کیا جلدی ہے، مجھے تو وکالت کا امتحان پاس کرنا ہے"۔

"تو تمھیں منع کون کرتا ہے، تم کلکتہ جا کر پڑھنا، وہ میرے پاس رہیگی"۔

"فی الحال آپ رہنے دیجئے، مجھے ابھی شادی کرنا منظور نہیں"۔

"مگر بیٹا میں، تو لڑکی کی ماں کو زبان دے چکی ہوں، تمھارا فرض ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"مگر آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر زبان کیوں دیدی"۔ ستیندر نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

"بھول ہوگئی بیٹا، معاف کرو، مگر میری عزت تمھارے ہاتھ ہے، وہ بیچاری ایک بیوہ کی لڑکی ہے"۔

ماں کا غمگین چہرہ ستیندر سے دیکھا نہ گیا، گھبرا گیا، کچھ دیر بعد بولا "اچھا اماں اس کا جواب کچھ دنوں بعد دونگا" یہ کہکر وہ باہر چلا گیا۔

ستیندر ابھی بچہ ہی تھا کہ اُس کے والد کا انتقال ہوگیا، اس کی ماں بڑی سمجھدار عورت تھی، اُس نے زمینداری کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر سنبھال لیا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ ستیندر وکیل ہوجائے اسی لئے اس کا بیاہ چھوٹی عمر میں نہیں کیا گیا۔ ایک دن اُسے ایک رشتہ دار کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا گاؤں کی سبھی عورتیں اور لڑکیاں جمع تھیں، اور مرحوم اٹل بکرجی کی حسین لڑکی رادھا بھی اپنی ماں کے ساتھ موجود تھی، رادھا کا بھولا بھالا چہرہ اور اُس کے دلکش اطوار و انداز ستیندر کی ماں کو بہت پسند آئے، عرصہ سے خوبصورت بہو کی تلاش میں تھی، رادھا کو دیکھکر اُسے یقین ہوگیا کہ ستیندر اسے دیکھکر بہت خوش ہوگا اور اس کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہوجائیگا۔

اگلے دن جب ستیندر کھانا کھانے کے لئے گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھکر چونک پڑا کہ اس کی ماں کے پاس ایک ماہرو بیٹھی ہوئی ہے، وہ خاموش کھڑا رہ گیا

ؕ[1] بنگال کے مشہور افسانہ نگار جلدھر سین کے ایک دلفریب افسانہ کا لطیف ترجمہ۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا ... . کھڑے کیوں ہو"

"نہیں اماں! آج میں اپنے کمرے میں کھانا کھاؤنگا"

اس کی ماں مسکراتی ہوئی بولی "بیٹا جب اس کے ساتھ بیاہ کرنا ہے تو اس شرم وحیا کی کیا بات؟"
ستیندر نے کچھ جواب نہ دیا، خاموشی سے سر جھکائے کھانا کھانے بیٹھ گیا، ماں کسی بہانے سے باہر چلی گئی تاکہ دونوں کو آپس میں گفتگو کا موقعہ ملجائے. مگر ستیندر جلدی سے دو چار نوالے کھاکر باہر چلا گیا جہاں اس کے دوست بیٹھے ہوئے شطرنج کھیلنے کی تیاری کر رہے تھے۔

"سریش، میری طبیعت کچھ سست ہے، آج کھیل میں شریک نہ ہوسکونگا"

یہ کہکر ستیندر بستر پر لیٹ گیا۔ دوست متعجب ہوئے مگر مجبور ومعذور کھیل میں مشغول ہو گئے۔

ستیندر آنکھیں بند کئے اپنے ہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا، دوست اُسے سویا ہوا سمجھتے تھے مگر دراصل وہ جاگتا تھا، شام کے وقت دوست چلے گئے۔ ستیندر اُٹھا دل بہلانے کے لئے ایک ناول اُٹھالیا مگر اس وقت اسے پڑھنے میں اس کا دل نہ لگا، اس کے خیالات پریشان تھے، وہ کتابیں جن کے مطالعہ میں وہ دن رات مصروف نظر آتا تھا آج اُسے کاٹنے کو دوڑتی تھیں، وہ خیالات کی حسین وادیوں میں گھوم رہا تھا کہ "چھم چھم" کی آواز سے اس کا سلسلۂ خیالات درہم وبرہم ہوگیا! ایک حسین لڑکی عمدہ زیورات پہنے ہوئے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ستیندر نے اس کی طرف گھبراکر دیکھا "اماں پوچھتی ہیں، آپکا کیا خیال ہے؟"
اُس نے شیریں آواز میں کہا، آواز میں موسیقیت تھی، نے نہایت دلکشی۔

"کس کی ماں؟" اُس نے آہستہ سے کہا۔ گھبراہٹ سے اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔

"میری!" اُس نے جواب دیا۔

"کہہ دو میری ماں سے پوچھ لیں" ستیندر نے قدرے توقف سے کہا

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"رادھارانی!" اُس نے جواب دیا۔

ستیندر اسے واپس جاتے ہوئے خاموش اور بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس کے جذبات میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ رادھا کو بھولنا چاہتا تھا مگر بھول نہ سکتا تھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے... ... رادھا... رادھارانی ..." اسے چاروں طرف سے سنائی دے رہا تھا۔

دو تین دن بڑی پریشانی میں گذرے، اس کے بعد وہ سکونِ خاطر کی غرض سے کلکتہ چلا آیا۔
اس کی طبیعت میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوچکا تھا۔ اس سے پیشتر جب اسے کوئی عورت نظر آتی

تو وہ شرم سے سر جھکا لیتا تھا۔ مگر اب جب کوئی لڑکی سامنے سے گذرتی ہوئی نظر آتی تو اسے بڑے اشتیاق سے دیکھتا تھا۔

(۲)

ستیندر کو تیرنے کا بہت شوق تھا وہ جو ربگان میں رہتا تھا جو گنگا کے قریب ہے اس لئے وہ اکثر دریا ہی میں نہاتا تھا۔ پورن ماشی کے دن جب ستیندر حسب معمول نہانے گیا تو گھاٹ پر بڑا ہجوم دیکھا۔ بھیڑ کی وجہ سے اُسے کئی جگہ رُکنا پڑا، جب وہ اپنے پنڈے کی طرف (جس کے پاس وہ روزانہ کپڑے اتار کر رکھدیتا تھا) بڑھا تو اسے ایک حسن مجسم صورت دکھائی دی جس کی نظیر اس نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ ایک سولہ سالہ دوشیزہ، سیاہ دھوتی پہنے ہوئے تھی جس میں سے خوبصورتی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ اس کے ہوش اُڑ گئے۔ پانڈے نے جب ستیندر کو دیکھا تو اس حسینہ کو چھوڑ اس کے کپڑے لینے کے لئے آگے بڑھا، کیونکہ وہ اس کو اکثر دکشنا دیا کرتا تھا۔ وہ پری پیکر اس وقت ماتھے پر بیندی لگا رہی تھی، دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، ستیندر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کپڑے پنڈے کے حوالے کر کے پانی میں اُتر گیا، مگر طبیعت نہ لگی۔ تیرنا وغیرہ سب بھول گیا، منفعل واپس آیا، مگر وہ حسینہ جا چکی تھی سارا دن پریشان رہا۔ اگلے دن معمول سے پیشتر گھاٹ پر پہونچا وہ نازنین اسی جگہ بیٹھی ٹیکا لگا رہی تھی۔ اس نے ایک موثر بانظر ستیندر پر ڈالی اور ہزاروں برچھیوں سے اسے چھلنی کر دیا جس سے دن بھر اُس پر ایک وارفتگی کی حالت طاری رہی۔ سارا دن دنیا ومافیہا سے بے خبر اُسی کے خیال میں محو رہا

اس کے بعد ستیندر روز صبح سویرے نہانے جاتا، وہ گل اندام روز اُسے راستہ میں ملتی، وہ عالم محویت میں آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیتا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ چھا جاتی۔ اس حسینہ کی صورت مجسم نغمۂ آسمانی تھی، نگاہیں حسیات روح کی بے زبان ترجمان ہیں، عرصہ تک گفتگو کرتی تھیں یہاں تک کہ ستیندر شرما کر سر جھکا لیتا۔

ایک دن وہ گھاٹ سے واپس آ رہا تھا کہ اس جنت ارضی کی حور نے اُسے پکار کر کہا، "ذرا سُنیئے تو" اس کی آواز میں غیر فانی شیرینی تھی

ستیندر نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کلیجہ دھک دھک کرنے لگا، وہی نازنین اُسے بلا رہی تھی۔ ستیندر اس کی طرف بڑھا۔ کہنے لگی "بابو جی! آج میری ملازمہ نہیں آئی۔ کیا آپ مجھے میرے مکان تک پہنچانے کی مہربانی کریں گے؟"

ستیندر کچھ گھبرا سا گیا۔ سوچنے لگا کہ اگر کسی یار دوست نے دیکھ لیا تو بدنام ہو جاؤنگا۔ حسینہ عقلمند تھی، سمجھ گئی اور ہنسنے لگی، ستیندر گویا مر گیا، ایسے محبت بھرے چہرے کے لئے آدمی کیا نہیں کر سکتا، ستیندر خاموشی سے ساتھ ہو گیا۔

"میری ملازمہ آج بیمار ہے، اس لئے نہ آسکی، مجھ سے گنگا اشنان بغیر رہا نہیں جاتا اس لئے چلی آئی، آپ بھی تو گنگا اشنان کے عادی ہیں؟"

"ہاں" اس کی آواز میں قدرے تھرتھراہٹ تھی۔

"آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"چوربگان میں" ستیندر نے جواب دیا۔

"چوربگان ... چور ... میں چوڑا سانکھوں رہتی ہوں، آپ مجھے پتھریا گھاٹ پہنچا دیجئے۔ آگے میں خود چلی جاؤں گی۔"

"بہت اچھا"

تھوڑے ہی عرصہ میں دونوں پتھریا گھاٹ پر پہونچ گئے۔

"آپ کو بڑی تکلیف ہوئی، معافی کی خواستگار ہوں، میرا مکان نزدیک ہی ہے، آپ زیادہ تکلیف نہ کریں، مہربانی کا شکریہ۔"

ستیندر پلٹ آیا، اس کے دل میں خیالات چشمہ کی طرح اُبل رہے تھے، بے معنی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا گھر پہنچا، مگر دل میں بہت ہی پریشان تھا۔ اگلے دن جب ستیندر کی آنکھ کھلی تو آفتاب نکل چکا تھا، یاس اور حسرت سے ایک سرد آہ بھری، اُسے ایسا محسوس ہوا گویا وکالت کے امتحان میں فیل ہو گیا ہے، نوکر پر بہت غصہ آیا کہ کمبخت نے جگا کیوں نہیں دیا۔ کپڑے تبدیل کئے بغیر گاڑی لیکر بصد حسرت و یاس گھاٹ کی طرف چلا۔ دل میں ایک تڑپ تھی، آنکھوں سے حسرت ٹپکتی تھی، مگر گھاٹ پر پہونچکر اُس کی اُداسی دُور ہو گئی، اُس نے دیکھا کہ حسینہ کھڑی ہوئی اسکا انتظار کر رہی ہے۔ ایک شیریں سُریلی آواز سے جو سراسر موسیقی تھی کہنے لگی۔

"مہاشے، میں تو عرصہ سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں، آج بھی میری ملازمہ نہیں آئی۔"

"ابھی آیا، تھوڑا سا انتظار کیجئے" یہ کہکر ستیندر کپڑے اُتار کر دریا میں کود پڑا، مگر تیرنا کسے یاد تھا، جلدی ہی باہر نکل آیا۔ کپڑے پہنے اور اِدھر اُدھر گاڑی کو دیکھنے لگا۔

"گاڑی کہاں چلی گئی"؟ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے واپس بھیجدی" حسینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور کرایہ؟"

"میں نے دیدیا"

"کیوں؟"

"یہ بھی کوئی گناہ ہے؟"

یہ کہکر اُس نے ستیندر کی طرف نگاہ غلط انداز سے دیکھا۔ ستیندر کی دنیائے جذبات میں ہلچل مچگئی، وہ سوچنا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔

"آپ کہاں رہتے ہیں۔ چوربگان میں!"

"جی ہاں!"

"کیا وہاں صرف چور ہی رہتے ہیں؟"

"کیا!"

"میرا مطلب ہے آپ چوروں کے سردار ہیں" یہ کہکر اُس نے ایک خاص انداز سے مسکراکر دیکھا کہ ستیندر پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ جب وہ چوک کے نزدیک پہونچے تو ستیندر نے آہستہ سے کہا "گاڑی کا کرایہ"

"وہ تو آپ ہی دے چکے ہیں" اُس ماہرو نے کہا۔

"کب؟"

"میرے پاس بھی جو کچھ ہے آپ ہی کا ہے، اس لئے جو کچھ میں نے دیا گویا آپ ہی نے دیا"

دونوں کی روحیں ایک بہم شوق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں، ستیندر کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ جذبات کی فضاؤں میں اُڑا جا رہا ہے۔ اُس پر عالمِ بیخودی طاری ہوگیا۔ اُس کی رگوں کا خون جوانی کے گیت گا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس نازک بدن کے گورے گورے پاؤں پر سر جھکا دے مگر سوچتا تھا کہ لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ حسرت سے آہ بھرتا ہوا واپس ہوا، اودھر اُس برق وش کی ملازمہ نے آکر کہا "کیوں مالدار ہے نا، کچھ ٹکے بھی پلے پڑیں گے یا نہیں، خوب ناچ نچا رہی ہو"

حسینہ مسکرا دی، کہنے لگی "یہ تو ایشور ہی جانے مگر ایسے بھولے بھالے نوجوان سے دلگی کرنے میں بڑا مزا آتا ہے"۔

مگر اس بات سے تو آپ انکار نہ کرینگی کہ بے بڑا خوبصورت، کیسے مدھ بھرے نین تھے آپ اُس کے پاس کھڑی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ کنول کے دو پھول کھلے ہوئے ہیں"۔

"چل باتیں نہ بنا، تجھے پسند ہے تو تو ہی لے لے"۔ حسینہ نے ہنسکر کہا۔

"جو چاہے کہہ لیجئے مگر اتنا یاد رکھئے کہ اسے جیتے جی نہ چھوڑ سکو گی"۔ ملازمہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

جب ستیندر گھر پہونچا تو کایا پلٹ چکی تھی، اب وہ پہلے کا ستیندر نہ تھا، آتے ہی ٹینی سن ملٹن اور بائرن کی نظموں کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا، ہر چیز سے اُسے محبت بھرے نغموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اپنے پاس انگیز جذبات و کیفیات کی رقیق اور مؤثر زبان میں تصویر کھینچنا ہی اُس کا مشغلہ ہو گیا۔

دو تین دن بعد باتوں ہی باتوں میں اِس حسینہ نے ستیندر سے کہا "آپ کہیں پڑھتے ہیں یا ....."

"ہاں مجھے اسسال وکالت کا امتحان دینا ہے... آپ کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی لکھ پڑھ سکتی ہیں"۔

"ہاں میں بنگالی پڑھ سکتی ...... چلیئے آپ کو اپنا کتب خانہ دکھاؤں"۔

"کیا؟ ... مجھے آپ کے گھر چلنا ہوگا"۔

"ہاں اس میں ہرج ہی کیا ہے"

ستیندر کا سر چکرانے لگا "نہیں"

"نہیں کیا، آپ کو ضرور چلنا ہوگا"۔

"آج نہیں، پھر کبھی سہی"۔ اُس کے پاؤں کانپ رہے تھے، اس کے جذبات کی کشتی کسی بحر ناپیدا کنار کی خوفناک لہروں میں ہچکولے کھا رہی تھی۔

(۳)

چار پانچ دن گذر گئے۔ ایک دن صبح کے وقت ستیندر دریا سے واپس آرہا تھا اسکی آنکھوں میں پاس آنسو بہا رہی تھی، خیالات کی دنیا میں ابتری پھیلی ہوئی تھی، دم گھٹ رہا تھا، چہرہ زرد ہو گیا تھا، بات یہ تھی کہ چار پانچ روز سے اُس ماہرو کو نہ دیکھا تھا، نہ معلوم اُسے کیا ہو گیا، وہ گھبرا رہا تھا، کیونکہ وہ نہ تو اُس کے نام ہی سے واقف تھا اور نہ مکان سے۔ اگر

اگر مکان سے واقف ہوتا تو پھر کیا غم تھا۔ ستیندر کو اس سے عشق ہو گیا تھا، ظاہری نہیں باطنی عشق۔

"بابو جی" ستیندر نے نگاہ اُٹھائی تو سامنے اس عورت کو دیکھا جو کہ عموماً اس حسینہ کے ساتھ دریا نہانے آیا کرتی تھی، دوڑ کر اس کے پاس گیا اور بیتابی سے پوچھا کہ آج وہ کیوں نہیں آئیں، کیا بات ہے۔ رقت جذبات سے اسکا گلا بھر آیا۔ ملازمہ نے بڑی مشکل سے ہنسی روک کر کہا، "انھیں کئی روز سے بخار آ رہا ہے، آپ سے ملنے کو بیتاب ہیں"۔

ستیندر خاموشی سے ساتھ ہو گیا اور جلد ہی اس کے مکان پر پہونچ گیا، یہ ایک عالیشان مکان تھا۔" مگر کیا میرے جانے سے اُن کے پتا خفا نہ ہونگے"؟

"اُن کے والد کو فوت ہوئے عرصہ ہو گیا ہے، صرف والدہ ہیں وہ آپ سے ملکر بہت محظوظ ہونگی"

ستیندر مکان میں داخل ہوا، دیکھا کہ مکان نہایت وسیع اور آراستہ ہے۔" اس کمرے کے اندر تشریف لے چلیئے" ملازمہ نے کہا۔ کمرے سے طبلہ اور ہارمونیم کی آواز آ رہی تھی۔

"لے آئی ہوں بہن ... آپ کے ..." ملازمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

ستیندر نے جو کچھ دیکھا اُس پر یقین نہ ہوا، اُس نے سمجھا کہ کوئی وحشتناک خواب دیکھ رہا ہوں، ایک آدمی ہارمونیم بجا رہا تھا، دوسرے کے ہاتھ میں طبلہ تھا، تیسرا نشہ مے سے مخمور تھا، اور اُس کی محبوبہ رقص کر رہی تھی، اُس کی آنکھیں میگوں تھیں۔ ستیندر کو دیکھکر زور سے قہقہہ لگایا ستیندر ایک ننھے بچے کی طرح کانپ اُٹھا، دروازے کی طرف پلٹنے کو تھا کہ حسینہ نے آگے بڑھکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔" مہاشہ! ناز و ادا جانے دو ... آؤ بیٹھو" اس پری پیکر کے ہاتھ پکڑتے ہی ستیندر کو محسوس ہوا کہ دوزخ کی آگ اُسے جلا رہی ہے۔ "مَیں چندا ہوں ..... سمجھے"۔ سب ہنستے ہوئے زمین پر لوٹنے لگے۔ اس نے زبردستی ستیندر کو کرسی پر بٹھا دیا اور خود رقص کرنے لگی۔ کیسا دلفریب لوچدار رقص تھا، اس شعلۂ بیقرار نے ایک کیفیت برپا کر دی۔ وہ گانے لگی، ایک کیف آور نغمہ جس میں لطیف جذبات رقصاں نظر آ رہے تھے۔

"مہاشے! میں بڑا گناہگار ہوں، .... اپنے پاؤں کی خاک دیجئے تاکہ میرے گناہ دُور ہو سکیں"۔ شراب پیتے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

"جانے دو یار، کیوں تنگ کرتے ہو" ہارمونیم بجانے والے نے کہا۔

"ہنسی مذاق کے لئے تو بلایا ہی ہے.... مہاشے یہ تو بتلایئے آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا تھا

روزانہ گنگا نہاتی تھی، اِس سے یہ تو آپ سمجھ گئے ہونگے کہ میں کوئی برہم سماجی، عیسائی یا مسلمان نہیں ہوں، پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندو لڑکی اتنی عمر تک کنواری نہیں رہ سکتی۔ آپ نے کیا سمجھکر آنکھیں ملانی شروع کی تھیں، کیا اسی لئے کہ ایک دن مجھے لے بھاگو گے۔ ۔ ۔"

سب ہنسنے لگے ۔ چندا چونک کر بولی "ارے میں بڑی پگلی ہوں ۔ ۔ بابو جی ہمارے مہمان ہیں، انھوں نے ابھی کچھ کھایا نہیں، سورن جا کے ان کے کھانے کے لئے کچھ لے آؤ۔"

تھوڑی دیر میں ملازمہ ایک مٹھائی کی پلیٹ لے آئی۔ چندا نے پلیٹ لے لی اور گھٹنے ٹیک کر زمین پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی "میں آج اپنے ہاتھ سے آپ کو مٹھائی کھلاؤنگی۔"

"نہیں چندا میں نہیں کھاؤنگا۔"

"کیوں؟ میں ڈوم چمار تھوڑا ہی ہوں جو نہ کھاؤ گے"

"تم بھولتی ہو، اگر تم چمار ہوتیں تو شاید میں کھا لیتا۔ تم جو کچھ ہو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"ہوں! اب بھوندو ناتھ ہمیں طعنہ دینے لگے ۔ ۔ ۔"

"میرا نام بھوندو ناتھ نہیں ستیندر ہے۔ میں طعنے دینا نہیں جانتا مگر اپنی غلطی کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو کیا میرے ہاتھ سے مٹھائی نہ کھاؤ گے"؟

"نہیں!" ستیندر نے جواب دیا۔

"تمھیں کھانا ہی ہوگا ۔ ۔ آج نہ سہی کل، مگر آخر تمھیں شکست ماننا ہی پڑیگی۔"

"بھولی ہو چندا، انسان سے غلطی ہو جاتی ہے، مجھ سے بھی واقعی غلطی ہو گئی، مگر تمھارا خیال غلط ہے، آج کل کا تو ذکر ہی کیا میں زندگی بھر تمھارے ہاتھ کی چھوئی ہوئی کوئی چیز نہ کھاؤنگا مجھے جانے دو ۔ ۔ ۔ ۔ تمھاری باتیں جہنم کی جلتی ہوئی سانسیں ہیں ۔ ۔ تمھاری شعلہ نما زبان مجھے زندہ چھوڑے گی ۔ ۔ ۔ ۔ میرا دم گھٹ رہا ہے ۔ ۔ ۔ ہوا میں لرزہ سا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کمرہ گھومتا دکھائی دیتا ہے۔

"کیوں روکتی ہو بائی جی، جس شخص کا دل نہیں، دل میں جذبات نہیں، جذبات پر شباب نہیں اُس کی یہاں کیا ضرورت ہے۔ تمھارے حُسن کے نورانی جلوہ کو یہ اندھا کیا سمجھ سکتا ہے۔" ایک نے کہا

"نہیں نہیں ذرا بیٹھ جائیے" چندا نے محبت بھری آواز سے کہا جس میں دلی خلوص جھلک رہا تھا

"جانے دو بائی جی ورنہ یہ پاجی اسر ہو جائیگا۔"

ستیندر آہ بھر کر باہر نکل آیا، چندا نے باہر آکر راستہ روک لیا اور کہا "میں خطاوار ہوں

مجھے معاف کر دو۔ تمھارے پاؤں پڑتی ہوں منت کرتی ہوں"۔

ستیندر خاموش رہا۔

"کہہ دو معاف کیا ..."

وہ بغیر جواب دیے سیڑھیوں سے اُترنے لگا۔

"کل آؤ گے؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیا اب پھر ملاقات نہ ہوگی؟"

"نہیں"

چندا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آواز رقت سے بھر آئی" مجھے اعتبار نہیں کہ آپ پھر نہ ملیں گے، لیکن اگر نہ ملے تو میری بات پر یقین کرو گے۔"

اس کی آواز میں درد تھا، سوز تھا" ستیندر نے چونک کر پیچھے دیکھا، مگر اسے بھی دھوکا تصور کیا

"کس بات پر یقین" ستیندر نے کہا۔

چندا نے سر اُٹھایا، آنکھیں آنکھوں اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا آواز رقت سے بھرائی ہوئی تھی، اُس نے بولنے کی کوشش کی مگر زبان سے لفظ ہی نہ نکل سکے۔ ستیندر نے اسے بھی ایک ادا خیال کیا، کیونکہ وہ ویشیا[1] تھی۔

"میں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا" ستیندر نے جھلا کر کہا۔

"اچھا چلے جاؤ۔ میں واقعی گناہگار ہوں مگر اس کے باوجود جو کچھ کہتی ہوں سچ ہے، اس پر شک کر کے تم بھی گناہگار نہ بنو، ایشور سب میں موجود ہے، ہر ایک دیوتا کی پوجا نہیں کیجا سکتی مگر اس کے دیوتا ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا، ان کی پوجا نہ کی جائے تو نقصان نہیں مگر انھیں حقارت سے دیکھنا اور بھلا بُرا کہنا مناسب نہیں۔"

اِن الفاظ کا ستیندر پر بہت اثر ہوا، پھر بھی وہ سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ باہر چلا گیا۔

چندا آخر عورت تھی، عورت کی فطرت کا تبدیل ہونا مشکل ہے۔ اگرچہ وہ بارہا گناہ کر چکی تھی پھر بھی

---

[1] طوائف۔

اُس کا دل ایک عورت کا دل تھا، جب وہ واپس آئی تو اُس کی طبیعت میں انقلاب عظیم ہو چکا تھا اُس کی کیف آور آنکھوں سے چمک غائب ہو چکی تھی، آنسوؤں کے چند قطرے رخساروں پر کھیل رہے تھے۔

"بی صاحبہ آپ رو رہی ہیں!" ایک شرابی نے چونک کر کہا۔

چندا نے کوئی جواب نہ دیا، بیٹھ گئی، اتنے میں اس کی نگاہ پاؤں کے گھنگھروؤں پر پڑی اُسے محسوس ہوا گویا دو زہریلے سانپ حلقہ باندھے ہوئے ہیں، انھیں کھولکر پھینک دیا۔

بائی جی! یہ کس لئے اُتار دیے"، شرابی نے کہا۔

"بائی جی!...... تمھاری بائی جی کی موت ہو گئی" چندا نے کہا۔

"ہیں، کس بیماری سے!" طبلہ بجانے والے نے پوچھا

"اسی بیماری سے جس سے سورج نکلتے ہی رات مر جاتی ہے، تمھاری بائی جی ہمیشہ کیلئے مرگئی۔"

(۴)

چار سال گذر گئے ستیندر کے لڑکے کا انّ پراشن (بچے کو پہلی دفعہ اناج کھلانے کی رسم) سنسکار تھا، شام کے وقت رقص و سرود کی محفل جمی، چار رنڈیاں بلائی گئیں، چک کے اندر رادھا رانی بیٹھی ہوئی تماشہ دیکھ رہی تھی، اتنے میں ستیندر بابو داخل ہوئے۔

"کیا دیکھ رہی ہو رادھا!"

"جن کو سب دیکھ رہے ہیں، اُنھیں کو میں بھی دیکھ رہی ہوں، مگر آپ کیسے آگئے۔"

"اس لئے کہ تم اکیلی بیٹھی اُداس نہ ہو جاؤ۔"

"جھوٹ"

"نہیں میں سچ کہتا ہوں... یہ تو بتاؤ اِن سب میں سے تمھیں کون سی پسند ہے؟"

"وہ دیکھئے" رادھا نے سب سے پیچھے بیٹھی ہوئی ایک نگین رنڈی کی طرف اشارہ کر کے کہا

"لیکن وہ تو بالکل مردہ سی ہے۔"

"کچھ بیمار معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے حسین ہونے میں شک نہیں، معلوم ہوتا ہے بہت غریب ہے"

"ہوں، تمھیں پتہ بھی ہے اس کے گانے کی فیس کیا ہے؟"

"نہیں" رادھا نے کہا۔

"اِن دو کی جو سب سے آگے بیٹھی ہیں تیس تیس روپیہ، وہ جو دھانی رنگ کی ساڑھی پہنے

ہوئے ہے پچیس روپیہ پر آئی ہے، اور تمھاری غریب دو سو روپیہ پر"

"دو سو روپیہ! کیا بہت عمدہ گاتی ہے؟"

"کبھی سُنا نہیں، مگر لوگ کہتے ہیں کہ آج سے چار پانچ برس پہلے اس کی آواز میں غضب کی موسیقیت تھی، اس کا گلا رسیلا، تانیں دلپذیر اور کیف آور، اب کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تو اتنا روپیہ فضول دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کم پر راضی نہ ہوتی تھی، سو سو منت خوشامد کرکے بلایا ہے۔"

رادھا، (حیران ہوکر) "خوب اتنا روپیہ بھی دینا اور منت بھی کرنا، مگر یہ کس لئے!"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اب پیشہ ترک کر دیا ہے، اور فیس زیادہ کرنے کا یہی مقصد ہے کہ کوئی بُلا نہ سکے، دوسری وجہ میری ذاتی غرض ہے۔"

"آپ کی غرض کیا خاک ہے: .. بھلا یہ تو بتائیں کہ اس نے اپنا پیشہ کیوں ترک کیا؟"

"بڑا دلچسپ اور حسرت انگیز واقعہ ہے، سنوگی؟"

"ہاں ضرور سنونگی، کہئے!"

ستیندر ناتھ نے سارا واقعہ بیان کہدیا، رادھا رانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، آہ بھر کر کہا

"تو کیا انتقام لینے کے لئے اسے یہاں بُلایا ہے ...... وہ تو آگے ہی مُردہ ہے اس پر بھی آپکی تسلی نہیں ہوئی"

ستیندر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، آہستہ سے بولا "رتی! یہ واقعی انتقام ہے، مگر اسے ہم تینوں کے سوا اور کون جانتا ہے ......"

تھوڑے ہی عرصہ میں مہمان آپہونچے، رنڈیاں تیار ہوگئیں، مگر چندا اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی وہ خاموش بیٹھی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی کہ پیچھے سے کسی لڑکے نے کہا:

"آپ کو ماں جی بلا رہی ہیں"

"کسے؟" چندا نے حیران ہوکر کہا۔

"آپ کو"

"نہیں نہیں، کسی اور کو بلایا ہوگا، جا کے نام پوچھ آؤ" چندا نے قدرے حیرت سے کہا۔

"کیا آپ کا نام چندا بائی نہیں ہے؟"

"ہے تو!"

"تو چلیئے"

چندا نے گھنگھرو کھول دیئے، اور آہستہ آہستہ لڑکے کے ساتھ چل دی، رادھا رانی نے آگے بڑھکر ہاتھ پکڑ لیا اور کرسی پر بٹھا دیا.... چندا کانپ رہی تھی۔

"بہن مجھے پہچانتی ہو" رادھا رانی نے کہا۔

چندا کچھ گھبرا سی گئی۔

"اچھا تو اسے بھی نہیں جانتیں؟" رادھا نے لڑکے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ چندا خاموش تھی آہستہ آہستہ تمام گذشتہ واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے، غور سے لڑکے کی طرف دیکھنے لگی اور بچے کو دیوانہ وار چومنے لگی، اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"کہو پہچانا؟"

"ہاں بہن پہچان لیا!"

"سمندر بلو کر جو زہر نکلا وہ تُو نے لے لیا، اور امرت اس چھوٹی بہن کو دیدیا، وہ عورتوں سے نفرت کرتے تھے، تم نے انھیں محبت کرنا سکھایا، جب انھوں نے اچھی طرح محبت کرنا سیکھ لیا تو میرے حوالے کر دیا۔"

"یہ مت کہو بہن، مَیں نقصان میں نہیں رہی۔ زہر کے لئے زہر ہی تریاق" کا کام دیتا ہے مجھ جیسی گناہگار اُن کی نفرت سے سدھر گئی۔ آج سے چار سال پہلے مَیں نے بڑے رعب سے کہا تھا کہ تم میرے پاس آؤ گے، اور میرے مکان پر آؤ گے۔ مگر... مگر بہن میرا وہ غرور چکنا چور ہوگیا، وہ بھولکر بھی ادھر نہ آئے.... میرے دل میں سوز تھا، درد تھا، محبت میں اندھی ہوکر نہ معلوم کتنی بار مَیں نے ایشور کو صلواتیں سُنائیں، مگر آج مَیں سمجھی کہ اگر وہ آجاتے تو مَیں یقیناً تباہ ہو جاتی۔ اُن کی نظر حقارت میرے لئے نگاہ کرم ثابت ہوئی" (دیوار پر سے ستیندر ناتھ کا فوٹو اُتارتے ہوئے) میں نے خیال کیا تھا کہ اگر کبھی ان سے ملاقات ہوئی تو پاؤں پر گر کر معافی مانگ لونگی، مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ پیاری بہن یہ فوٹو مجھے دیدو.... میں اور کوئی چیز نہیں چاہتی۔"

وہ رو رہی تھی، رادھا رانی کی آنکھیں بھی آبگوں تھیں، کمرے کی فضا اُداس اور مضمحل تھی درد دل نے چندا پر عجب کیفیت طاری کر دی تھی۔

"اچھا چلتی ہوں بہن" چندا نے رقت بھری آواز سے کہا۔

"پھر کب آؤ گی؟"

"اب نہ آؤنگی بہن، میرا ایک مکان ہے اُسے فروخت کرکے جلد ہی یہاں سے چلی جاؤں گی،

مگر یہ تو بتاؤ کہ اُنھوں نے اتنے عرصہ کے بعد مجھے کس لئے یاد کیا اور کس لئے اپنا نام پوشیدہ رکھا۔"

رادھا رانی نے شرم سے سر جھکالیا۔

"سمجھ گئی بہن، انتقام کے لئے۔ اِس کے سوا اصرار کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔"

رادھا رانی خاموش تھی

"وہ غلطی پر ہیں، مَیں نے عزت و بے عزتی کا خیال چھوڑ دیا ہے، اُن سے اِس ملاقات کا ذکر کردیجئے گا، یہ بھی کہہ دینا کہ چندا اُن کو ہمیشہ یاد کرتی ہے اور کرتی رہیگی، اُن کے احسان کو کبھی نہ بھول سکے گی۔ اُن کی نگاہِ حقارت مجھے زندہ کرگئی، اور مجھ گناہگار نے اب توبہ کرلی۔"

یہ کہکر چندا نے لڑکے کو بوسہ دیا، اور آہستہ آہستہ باہر چلدی۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ زمین گھوم رہی تھی، ہوائیں لرزاں، فضائیں اُداس و غمگین، چہارسو خاموشی و غم رادھا آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

کلامِ تپش

از شیخ عبد اللہ تپش ایم۔ اے

محبتِ ناتمام نے مارا — آپ کی صبح و شام نے مارا

کھُل گیا پردہ حریمِ ناز — جلوہ فرمائے بام نے مارا

رخصت اے جوشِ پختہ کاریِ عشق — شوخیِ طبعِ خام نے مارا

شکوۂ چشمِ بے خمار عبث — تہی دستیِ جام نے مارا

نہ گیا ذوقِ بندگی نہ گیا — آرزوئے سلام نے مارا

قیس و فرہاد سے خدا سمجھے — پختہ کارانِ خام نے مارا

سجدۂ قسمت آزما کب تک — نقشِ پا کے قیام نے مارا

گردشِ روزگار بالکل جھوٹ — آپ کی صبح و شام نے مارا

تشنہ لب میکدے سے آئے تپش
تہی دستیِ جام نے مارا

ترانہ[1]

اس نام سے مرزا یاس عظیم آبادی کی دو سو چھ رُباعیوں کا ایک دلچسپ مجموعہ شائع ہوا ہے، اکثر رباعیاں ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں، اس مجموعہ کی لکھائی چھپائی جلد وغیرہ سب قابل قدر اور دیدہ زیب ہے۔ شروع میں قابل مصنف کا فوٹو اور اُن کے قلم کا ایک تعلّی نامہ بھی ہے۔

مرزا یاس عظیم آبادی اُردو کے خوش فکر اور صاحبِ طبع رسا شاعروں میں ہیں اور مدت سے بزمِ سخن میں دادِ سخنوری و سخن فہمی دے رہے ہیں۔ مگر اپنی ذاتِ خاص کے متعلق ان کے جو خیالات ہیں اس کی بدولت اُن کی ہمعصر شعرا سے اکثر کھٹ پٹ رہتی ہے۔ معاصرین درکنار وہ قدیم اساتذہ کو بھی اپنے برابر نہیں سمجھتے ہیں، خصوصاً غالب کے سخت مخالف ہیں۔

مرزا صاحب اپنے وطن عظیم آباد میں "یاس عظیم آبادی" تھے۔ مگر جب لکھنؤ میں شادی ہوگئی اور یہاں رہنے لگے تو آپ "عظیم آبادی" کے بجائے "لکھنوی" ہوگئے۔ لکھنؤ کے قریب قریب تمام شعراء سے آپ کی اَن بَن رہی، آخر آپ لکھنؤ چھوڑ کر پنجاب تشریف لے گئے جہاں پہلے اپنا نام "مرزا یاس یگانہ" لکھنے لگے، لیکن کچھ دنوں بعد "یاس" کو خیرباد کہہ کر صرف "یگانہ" رہ گئے۔ اور دہلی کی زبان کے اس قدر معتقد ہوئے کہ لکھنؤ والوں کو بُرا کہنے لگے چنانچہ ایک رُباعی میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

دلّی کی زبان لکھنؤ کیا جانے ۔ میر و مرزا کی گفتگو کیا جانے
دل درد سے خالی ہو تو بکواس فضول ۔ خاموش، زبانِ عشق تو کیا جانے

اب آجکل آپ ریاست حیدرآباد میں سب رجسٹرار ہیں، اور اپنے نام میں ایک طرۂ امتیاز کا اور اضافہ کر لیا ہے یعنی "مرزا یگانہ چنگیزی" ہو گئے ہیں۔

آپ کی شاعرانہ تعلّی کی یہ کیفیت ہے کہ عظیم آباد سے لکھنؤ تشریف لائے تو لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کے حال پر یہ احسان فرمایا ؎

---

[1] پاکٹ سائز پر اُردو بک اسٹال لاہور نے شائع کیا ہے۔ قیمت ۱۲؍ مجلد۔

یارانِ چمن یہ رنگ و بُو مجھ سے ہے　　تم سے کیا ہوگا لکھنؤ مجھ سے ہے
میں جانِ سخن ہوں بلکہ ایمانِ سخن　　دنیائے ادب کی آبرو مجھ سے ہے

تعلّی کی ایک اور مثال مُلاحظہ ہو، لکھتے ہیں ؎

اقلیم سخن نام مرا جپتا ہے　　کیوں لکھنؤ اپنے بھاڑ میں تپتا ہے
تصویر یگانہ آپ بول اُٹھے گی　　ہاں ایسے ہی منہ پہ بانکپن کھپتا ہے

لکھنؤ والوں کو اِس رُباعی میں لفظ "اقلیم" کھٹکے گا جسے مرزا صاحب نے مذکر باندھا ہے حالانکہ وہ مؤنث ہے۔ ملاحظہ ہو فرہنگ آصفیہ لفظ اقلیم۔

مرزا صاحب اپنے مذہبی معتقدات کے اعتراف و اظہار میں بھی سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔
ہم کہہ چکے ہیں کہ ہمارے دوست یگانہ صاحب کو مرزا غالب سے خاص نفرت ہے، چنانچہ غالب کی شان میں فرماتے ہیں ؎

اُستاد یگانہ بے گرُے کیوں ہوتے　　آپ اپنی نگاہوں میں بُرے کیوں ہوتے
اُستادِ ازل کے ہیں جو شاگرد رشید　　غالب کی طرح بے سُرے کیوں ہوتے

غالب پر آپ نے ہر ممکن الزام لگایا ہے اور کمالِ فن پر خاک ڈالنے کے علاوہ کیرکٹر پر بھی حملہ کیا ہے اور اِن حملوں میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ مثلاً غالب پر سرقۂ مضامین کا الزام عائد کیا ہے اور خود کو غالب سے بہت بڑھ چڑھ کر بتایا ہے۔ اِس سلسلے میں آپ نے جس دریدہ دہنی سے کام لیا ہے اُس کی نقل کر کے ہم رسالہ کے صفحات خراب کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔
بایں ہمہ مرزا یگانہ چنگیزی ایک پختہ مشق اور پُرگو شاعر ہیں۔ آپ کے یہاں الفاظ کی روانی، ترکیبوں کی چُستی اور محاورات کی برجستگی قابلِ تحسین ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات آپ کے خیال کی رفعت بھی قابلِ تعریف ہوتی ہے۔ چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

(۱)

یوسف کو اس انجمن میں کیا ڈھونڈھتا ہے　　ہنگامۂ ما و من میں کیا ڈھونڈھتا ہے
نیرنگِ تماشا ہے حجابِ معنی　　تصویر کے پیرہن میں کیا ڈھونڈھتا ہے

(۲)

کیوں مطلبِ ہستی و عدم کھل جاتا　　کیوں رازِ طلسمِ کیف و کم کھل جاتا
کانوں نے جو سُن لیا وہی کیا کم ہے　　آنکھیں کھُلتیں تو سب بھرم کھل جاتا

اس مجموعے کی ترتیب میں یہ خوبی رکھی گئی ہے کہ ہر صفحہ ایک رباعی کے لئے وقف ہے رباعی کی سرخی دیکر اصل رباعی تحریر ہے، اور اگر کوئی لفظ تشریح طلب آگیا ہے تو حاشیہ پر اسکی وضاحت کردی گئی ہے۔ اگر مجموعہ میں سے قابل اعتراض رباعیات خارج کردی جائیں تو بھی اس میں ادبی و معنوی دلچسپیوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ قیمت سوا روپیہ۔

موتی[1]

امام صاحب مسجد جامع دہلی کے فرزند رشید سید یوسف دہلوی نے مشرق و مغرب کے عالموں و رہنماؤں کے مقولے مختلف عنوانوں کے ماتحت اس کتاب میں جمع کر دیے ہیں۔ شروع میں اختر انصاری بی اے مصنف "نغمۂ روح" کا ایک مختصر تعارف نامہ اور مولانا راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کے تبصرے ہیں، جس کے بعد خود فاضل مؤلف کا لکھا ہوا ایک مقدمہ ہے جس میں اقوال کے فلسفہ، اُن کی اہمیت اور ضرورت پر بحث کی گئی ہے، اور ضمناً ہر ملک کے اقوال کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ واقعی نہایت دلچسپ ہے۔ جس تلاش و محنت سے انگریزی، فارسی، عربی، اردو، ہندی زبانوں کے اقوال اس چھوٹی سی کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں وہ قابل قدر ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ اچھا ہے۔

افسانہائے عشق[2]

یہ سات مختلف فسانوں کا مجموعہ ہے جنھیں حامد علی خاں صاحب جائنٹ ایڈیٹر "ہمایوں" لاہور نے دیگر زبانوں سے ترجمہ کرکے شائع کیا ہے۔ ان میں "شاعر کی شکست" "پوسٹ ماسٹر اور جوگن" ڈاکٹر ٹیگور کے افسانے ہیں۔ ساتوں فسانے یاس و حرماں میں ڈوبے ہوئے ہیں شروع میں "کیوپڈ اور سائیکی" اور "افسانہ خواں" کی دو تصویریں بھی زیب کتاب ہیں۔ ابتدا میں منصور احمد صاحب اڈیٹر ادبی دنیا لاہور کا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے۔ جیبی سائز لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، ضخامت ۱۸۲ صفحات۔

جامع اللغات[3]

یہ اردو، ہندی، عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی اور یونانی زبانوں کے تقریباً پچاس ہزار الفاظ کی مختصر ڈکشنری ہے جسے مولوی محمد رفیع اور مولانا محمد وکیع صدیقی ایم۔ اے نے کمال

---

[1] قیمت بارہ آنہ، ملنے کا پتہ: سید محمد بخاری گلی امام جامع مسجد دہلی۔

[2] مجلد قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ: دفتر ہمایوں لاہور۔

[3] ملنے کا پتہ: رائے صاحب رام دیال اگروالا الہ آباد۔ قیمت ایک روپیہ۔

محنت و جانفشانی سے جمع کیا ہے، طلبائے مدارس کے لئے یہ ڈکشنری بہت مفید ہوگی۔ کتاب مجلد ہے اور جیبی سائز کے ۰۰،۸ صفحات پر ختم ہوئی ہے ہم طلبائے مدارس سے اس ڈکشنری کی سفارش کرتے ہیں۔ اگر الفاظ کی تذکیر و تانیث بھی واضح کر دیگئی ہوتی تو بڑی ضرورت رفع ہو جاتی۔

درِ مضامین حصہ دوم[1]

مولوی جان محمد آزہر صاحب نے اس کتاب کو مڈل اور ہائی اسکول کے طلبا کی نفع رسانی کی غرض سے لکھا ہے۔ اس میں فن خطوط نویسی اور انشا پردازی دونوں کے سہل اور کارآمد طریقے بتائے گئے ہیں اس کے ساتھ ہی ہر قسم کے نمونے بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں فسانہ نویسی پر بھی بحث کی گئی ہے اور مضمون نویسی کے لئے اکتالیس مختلف عنوانات پیش کئے ہیں۔ جگہ جگہ مشقیہ سوالات بھی درج ہیں۔

قانون مباشرت[2]

جنسی تعلقات پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں یا تو خشک اور بے لطف طبی ہدایات درج ہوتی ہیں یا قابل اعتراض حد تک عامیانہ مذاق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کتاب میں تمام باتیں شستہ پیرایے میں علمی اصول پر لکھی گئی ہے۔ اس میں نہ دوراز قیاس نظریے یا حکایتیں ہیں اور نہ ہیجان میں لانیوالی باتیں ہیں۔ تعلقات جنسی کے متعلق ضروری اور قابل عمل ہدایات بے اعتدالیوں کے نقائص اور ان کے تدارک کے طریقے درج کر دیئے گئے ہیں۔ امراض کی تشریح و تشخیص کے ساتھ مفید نسخے بھی درج کئے گئے ہیں۔ البتہ طبی اصطلاحات اور عربی فارسی ترکیبوں کے باعث کتاب کی زبان کسی قدر سخت ہو گئی ہے۔ آخر میں تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کا ایک ضمیمہ ہے جس میں مختلف قسم کے مرکب مجربات ہر مرض کے لئے درج کئے گئے ہیں اور شروع میں دو مضمون پر کپتان ایم۔ بی۔ ایچ گلھان ایم۔ ڈی۔ سرجن کی ایک تمہید ہے جس میں اس کتاب کی خوبیوں کا ذکر ہے۔

---

[1] مرتبہ مولوی جان محمد صاحب آزہر ہیڈ ٹیچر کرائسٹ چرچ ہائی اسکول کانپور حجم ۲۴۸ صفحات، قیمت آٹھ آنے ۸ر

[2] مؤلفہ ڈاکٹر فضل مبین صاحب دہلوی ایچ۔ ایم۔ ڈی۔ لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ معمولی، تقطیع $\frac{22\times18}{8}$ ۴۰۰ صفحات قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ: دفتر معارف طبیہ، رودگراں دہلی۔

لطفِ سخن

(از خاں صاحب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی اے)

دلِ خراب ستم آرمیدہ ہوتا تھا | کہ میری جان کو تیغ کشیدہ ہوتا تھا؟
حیائے عشق یہ کہتی ہی پھر نہ بہتے اشک | جو شمعِ بزم کو گردن کشیدہ ہوتا تھا
یہ کیا کہ خوں ہوا دل اور آنکھ سے ٹپکا | جواب طائرِ رنگ پریدہ ہوتا تھا
دل کلیم کہ تھا اضطراب کا شعلہ | کنارِ برق ہی میں آرمیدہ ہوتا تھا
یہ دُھن تو رہتی کہ سودائے خام پختہ ہو | سُبک تو مثلِ مئے نارسیدہ ہوتا تھا
فسانۂ دلِ صد چاک و بزم آرائی | شہیدِ طرزِ گُلِ نو دمیدہ ہوتا تھا
کمینِ عجز میں کیوں دستِ آرزو ہی نہاں | نگاہِ شوق اگر دام چیدہ ہوتا تھا
غزل کہی تو اثر تم نے طرزِ آتش میں | کچھ اختیار سے کیا برگزیدہ ہوتا تھا؟

(از سید اعظم حسین صاحب اعظم)

ہے کوئے بتاں اور نہ گلزارِ جناں اور | اک جلوے کا ہے روپ یہاں اور وہاں اور
افراطِ کرم چاہتا ہوں لے کرمِ خاص | مل جائیں پئے لذتِ غم کام و دہاں اور
کیا لطف ہے قربانیوں کا راہِ وفا میں | لے کاش ملے ہوتے مجھے کچھ دل و جاں اور
دل ہی میں نہ رہ جائے کہیں حسرتِ اظہار | جلدی ہے جو کہنے کی تو رُکتی ہے زباں اور
مایوس نہ ہو لے دلِ ناکام تمنا | اپنی نگہِ شوق میں ہے ایک جہاں اور
آوارہ ہی رکھنا ہے تو دیوانہ بنا دے | یوں اُٹھ کے تری بزم سے جاؤنگا کہاں اور
پیرایۂ اظہار جدا گانہ ہیں اعظم | یہ سچ ہے کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

(از جناب بیخود موہانی)

تسکین ہے وہی جو بت بے مہر و فا دے | اُٹھ جاؤں میں جس روز مجھے صبر خدا دے
صدقے ترے لے چارہ گر اب مجکو جلا دے | جینے کی دوا ہو چکی مرنے کی دوا دے
تو یہ وہ اگر چہرۂ زیبا سے اٹھا دے | جلوہ ازل وحشر کو اک ساتھ صدا دے

مٹتا ہے ابھی پرسش اعمال کا جھگڑا
سب کو نگہ ناز سے دیوانہ بنا دے

اُلجھی نگہ قہر سے بڑھکر نگہ یاس
اب جس سے بھی کچھ بن پڑے اب جسکو خدا دے

جنت میں مجھے بھیج کہ دوزخ میں مجھے ڈال
جنت کو سزا دے کہ جہنم کو جزا دے

مجکو مرے اعمال سے محجوب نہ رکھنا
اے نارِ جہنم تجھے اللہ جزا دے

جس میں شب اسریٰ ہوئیں محبوب سے باتیں
بیخود کو بھی اک دن وہی آواز سنا دے

(از جناب جگر بریلوی)

دل ہے سینے میں تو غم سے عہد و پیماں کیجئے
موت کے ارمان سے جینے کا ساماں کیجئے

اک جہاں ہو جائیگا پھر غمگسار و چارہ ساز
نشترِ غم پہلے پیوستِ رگِ جاں کیجئے

دیکھئے پھر جلوۂ رنگینیِ حسن و جمال
دل کے ارمانوں کو پہلے نذرِ سوزِ پنہاں کیجئے

کائناتِ زندگی ہم سونپتے ہیں آپ کو
اب اسے ویرانہ کیجئے یا گلستاں کیجئے

عاشقی بدعت طلب دار و رسن رسمِ قدیم
کیا کہیں کیونکہ سرو گردن پہ احساں کیجئے

خرمن جان و جگر ہے آرزومند فروغ
بے محابا اِک نگاہِ برق ساماں کیجئے

حق محبت کا ادا کرنا جگر آساں نہیں
دیجئے دل میں شگاف اور سب کو خنداں کیجئے

(از حضرت دل شاہجہانپوری)

لے جنوں راحت اثر دل کی پریشانی نہ تھی
ہم نے جب تک خاک کوئے یار کی چھانی نہ تھی

یاد آیا ہے جب اشکوں کی فراوانی نہ تھی
قطعہ
عشق کے انجام پر یہ مرثیہ خوانی نہ تھی

دشتِ وحشت میں خلافِ وضع عریانی نہ تھی
ورنہ رسوائی کسی کی چاک دامانی نہ تھی

ضبطِ گریہ اک مصیبت ہو گیا دل کے لئے
یہ تو اُس دریا میں ڈوبا جس میں طغیانی نہ تھی

ہر قدم پر نارسائی کا گلہ بڑھتا گیا
حدِ آخر تک مری منزل میں آسانی نہ تھی

چارہ گر اب غور کر کیا حاصلِ درماں ہوا
کاوشِ دل میں تو یہ تکلیفِ روحانی نہ تھی

ہمت افزا تھا کوئی گو مشکلیں بڑھتی گئیں
عشق کو ناکامیِ دل پر پریشانی نہ تھی

تھا تقاضائے محبت جو ہوا انجامِ دل
کیا مرے پیشِ نظر یہ خانہ ویرانی نہ تھی

تجکو لے ڈوبا ہے اے دل پھر ابھرنے کا خیال
ورنہ بحرِ عشق کی تہ میں یہ طغیانی نہ تھی

بس یہ ہے میری نظر میں روح و تن کا تفرقہ
پھر وہاں پہنچی جہاں کی زندگی فانی نہ تھی

یہ نتیجہ عشق کا ہے اے دلِ شوریدہ سر
اس قدر ہوش آفریں پہلے غزلخوانی نہ تھی

(ایڈیٹوریل سیکشن)

رفتارِ زمانہ

علاقہ سآر کا استصوابِ رائے

اس ماہ کا اہم ترین واقعہ جرمنی کے علاقہ سار کے آئندہ نظم ونسق کے متعلق اس کے باشندگان کا استصوابِ رائے ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی ملک کی حکومت کے متعلق ایسے باضابطہ طور پر اس کے باشندوں کی رائے دریافت کی گئی ہو۔ اس لئے اس کے متعلق مفصل حالات کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مگر سب سے پہلے اس علاقہ کی مختصر تاریخ بھی بتا دینا چاہیئے۔

یہ علاقہ فرانس کے صوبجات السَاس و لورین سے ملا ہوا جرمنی کا چھوٹا سا رقبہ ہے جو دریائے سار کے گردو پیش واقع ہونے کی وجہ سے وادیِ سار یا صرف سار کہلاتا ہے۔ پچھلے چند مہینوں سے اس کے متعلق برطانیہ۔ فرانس۔ اٹلی اور جرمنی کو سخت پریشانی تھی اور ہر وقت آتشِ جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھنے کا خطرہ لگا ہوا تھا۔

جغرافیائی حیثیت سے یہ علاقہ جرمنی کی دو ریاستوں یعنی پرَوشیا اور بیوَیریا میں واقع ہے۔ پرَوشیا کے زیر اثر حصے کا رقبہ پانچسو ستر مربع میل اور بیویریا کا حصہ اکیسو پینسٹھ مربع میل ہے۔ اس طرح اس علاقہ کا کل رقبہ سات سو اڑتیس (۷۳۸) مربع میل اور آبادی تقریباً اسّی لاکھ ہے جس میں چار ہزار کے قریب یہودی اور باقی سب جرمن نسل کے عیسائی ہیں، اس میں کئی بڑے بڑے شہر ہیں اور جس قدر کوئلہ اور لوہا اس علاقہ میں پیدا ہوتا ہے جرمنی میں کہیں پیدا نہیں ہوتا، اس طرح معدنیات کے لحاظ سے یہ رقبہ جرمنی کی جان ہے۔

اس علاقے کو آباد ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ چودھویں صدی عیسوی سے لیکر سنہ ۱۶۸۰ء تک پورے علاقہ پر جرمنی کا قبضہ رہا، مگر سنہ ۱۶۸۰ء میں اس کے کچھ حصہ پر فرانس نے قبضہ کر لیا مگر سنہ ۱۶۹۷ء میں یہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا، اس کے بعد انقلاب فرانس کے وقت فرانسیسی فوجیں پھر اس وادی پر قابض ہو گئیں اور سنہ ۱۸۱۴ء تک تمام علاقہ فرانس ہی کے قبضہ میں رہا، لیکن جنگ واٹرلو میں نپولین اعظم کی شکست و قید کے بعد سآر کا علاقہ پھر جرمنی کو واپس مل گیا، اور وہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تک اسی کے قبضہ میں رہا، مگر اس جنگ کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء میں جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا اور صلحنامہ وارسائی کی شرطیں طے ہونے لگیں تو فاتح جماعت نے جرمنی کو بے دست و پا کر دینے اور خود ہر قسم کا فائدہ اُٹھانے میں کوئی کسر باقی

نہ رکھی، اسی وجہ سے اس صلحنامہ سے بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن کے سبب سے بین الاقوامی سیاسیات کی فضا مکدر رہورہی ہے، انھیں میں علاقہ سار کا مسئلہ بھی ہے۔

۲۸۔ مارچ ۱۹۱۹ء کو جب تین بڑی سلطنتوں یعنی امریکہ۔ برطانیہ اور فرانس میں کانفرنس ہوئی تو فرانس نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ جرمنی اور فرانس کے مابین ۱۸۱۴ء کی سرحد خط فاصل قرار دی جائے، اس طرح فرانس نے وادی سار کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہا لیکن یہ مطالبہ بالکل نیا تھا۔ فرانس نے کئی موقعوں پر جرمنی اور فرانس کے درمیان دریائے رھائن کو حد فاصل قرار دینے کی کوشش کی تھی، لیکن نہ معاہدۂ التوائے جنگ میں اور نہ اس سے پہلے کبھی اس سرحد کا کوئی ذکر سننے میں آیا تھا نہ اعلان جنگ اور نہ اس کے بعد کسی دوسرے سرکاری اعلان میں اور نہ فرانسیسی پارلیمنٹ میں وادی سار کا کبھی کوئی ذکر کیا گیا تھا۔ البتہ فروری ۱۹۱۷ء کے خفیہ معاہدہ میں جو روس و فرانس کے درمیان ہوا تھا فرانس نے اس علاقہ کا ذکر ضرور کیا تھا۔ بہرحال گفتگوئے صلح میں جب فرانس نے سار کے الحاق کا اچانک مطالبہ کیا تو پریسیڈنٹ ولسن اور مسٹر لائڈ جارج نے جو اس وقت برطانیہ کے وزیر اعظم تھے، اس کی سخت مخالفت کی

فرانس کی طرف سے یہ عذر کیا گیا کہ جرمنی کی فوجوں نے فرانسیسی علاقہ کی تمام کانیں تباہ کردی ہیں اسلئے بطور تاوان فرانس کو وادی سار کی جرمن کانوں پر قبضہ دلایا جائے۔ بہت کچھ ردوکد کے بعد پریسیڈنٹ ولسن نے اس بات پر تو آمادگی ظاہر کی کہ فرانس کو کچھ عرصہ کے لئے سار کی کوئلہ کی کانوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی جائے لیکن اس سے زیادہ انھوں نے بھی فرانس کا ساتھ نہیں دیا تاہم موسیو کلیمنسو نے جس حکمت عملی سے فاتحین کے جذبات سے اپیل کی اس کا اثر یہ ضرور ہوا کہ شمالی فرانس کی تباہ شدہ کانوں کے معاوضہ میں فرانس کو پندرہ سال تک سار کی کوئلہ کی کانوں پر قبضہ دلایا گیا، مگر اس علاقہ کی حکومت مجلس اقوام کے ماتحت ایک بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کیگئی اور یہ طے پایا کہ پندرہ سال گزرنے کے بعد علاقہ کے باشندوں سے استصواب رائے کرکے اُن کی مرضی کے مطابق یا تو ان کو فرانس میں شامل کردیا جائے یا (۲) جرمنی کو یہ علاقہ واپس دیدیا جائے، یا (۳) موجودہ طریقۂ حکومت ہی کے ماتحت رہے۔ بہرحال آئندہ حکومت کے متعلق یہ طے ہوا کہ عام رائے کے مطابق عمل کیا جائے۔

اسی فیصلہ کے دن سے سار میں جرمنی و فرانس کی حریفانہ جدوجہد شروع ہوگئی۔ فرانس کا خیال تھا کہ جو بات صلحنامہ وارسائی کے ذریعہ نصیب نہیں ہوئی وہ پندرہ سال کے اندر حکمت عملی سے حاصل ہوجائے گی۔ پچھلے پندرہ برس کے اندر علاقہ سار میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں، مثلاً ہٹلر کے عروج کے بعد نازیوں کی

سخت گیری سے خائف ہوکر تمام کمیونسٹ، سوشلسٹ اور یہودی بھاگ کر علاقہ سار میں آبسے جس سے فرانس کو اُمید کی جھلک نظر آنے لگی چنانچہ فرانس نے نازیوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا طرح طرح کی افواہیں اُڑائی گئیں مگر اسکے برعکس جرمنی کے ارباب حل و عقد نے نہایت دانشمندی سے کام لیا اور کسی قسم کی جبریہ کارروائی پسند نہ کی بلکہ ہمیشہ یہی ظاہر کرتے رہے کہ انھیں یقین کامل ہے کہ سار کا فیصلہ انھیں کے حق میں ہوگا۔

فرانس نے اس علاقے پر اپنا قبضہ رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی پیش کی کہ سار کی کانوں میں اس کا غیر معمولی سرمایہ لگا ہوا ہے، اس لئے اگر یہ کانیں جرمنی کے حوالے کی جائیں تو فرانس کا جو سرمایہ لگا ہوا ہے اس کا اُسے معاوضہ دلایا جائے۔ یہ مطالبہ اتنا زبردست تھا کہ آخر معاہدہ روما کے ذریعہ یہ طے پایا کہ اگر اہلِ سار کا فیصلہ جرمنی کے حق میں ہو تو وہ فرانس کو نو ارب فرانک بطور تاوان ادا کرے اور آئندہ پانچ سال تک ایک کروڑ دس لاکھ ٹن کوئلہ بھی سالانہ دے۔

استصواب رائے عامہ کے موقعہ پر نقض امن کے خطرے کو دُور کرنے کے لئے مجلس اقوام نے ایک کمیٹی مقرر کردی تھی جس نے استصواب رائے کے متعلق تمام ضروری انتظامات اور مدارج طے کردیے۔ حفظِ امن کے لئے مزید کارروائی یہ کیگئی کہ انگلستان۔ اٹلی۔ سویڈن وغیرہ ملکوں سے فوجی دستے بلا لئے گئے اور نازی فوج کے سپاہیوں کو سار کی سرحد کے قریب آنے کی ممانعت کردیگئی۔

غرض خدا خدا کرکے ۱۵ جنوری ۱۹۳۵ء کا دن آیا اور استصواب رائے شروع ہوا۔ ۹۷ فیصدی باشندگان علاقہ نے ووٹ دیئے مگر کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہونے پایا۔ پانچ لاکھ چوبیس ہزار سات سو پچاسی (۵۲۴۷۸۵) آدمیوں نے ووٹ دیے، ان میں یا نوے فیصدی ووٹ جرمنی کے حق میں آئے یعنی چار لاکھ چھہتر ہزار نواسی (۴۷۶۰۸۹) باشندگان سار نے جرمنی کے ماتحت رہنے کی آمادگی ظاہر کی (۲) دو ہزار تراسی (۲۰۸۳) ووٹ فرانس کے موافق آئے (۳) موجودہ نظم و نسق قائم رکھنے کے حق میں چھیالیس ہزار چھ سو تیرہ (۴۶۶۱۳) رائیں موصول ہوئیں، نو سو (۹۰۰) ووٹ کسی نہ کسی وجہ سے ناجائز ہوگئے اور ایک ہزار دو سو چھپن ووٹ سادہ ڈالے گئے۔ غرض بانوے فیصدی باشندگان سار نے جرمنی کے اقتدار حکومت میں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ مجلس اقوام نے اس علاقہ کو یکم مارچ ۱۹۳۵ء سے جرمنی کے حوالہ کردینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن فرانس نے تمام فوجی استحکامات کے انہدام کا مطالبہ کیا ہے، جرمنی پُرامن رویہ اختیار کئے ہوئے ہے جس سے امید ہے کہ تمام معاملات بحسن و خوبی طے ہوجائیں گے۔

عالمِ نسواں

اس ماہ کراچی کی خواتین کانفرنس میں جو مسز رستم جی فریدون جی کی صدارت میں منعقد ہوئی ہندوستان کے مختلف مقامات کی نمایندہ خواتین کے علاوہ دو روشن خیال اور فاضل خاتونیں ڈاکٹر ماڈ رائڈن اور مسز کاریٹ الیشبی اس کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان سے تشریف لائی تھیں رسمی تقریبوں اور تقریروں کے بعد چودہ ریزولیوشن پاس کئے گئے۔ ان میں سے ایک میں حقوق نسواں کے متعلق جائینٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی سفارشات پر اظہار ناراضگی کیا گیا۔ کیونکہ کمیٹی نے عورتوں کے موجودہ قانونی قیود کو رفع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کئی صوبوں کی قانونی کونسلوں میں اور کئی کے ایوان اعلیٰ اور کونسل آف اسٹیٹ میں عورتوں کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ کانفرنس نے گورنمنٹ سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ خاندانی جائداد میں عورتوں کا حق وراثت تسلیم کیا جائے۔ ایک ریزولیوشن کثیر الازدواجی کے خلاف پاس ہوا۔ اور عورتوں سے اپیل کی گئی کہ وہ ایک بیوی کی موجودگی میں کسی مرد کے ساتھ نکاح نہ کریں۔ رانی صاحبہ راجواڑے کی تحریک اور مسز آصف علی کی تائید سے ہندوستانی زبان کو ہندوستان کی مشترکہ زبان تسلیم کیا گیا۔ میسور کی ایک خاتون کی تحریک اور رانی صاحبہ شیر کوٹ کی تائید سے ملک میں جبری تعلیم کی اشاعت کا ریزولیوشن پاس کیا گیا آخر میں پریسیڈنٹ صاحبہ نے سودیشی پر زور دیا۔

ممالک یورپ و امریکہ میں عورتوں کی حالت میں جو انقلاب عظیم ہو گیا ہے اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوگا کہ نیویارک میں اس وقت ایک سو پچیس عورتیں پولیس افسر ہیں جنھیں ہر تیسرے ہفتہ ریوالور سے چاندماری کرنیکا حکم ہے جس کے لئے اُنھیں اپنے پاس بھاری گولی کے ریوالور رکھنا پڑتے ہیں۔

اٹلی میں عورتوں کو بھی فنون جنگ اور ہتھیار چلانے کی تعلیم دینے کی تجویز ہو رہی ہے اور پارلیمنٹری کمیشن نے جو آٹھ سے پچیس سال تک کے نوجوانوں کے لئے فوجی خدمت لازمی کرنیکے لئے مقرر کیا گیا تھا اس کے موافق رپورٹ کی ہے۔

ترکی اس بارہ میں سب سے سبقت لے گیا ہے۔ وہاں پہلے ہی سے ڈیڑھ لاکھ عورتوں کی ایک زبردست فوج تیار ہے جو فنون جنگ میں کافی مہارت حاصل کر چکی ہے اور آئندہ جنگ میں مردوں کے دوش بدوش حفاظت وطن کی خدمت انجام دیگی۔

حقوق رائے دہی۔ مساوات شہریت کے بین الاقوامی اتحاد خواتین

(International Alliance of Women for suffrage and Equal Citizenship.)

کا آئندہ اجلاس استنبول (ٹرکی) میں منعقد ہونیوالا ہے جس میں آل انڈیا انجمن خواتین سے بھی ڈیلیگیٹ بھیجنے کی استدعا کی گئی ہے۔

جاپان کے ابتدائی اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کا تعلیمی نصاب ایک ہے اور پچھلے سال اُنچاس لاکھ اُنہتر ہزار چھ سو اکتیس لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں۔ جاپان میں اس وقت لڑکیوں کے لئے نوسو اسی پرائمری اسکول، پانچ سو اٹھاون مڈل اسکول اور صرف چوالیس ہائی اسکول ہیں حال میں جوان لڑکیوں کو سینے پرونے، کھانا پکانے نیز امور خانہ داری و مہمان نوازی، پرورش اطفال وغیرہ کی تعلیم دینے کے لئے بھی بڑے پیمانہ پر ایک اسکول کھولا گیا ہے

غیر ممالک کی عورتوں نے کھیل، کود، ورزش وغیرہ مردانہ مشاغل میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا ہے چنانچہ اس وقت انگلستان میں ایکسو ساٹھ زنانہ کلب ہیں جنمیں عورتیں ٹینس۔ ہاکی، کرکٹ وغیرہ تمام مردانہ کھیل کھیلتی ہیں۔ آجکل انگلستان کی عورتوں کی ایک کرکٹ ٹیم آسٹریلیا کی عورتوں سے میچ کھیلنے گئی ہوئی ہے اور حال میں انگلستان کی عورتوں کو ایک میچ میں کامیابی ہوئی ہے۔

انگلستان کے شہر سفوک میں مس ڈوین گوڈل نامی پندرہ سال کی ایک لڑکی ہے جو شہسواری میں اپنے ملک کے بڑے بڑے شہسواروں کو ہرا چکی ہے، اس وقت تک اسے اس فن میں ڈھائی سو انعامات حاصل ہو چکے ہیں۔

حال میں مغربی لنڈن میں اندھوں کے انسٹی ٹیوٹ کی افتتاحی رسم کے سلسلے میں ہز رائل ہائینس شاہزادہ ویلز نے جو تقریر ارشاد فرمائی اُسے ایک اندھی لڑکی نے شارٹ ہینڈ کے ذریعہ مشین پر لکھکر شاہزادہ ممدوح کو حرف بحرف سنادیا۔ اس لڑکی نے تعلیم و تربیت سے ایک منٹ میں دوسو الفاظ قلمبند کرنیکی مہارت پیدا کرلی ہے۔

لکھنؤ کے آل انڈیا مباحثہ میں خواتین کا انعام سینٹ زیویر کالج بمبئی کی مس کھنہ نے حاصل کیا۔

مسز وردیدی بائی گپتا حال میں انگلستان اور اٹلی میں فن تعلیم حاصل کر کے ہندوستان واپس آئی ہیں اور لکھنؤ اینگلو ورنیکولر میونسپل گرل اسکول کی پرنسپل مقرر ہوئی ہیں۔

علمی نوٹ اور خبریں

اس نمبر سے "زمانہ" کی نئی جلد کا آغاز ہوتا ہے۔ اگلے نمبر سے اس کی زندگی کا تینتیسواں [۳۳] سال شروع ہوگا ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے اس نمبر سے کئی اہم تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ابتک رسالہ میں حصۂ نظم بالکل علٰحدہ رہتا تھا مگر اس نمبر سے نظم و نثر مضامین مخلوط کر دئے گئے ہیں جس سے ناظرین کی دلچسپی میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہو جائیگا۔ نثر کے سنجیدہ مضامین کا بار ہلکا ہو جائیگا اور مضامین کے آخری صفحات میں جو جگہ بچ رہا کریگی اس میں چھوٹی چھوٹی نظمیں رباعیات قطعات اور غزلیات کے لئے معقول جگہ نکل آئیگی۔ ہمکو امید ہے کہ یہ ترتیب مقبول عام ہوگی۔

اس نمبر سے اڈیٹوریل سکشن بھی علٰحدہ کر دیا گیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہر ماہ کے خاص خاص واقعات عالم کے متعلق زمانہ میں نوٹ اور مضامین شائع ہوا کریں لیکن بجٹ کا خیال رسالہ کے حجم میں مستقل اضافے کی اجازت نہیں دیتا ہے تاہم حسب معمول یہ نمبر زائد حجم پر شائع ہو رہا ہے۔ قدردان ناظرین توسیع اشاعت کے ذریعہ ہماری حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں۔ اگر سب خریدار صاحبان ایک ایک دو دو خریدار ہم پہونچا دیں تو زمانہ آسانی کے ساتھ ہر ماہ سو صفحات کے مضامین نظم و نثر ہدیۂ ناظرین کر سکتا ہے۔ بہرحال ہم اپنا فرض ادا کرنے کو مستعد ہیں بشرطیکہ خیر خواہانِ اردو اور قدردانانِ رسالہ بھی ہماری حوصلہ افزائی پر کمر بستہ ہوں۔

سید امیر احمد صاحب علوی کاکوروی ڈپٹی کلکٹر نے کسی زمانہ میں شیکسپیر کے مشہور ڈرامہ "مڈسمر نائیٹس ڈریم" کا اردو ترجمہ کیا تھا جسکا تعارف منشی سجاد حسین مرحوم اڈیٹر اودھ پنچ نے لکھا تھا، خوشی کی بات ہے اب یہ ترجمہ مع تعارف کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے اور ۸ر میں کتبخانہ امیر محل کاکوری ضلع لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔ سید صاحب نے آخری بادشاہ دہلی کی بھی ایک سوانحعمری لکھی ہے جسکا ایک باب گذشتہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے، یہ کتاب بھی عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔

مسٹر سلطان حیدر جوش کے گیارہ متفرق مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہو گیا ہے اور ایکروپیہ قیمت میں منیجر صاحب ڈسٹرکٹ گزٹ پریس علیگڈھ سے مل سکتا ہے۔

معاصر "نگار" لکھنؤ نے اپنے جنوری نمبر کو جو سالنامہ کی حیثیت سے خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے لکھنؤ اور دہلی اسکول کے اصناف شاعری پر تاریخی و تنقیدی تبصرہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ بہت سے اہل الرائے حضرات نے اس مبحث پر قابل قدر مضامین لکھے ہیں

حال میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کے تازہ ترین اردو کلام کا ایک مجموعہ "بالِ جبریل" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

(تاج کیونکر بنا) اس نمبر میں ایک خاص رنگین تصویر ہدیۂ ناظرین ہے جسمیں قابل مصور نے روضۂ تاج محل کے متعلق شاہجہاں کی تخیل قلمبند کرنیکی کوشش کی ہے۔ ہمارے رفیقِ کار مولانا کلام صاحب بی۔اے نے اس تصویر کی اشعار میں تشریح کی ہے جو حسب ذیل ہے:-

آئی تنہائی میں اک روز جو یادِ ممتاز ... طائرِ فکر نے کی شاہجہاں کے پرواز

دیکھتا کیا ہے کہ جنت میں بناز و انداز ... قصرِ گوہر میں ہے وہ حور لقا جلوہ طراز

نقشۂ قصرِ جناں دل کے نگیں پر اُترا ... پھر وہی تاج محل بن کے زمیں پر اُترا

(زبانِ حالِ شاہجہاں)

Zam Buk
ایکوتہ بیتی اور زخموں
کو آرام کیجئے
نباتاتی مرہم زمبک استعمال کیجیئے
تپتی کے سرخ سرخ بدنما چھتے، خارش کے داغ اور مواد سے لبریز دردناک پھوڑے بہت جلد تکلیف دہ بیماری بنجا سکتے ہیں اسلئے
اپنی جلد کی طرف سے غفلت نہ کیجئے فوراً رنجور مقامات پر نباتاتی مرہم زمبک مل دیجئے۔ زمبک نے لاکھوں کروڑوں
آدمیوں کے ایکوتہ خارش گنج پھوڑوں پھنسیوں اور کھلے زخموں کو آرام کر دیا ہے اور وہ آپ کو بھی شفا دے گا۔
چونکہ زمبک گوشت میں جلد جذب ہو جاتا ہے اسلئے وہ مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ زمبک درد کا خاتمہ کر دیتا ہے
زہریلے جراثیم کو ہلاک کر دیتا ہے۔ زمبک خالص ترین جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ جلد کی تمام بیماریوں
جلے کٹے زخموں، بیمار ٹانگوں اور بواسیر وغیرہ میں زمبک استعمال کیجئے۔
تمام دوا فروش زمبک کی ڈبیہ ایک روپیہ اور سوا دو روپیہ میں فروخت کرتے ہیں۔
جانوروں کی چربی سے پاک ہونے کی گارنٹی

زمبک Zam Buk

روسی ڈاکٹر ورناف ہندوستان میں

روس کے مشہور ڈاکٹر ورناف نے جو بندر کے غدود نکال کر از سر نو جوانی کا جوش پیدا کر دیتے ہیں ہندوستان میں آکر کئی جگہ آپریشن کر کے غدود چڑھایا۔ اس طرح کرنے میں ہزاروں روپیہ کا صرف ہوا۔ بندر کا غدود چڑھانے سے خیالات میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے اس طرح کی کئی باتیں اخباروں میں پڑھی گئیں اس لئے آپ بلا وجہ اس قدر صرفہ کا بار برداشت کر کے اپنے خیالات پراگندہ نہ بنائیں۔

آپ صرف مقویات سرتاج عالم آتنک نگرہ گولیوں کا استعمال کریں یہ گولیاں تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کے سرد خون میں تازگی پیدا کر دیں گی منی سے جسم کی رگ رگ کو بھر دینگی اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں جوش پیدا ہو جاویگا آپکے خیالات پاکیزہ جسم مضبوط حافظہ تیز چہرہ پر نور ہو کر لطف زندگی سے بہرہ اندوز ہو پائیں گے قیمت بھی معمولی سکو دیکھکر شاید آپ ہنس پڑیں یعنی فی ڈبیہ ۳۲ گولی صرف ایک روپیہ پانچ ڈبیہ صرف چار روپیہ۔ اگر کوئی پوشیدہ شکایت ہو تو ایک شیشی طلا راجی کرن استعمال کیجئے قیمت فی شیشی پانچ روپیہ صہ دیگر رموز زندگی معلوم کرنے کیلئے ایک علاحدہ کتاب کام شاستر بالکل مفت منگا لیں۔

ویدشاستری منی شنکر گووندجی۔ جام نگر (کاٹھیاواڑ)

ایجنٹ: مسرس عبدالکریم اینڈ سنس۔ سلطن روڈ۔ کانپور

فوراً ضرورت ہے

چند ایسے معتبر اشخاص کی مانند ۵۰ ماہواری تنخواہ پر جو ملٹن کی کھلی ہوئی یا بند چلنے کا اسٹاک رکھکر اس کی فروختگی کو ترقی دیں مکر ایہ مکان اور ملازموں کی تنخواہ علیحدہ دیجائیگی خط و کتابت انگریزی میں ہونا چاہیئے دیگر باتیں مندرجہ ذیل پتہ سے دریافت کیجئے:-

THE MANAGER.

MILTON HOUSE

P.O. Box No: 6837.

BURRA BAZAR

CALCUTTA.

ضرورت ہے

ایجنٹوں اور انسپکٹروں کی

تنخواہ مبلغ تیس روپیہ ۳۰ سے سو روپیہ ماہوار تک دی جائیگی صرف وہی اصحاب درخواست کریں جو نقد ضمانت داخل کر سکتے ہوں۔ درخواست میں عمر لیاقت موجودہ کاروبار اور تجربہ کا حوالہ دینا چاہیئے۔

اورینٹل ٹوبیکو کمپنی آف انڈیا

نمبر ۲۹۳ ناگدیوی اسٹریٹ بمبئی ۳

دردِ وفا

والدین اور اغیار کے ہاتھوں کیلاش اور کامنی کے سچے جذبات دلی کا کچلا جا کر ایک دردناک صورت اختیار کرنے اور آخر میں ایک کی جان پر بن جانے کا یہ الم انگیز واقعہ پنڈت کشن پرشاد کول ممبر خادم ہند لکھنؤ نے ایک دلدوز پیرایہ میں اس طرح لکھا ہے کہ انسان پڑھتے پڑھتے بیقرار ہو جاتا ہے چونکہ یہ ناول محض سوسائٹی کی اصلاح کیلئے لکھا گیا ہے اسلئے باوجود ساڑھے چار سو سے زیادہ صفحات کی ضخامت ہونیکے قیمت صرف ایکروپیہ چار آنہ رکھی گئی ہے آپکا کتبخانہ اسکی ایک جلد سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔

تاریخ ہند (عہد اسلامی)

غلام محمد صاحب ایم اے نے ہندوستان کے اسلامی عہد کی یہ مختصر تاریخ طلبائے اسکول و کالج کی نفع رسانی کیلئے انگریزی زبان میں تحریر فرمائی ہے ضخامت تقریباً دو سو صفحات قیمت ایکروپیہ عہ

قربانی

یہ بھی پنڈت کشن پرشاد کول کا ایک اصلاحی ڈرامہ ہے جسمیں سوسائٹی کی اصلاح خصوصاً شادی بیوگان پر زور دیا ہے قیمت ۸

بہارِ سخن

بابو شیام سندر لال صاحب برقؔ ایڈوکیٹ سیتاپور کا لاجواب اور تاریخی تذکرہ جسمیں نہایت تلاش و تجسس سے پانسو چھیاسٹھ ۵۶۶ ہندو شعراء ماضی و حال کے سوانح حیات و منتخب کلام درج ہے۔ ترتیب حروف تہجی کے مطابق رکھی گئی ہے جس سے فہرست دیکھتے ہی ہر شاعر کا حال معلوم ہو جاتا ہے پرائیویٹ کتب خانوں اور پبلک لائبریریوں میں رکھنے کی چیز ہے قیمت دو روپیہ عا

دنیائے راز

ابوالفضل راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ ہے ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف قیمت عہ

بزمِ خیال

اس میں اردو اور فارسی شعراء کے مجالس کے لطائف و ظرائف اور برجستہ گوئی و حاضر جوابی کے نمونے درج کیے گئے ہیں جو خوش مذاق حضرات کی تفریح کا بہترین سامان ہے قیمت عہ

روٹھی رانی

ایک دلچسپ اور سبق آموز افسانہ جسمیں اچھوت عورتوں کی حالت کا مرقع پیش کیا گیا ہے قیمت ۸

رامائن مسدس

(مصنفہ جناب منشی رام سہائے لال صاحب کپور سنبھلی) اس رامائن کی مخصوص خوبی یہ ہے کہ قابل مصنف نے شری رامچندر جی کے چرتر کو عجیب و غریب انداز میں بیان کیا ہے مصنف کی جدت طراز و ذہن رسا نے نازک و نادر استعارات اس حسن و خوبی سے استعمال کئے ہیں جو روحانی و وجدانی لطافت سے مملو ہیں ہر شعر چلتا ہوا جادو ہے لطف محاکات و بلند پروازی تخیل قابل تحسین ہے اشعار میں فصاحت و بلاغت کا دریا موجیں لے رہا ہے۔ رامائن کے اندر نو تصویریں رنگین نہایت فینسی ہیں صفحات ۲۰۸ مجلد فینسی قیمت مجلد باتصویر للعہ، مجلد بلاتصویر عہ بلا جلد عا

بیوہ

(مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کی تازہ تصنیف) اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات لکھے گئے ہیں اور انکی ترغیبات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ بیواؤں کے لئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے حجم ۲۱۵ صفحات قیمت عہ

گھر گرہستی

(مصنفہ مولوی سید بشیر حسن صاحب امروہوی مولوی فاضل) اس کتاب کے اندر قصہ اور مکالمہ کے پیرایہ میں عورتوں کو اچھی بیبیاں، اچھی مائیں اور رفیقۂ حیات بننے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہر عمر کی عورتوں کو دلچسپ قصوں اور دلنشین مثالوں کے ذریعہ سے جملہ امور خانہ داری اخلاق و معاشرت سکھائے گئے ہیں یہ بےنظیر کتاب اس قابل ہے کہ لڑکیوں کو جہیز میں دیجائے کوئی شریف بی بی اور کوئی شریف گھر اس سے خالی نہ رہنا چاہیئے ہر ہائی نس نواب بیگم صاحب رامپور کی سرپرستی میں تیار ہوئی ہے ۱۲ عہ

اختر ستان

ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخاں صاحب اثرؔ لکھنوی کا دیوان حسین کا ہر مصرعہ پُر تاثیر و نشتر ہے۔ قیمت عہ

جہاں آرا بیگم

شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا کی سوانحعمری جسے ملک کے مشہور اہل قلم ضیاءالدین صاحب بی اے نے مرتب کیا ہے حجم ۱۴۸ صفحات سائز قدرے بڑا قیمت ۸

فلسفۂ جنگ

فلسفۂ جنگ پر عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے قیمت ۴

سب کتابیں ملنے کا پتہ: منیجر زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور

سکھ سنچارک جنتری
سنہ ۱۹۳۵ء
جسمیں جنتری کے علاوہ روزمرہ کے ضروری کام کی باتیں درج ہیں نیز ادویات گھڑیاں۔ باجے۔ رام لیلا اور راس لیلا و ولایتی مشینی سامان کی مختصر فہرست بھی آپکے ملاحظہ کیلئے اسمیں دیجیگئی ہے
مالک
سکھ سنچارک کمپنی متھرا نے
معزز پبلک کی خدمت میں پیش کی

مال منگوانے سے پہلے خریداروں کے جاننے کے واسطے ضروری باتیں

۱۵ جون ۱۹۲۱ء سے سرکار نے ڈاک محصول بڑھا کر نیچے لکھے حساب سے کر دیا ہے

۲۰ تولہ تک ۵؍ ، ۲۰ تولہ سے ۴۰ تولہ تک ۷؍ اور ۴۰ تولہ سے ۶۰ تولہ تک ۱۱؍ یہ محصول معہ رجسٹری کے ہے۔
صرف ۴۰ تولہ سے زیادہ پر ۴؍ کے حساب سے لگے گا۔ منی آرڈر فیس اسکے علاوہ ڈاکخانہ والے علیحدہ لیتے ہیں۔

۱۔ ڈاک محصول خوب بڑھ جانے سے اب ہم ۸؍ سے کم قیمتی اشیاء بذریعہ وی۔ پی روانہ نہیں کرتے آٹھ آنہ کا سامان منگوانے پر بھی معہ محصول ۱۲؍ میں پڑیگا۔ اس امر کا دھیان رکھکر مال منگوانا چاہئے۔

۲۔ پوسٹ کارڈ پر ۲؍ کا اور لفافے پر ۶ ماشے تک ۱؍ اور اس سے بھاری ڈھائی تولہ تک ۲؍ کا ٹکٹ ضرور لگا دینا چاہئے۔ پوسٹ کارڈ پر ٹکٹ کم لگنے اور نہ لگنے سے ڈاکخانہ ہی میں پھاڑ دیا جاتا ہے۔

۳۔ ادویات پر کمیشن صرف ایجنٹوں کو ہی دیا جاتا ہے یا ان خریداروں کو جو درجنوں کے حساب سے دوا خریدتے ہیں۔

۴۔ ہماری ادویات خاص کر سدھا سندھو۔ دودھ گنج کیسری۔ بال سدھا اور دراکشا سو سب ہی دکانداروں بڑے بڑے دوافروشوں اور عطاروں و پنساریوں کے پاس ملتی ہیں ہم سے منگوانے سے پہلے اپنے شہر گاؤں یا قصبہ میں تلاش کر لیجئے اگر نہ ملے تو ہم کو لکھنا چاہئے ایجنٹوں سے خریدنے سے آپکو محصول کی کفایت ہوگی جس قیمت پر ہمارے یہاں سے ملیں گی اسی قیمت پر ایجنٹ دینگے۔

۵۔ زیادہ مال ریلوے پارسل منگوانے سے دکانداروں کو سستا پڑتا ہے خاصکر بال سدھا اور دراکشا سو تو ریلوے سے ہی منگوانا چاہئے۔ خط میں پاس کے ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور لکھئے۔ اور چوتھائی رقم پیشگی منی آرڈر سے بھیجنی چاہئے

۶۔ ہم نے ولایت سے ادویات بنانے کی مشینیں منگوائی ہیں جس سے ہر طرح کی سونا۔ چاندی جڑی ہوئی چاہے جس دوا کی گولیاں بنا کر بھیج سکتے ہیں ٹکیاں بھی بنا کر بھیج سکتے ہیں وید حکیم۔ ڈاکٹر جو اپنی دوا کی ٹکیاں یا گولیاں بنوانا چاہیں ہم سے خط و کتابت کریں۔

۷۔ ہر قسم کی آیورویدک ادویات عرق کشتہ جات۔ تیل پاک وغیرہ تیار رہتے ہیں اور آرڈر کے مطابق تیار کر کے بھی روانہ کئے جاتے ہیں۔ ایکبار منگوا کر ضرور آزمایش کیجئے متھرا آکر ہمارے کارخانے کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

۸۔ ہر قسم کا ڈاکٹری سامان تھرمامیٹر۔ میجر گلاس منیم گلاس ترازو پچکاری ڈوش نشتر کھرل شیشیاں کارک ولایتی ادویات اور ادویات کی گولیاں ہمارے ذریعہ سے تیار ملیں گی۔ ادویات کے لیبل۔ پرچہ ترکیب استعمال اور نوٹس وغیرہ کی چھپائی اور بلوک بنوانے کا بندوبست بھی ہم کر سکتے ہیں ایسی ضرورت کے واسطے ہم کو ضرور لکھئے۔ رنگین کیلنڈر بھی چھپوا کر دے سکتے ہیں

نیازمند
چھتر پال شرما
مالک سکھ سنچارک کمپنی متھرا۔ یو۔ پی

شنکھ سنیما پارک کمپنی متھرا سے واقفیت

جن اصحاب نے کبھی متھرا تشریف لاکر ہمارے کارخانہ کو بچشم خود نہیں دیکھا ہے وہ یہی سمجھتے ہونگے کہ ہماری کمپنی بھی ایک ایسی ہی کمپنی ہوگی جیسی کہ آجکل کاغذی گھوڑے دوڑانے والی دیگر کمپنیاں بڑے نام ہیں۔ جو لوگ ایسے جھوٹے اشتہاروں کے ذریعہ ٹھگے جاچکے ہیں اُن کو تو کمپنی کے نام ہی سے نفرت ہوگئی ہے۔ اور اشتہاروں و نوٹسوں پر سے عقیدہ جاتا رہا ہے مگر ہم ہر ایک صاحب کو اس بات کا ہر طریقے سے یقین دلانے کو تیار ہیں کہ ہمارے یہاں سے کبھی کسی طرح کا دھوکا ہونا ناممکن ہے اگر کسی وجہ سے ہمارے یہاں کا روانہ کیا ہوا سامان خریدار کے ناپسند ہو تو یہ سمجھئے ہی۔ ہم آپ کو سب کے واپس کرلینے سے قیمت بذریعہ منی آرڈر واپس کردیجاتی ہے ہماری روانہ کی ہوئی ... اگر ... میں ٹوٹ گئی ہو تو پوسٹ ماسٹر سے لکھا کر بھیجنے سے ہم وہی دوا بلا قیمت روانہ کردیتے ہیں ... آپکو یقین ... ملاحظہ فرمایئے اس سے زیادہ اور آپ کیا آسانی چاہتے ہیں۔

ہمارے یہاں کیا ہوتا ہے

مہلک امراض کا علاج بذریعہ بجلی ہوتا ہے ہر قسم کی آیورویدک ادویات عرق۔ کشتہ جات پاک ادلیہ تیل۔ آسب وغیرہ تیار رہتے ہیں مشینوں کے ذریعہ سے سب ادویات تیار کیجاتی ہیں۔ چھپائی کا کام بذریعہ انجن بڑی بڑی مشینوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے سب طرح کی ربڑ کی مہریں پیتل کی چپراسیں ہمہ رجسٹری پر لگانے کی پیتل کی مہریں پیتل ڈمین کے سائن بورڈ بھی تیار ہوتے ہیں رام لیلا راس لیلا۔ سوانگ تماشے اور ناٹکوں کا سب سامان۔ بال جٹا۔ چہرے و پوشاکیں تیار ہوتی ہیں عورتوں کے واسطے سوتی۔ ریشمی سیاہ نقلی و اصلی زری کے کام کی ساڑھیاں۔ جاکٹیں۔ بچوں کی پوشاکیں بجلی کے لیمپ۔ گیس کے لیمپ پٹرول سے جلنے والے لیمپ وغیرہ روشنی کا سامان۔ عطر خوشبودار تیل۔ پان کا مصالحہ۔ خوشبودار ولایتی سینٹ ولایتی عطر مشہور معروف خوشبودار تیل ولایتی خوبصورت اشیاء بچوں کے کھلونے۔ جیبی گھڑیاں۔ دیوار پر لگانے کی گھڑیاں۔ ٹائم پیس۔ کلائی پر باندھنے کی گھڑیاں وغیرہ ہر قسم کی گھڑیاں ہمارے یہاں ملتی ہیں۔

گانے بجانے کا سامان۔ ستار۔ سارنگی۔ سرآج طبلہ۔ ہارمونیم گراموفون باجے۔ بانسری۔ الگوزہ اور گانا بھرے ہوئے پلیٹ۔ سوئیاں کلکتہ بمبئی۔ بنارس لکھنؤ وغیرہ کی چھپی ہوئی کتابیں ناٹک اوپنیاس ویدک پران

انجکشن وغیرہ کی دیسی دستکاری کی اشیا مشین وغیرہ سینکڑوں قسم کا سامان ہمارے یہاں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

جو صاحب متھرا خود تشریف لاویں یا اُن کے دوست احباب تشریف لاویں اُن سے التجا ہے کہ ایک بار ہمارے کارخانہ کو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

ہمارے یہاں ہندی اُردو انگریزی بنگالی گیتھی گجراتی۔ مرہٹی وغیرہ زبانوں کے کام کرنیوالے کلرک موجود ہیں۔ اسلئے جن اصحاب کو جس زبان میں خطوط تحریر کرنے میں سہولیت ہو روانہ کرسکتے ہیں انکو اسی زبان میں جواب بھی دیا جائیگا لیکن مضمون خط صاف اور پورا پتہ ہونا ضروری ہے۔ اپنے مرض کا پورا پورا حال بند لفافہ میں لکھکر روانہ کرنا چاہیئے۔ مرض آتشک (گرمی) سوزاک۔ نامردی وغیرہ پوشیدہ امراض کے خطوط کا حال نہ تو کسی کو ظاہر کیا جاتا ہے نہ ان امراض کے سارٹیفکیٹ چھاپے جاتے ہیں۔

آیورویدک دوائیاں بڑے بڑے قابل و تجربہ کار ویدوں کی نگرانی میں تیار ہوتی ہیں۔ ہر ایک خط کا جواب بواپسی ڈاک دیا جاتا ہے۔ ہماری پیٹنٹ ادویات سب آزمودہ و مفید ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر و وید سب ان کا استعمال اپنے مریضوں کو کراتے ہیں۔ ہمارے یہاں ان سب مشینوں کے ذریعہ سے ادویات تیار کیجاتی ہیں جو آج تک سائنسدانوں نے تلاش کرنے کے بعد عمدہ اور مفید ثابت کی ہیں۔ ٹکیاں بنانیکی مشین گولی بنانے کی مشین۔ گولیوں پر سونا چاندی و چینی چڑھانے کی مشین۔ نیز شیشیوں میں دوا بھرنے کی مشینوں کے ذریعہ کام لیا جاتا ہے۔

ہماری ادویات کی شہرت و مفید ہونا آپ اسی سے سمجھ سکتے ہیں کہ آج ہماری ادویات کو فروخت کرکے ایک لاکھ سے زیادہ ایجنٹ ہندوستان۔ برما۔ لنکا۔ امریکہ۔ فیجی۔ شام۔ تبت وغیرہ ملکوں میں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہزاروں تعریفی خطوط بطور سارٹیفکیٹ قابل ویدوں۔ ڈاکٹروں حکیموں ولیڈروں کے آتے ہیں۔ آپ ایسے خطوط کی کتاب ہمارے یہاں سے منگوا کر ملاحظہ کرسکتے ہیں۔

● سُدھا سندھو کا نام اور لیبل دونوں ہمارے رجسٹری کئے ہوئے ہیں۔ ٹریڈ مارک میں نقل کرنیوالے قانونی سزایاب ہونگے اسکے واسطے ہائیکورٹ تک کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ نقل کرنیوالوں کو نقل کرنا بند کرنا پڑا ہے سُدھا سندھو کی شہرت و عزت کو عدالتوں تک نے قبول کیا ہے۔ دوا مفید اور کثیر تعداد میں فروخت ہونیکی اسی وجہ سے لوگ نقل کرنے لگے ہیں۔ لیکن آخرکار شکست کھا کر گھر بیٹھنا پڑا ہے۔ آپ خوب اچھی طرح یاد رکھیئے کہ

ہمارے یہاں سے کبھی دھوکا یا دغابازی نہیں ہوسکتی

سُکھ سنچارک کمپنی متھرا

سہ سالہ آزمائش و شہرت نے شک و شبہ کی جگہ ہی نہیں رکھی ہے
سرکار قیصر ہند و جرمن گورنمنٹ سے رجسٹری شدہ
سُدھا سندھو
یہ وہی دوا سُدھا سندھو ہے جس نے دنیا میں مشہور و
معروف ہو کر لاکھوں انسانوں کو موت کے پنجے سے
چھڑایا ہے۔ لاکھوں شیرخوار معصوم بچوں کو جو اپنی تکالیف
اپنی زبان سے نہیں بتا سکتے تھے اس سُدھا سندھو
نے آرام پہنچایا ہے۔ ہزاروں خاندان جنکے گھر میں مرد
نہیں صرف عورتیں ہی سب گھر کی نگہبان ہیں انکے
لئے یہ سُدھا سندھو ہی ایک ایسی دوا ہے جو بغیر
انوپان کے صرف پانی میں یا بتاشہ میں ڈال کر لیا دینے
سے ڈاکٹر حکیم وید کے اخراجات کو بچا لیتی ہیں
یہی وجہ ہے کہ لوگ اسے گھر میں اشیائے ضروری کی طرح منگوا کر
رکھتے ہیں اور اسکی فرمایش اسقدر ترقی پر ہے کہ ہر
قصبہ کے عطار۔ پنساری۔ ڈاکٹر وید۔ حکیم۔ اس کو
منگوا کر رکھتے ہیں اور فروخت کر کے فائدہ اٹھاتے
ہیں ایسے ایجنٹوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ
پہنچ گئی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ یہ دوا جیسی
مفید ہے ویسی ہی خوش ذائقہ بھی ہے۔
ہم نے خود ریل میں سفر کرتے ہوئے دیکھا ہے
کہ اکثر عقلمند صاحب کے ٹرنک میں بھی سُدھا سندھو
ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ آج کل ایسی بھی ادویات
دیکھی جاتی ہیں جن کو سب امراض کی ایک ہی دوا
کہا جاتا ہے لیکن دھیان رکھئے کہ ان سب امراض
کا اچھا ہونا نہ ہونا انوپان کے اوپر منحصر ہوتا ہے مگر ہمارا
سُدھا سندھو انوپان کا محتاج نہیں ہے۔
سُدھا سندھو
حسب ذیل امراض میں لازمی فائدہ مند ہے
اس کے بغیر طلب کئے ہوئے ہزاروں سارٹیفکیٹ
جو ہمارے پاس آئے ہیں موجود ہیں جب مزاج
چاہے تشریف لا کر ملاحظہ فرما سکتے ہیں
اور اپنا اطمینان کر لیجئے۔

سُدھا سِندھو ذیل کے امراض پر مفید ہوتا ہے

کف	شول	آؤں لہو	اُلٹی کرنا
کھانسی	سنگرہنی	قے دست	دودھ پھینکنا
دمہ	قے کرنا	بچوں کے ہرے	جی متلانا
ہیضہ	پیٹ کا درد	پتلے دست	جاڑے کا بخار

یہ دوا مذکورہ بالا امراض پر مریض کو دینے سے ایک ہی خوراک میں اپنا فوراً اثر دکھاتی ہے جانوروں کے امراض میں بھی ایسا ہی فائدہ پہنچاتی ہے لیکن خوراک بہ نسبت انسان کے جانوروں کو دُگنی دینا چاہیے۔

حاملہ عورتیں جن کو اکثر پیچش وقے وغیرہ ہو جایا کرتی ہے اُن کو آپ سُدھا سندھو بلا کسی پس و پیش کے دے سکتے ہیں کیوں کہ اس کو تیار کرتے وقت ان باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔

ہیضہ (جسکو لوگ کالرہ بھی کہتے ہیں) اس مرض میں اسکی شروع ہی میں ایک خوراک پیٹ میں پہنچتے ہی فوراً آرام ہونے لگتا ہے پانچ چھ خوراک میں مریض کو بالکل آرام ہو جاتا ہے ایسی یکایک ہونے والی بیماریوں سے نجات حاصل کرنے کے واسطے عقلمند لوگوں کو سُدھا سندھو کی ایک شیشی ہمیشہ گھر میں رکھنا چاہیئے۔

قیمت

بہ نسبت زیادہ نفع اور تھوڑی فروخت ہونے کے کم نفع اور زیادہ فروخت ہونے کو اچھا خیال کر کے قیمت فی شیشی ۸ رکھی ہے محصول ڈاک ایک سے دس شیشی تک ۔ لگتا ہے۔ ایک درجن شیشیاں ایکدم منگوانے والے کو معہ محصول ڈاک للعہ میں گھر بیٹھے پارسل لجاتا ہے۔ منگوانیوالے کا نام ایجنٹوں کے رجسٹر میں درج ہو جاتا ہے۔

نقلی مال جو لوگ چاہتے ہیں کہ انکو سُدھا سِندھو کے دھوکہ میں دوسری دوا نہ دیدیجائے اسکے واسطے تعلیم یافتہ اصحاب کو چاہیئے کہ سُدھا سِندھو اور سکھ سنچارک کمپنی کا نام پانچ رنگوں میں چھپا ہوا لیبل دیکھکر خریدیں کیونکہ بہت سے لوگوں نے "سُدھا سِندھو" ان چار حروف میں کسی نے آگے دو حروف لگائے ہیں کسی نے پیچھے کسی نے گاہکوں کو پھسلانیکے لئے قیمت کم کر ڈالی ہے ان سبکو آپ سمجھ لیں کہ وہ سُدھا سندھو نہیں ہے دھیان رکھیئے کہ اصلی راسکوپ پیٹنٹ گھڑی چودہ روپیہ میں فروخت ہوتی ہے اور نقلی جسپر راسکوپ سسٹم نام دکھایا ہے دو روپیہ آٹھ آنہ یا تین روپیہ میں فروخت ہوتی ہے دوا آپ فائدہ کیواسطے خریدتے

ہیں یا بستا پن دیکھتے ہیں جو دوا مفید نہ ہو وہ مفت میں بھی گراں ہے کیونکہ تضیع اوقات ہوتی ہے۔ اور
مریض کو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔
بھارت سرکار سے رجسٹری کیا ہوا
سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا
بال سدھا
सुखसंचारक कंपनी मथुरा का
BEST FOR
Children
REGISTERED
TRADE MARK
SUKH SANCHARAK Co.
MUTTRA.
PRICE
اسکے استعمال کرنے سے دبلے پتلے اور کمزور بچے
قوی۔ تندرست۔ موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔ زکام
سردی۔ پیٹ کی بدہضمی اور دن بدن سوکھتے
جانا۔ اچھا ہو جاتا ہے۔ دوا شربت کے مانند
میٹھی ہونے کی وجہ سے بچے خوشی سے دوڑ کے
پی لیتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ۱۲ محصول ڈاک
۔ا تین شیشی ایکدم منگوانے سے معہ محصول عہ
ایک درجن کی قیمت ص علاوہ ریلوے محصول۔
دردگج کیسری
اگر دنیا میں بغیر جلن اور تکلیف کے داد کو جڑ سے کھو دینے والی کوئی دوا ہے
تو وہ یہی سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا دردگج کیسری ہی ہے لگاتے ہی اپنا
اثر دکھلاتا ہے ولو چاہے معمولی یا پکنے والا ہو اسکے لگانیسے اچھا
ہو جاتا ہے اسکی تعریف کے ہزاروں سارٹیفکٹ موجود ہیں قیمت
فی شیشی چار آنے محصولڈاک ایک سے دو تک، بارہ درجن کے دام عہ ڈاک خرچ معاف۔

گھرندھو
سو پچاس امراض کی ایک ہی
یہ بہت سے امراض کی ایک ہی دوا ہے جو
بہت ہی آسان طریقہ استعمال سے ا جو چھوٹے چھوٹے
قصبہ میں کبھی مل سکتے ہیں، علیحدہ علیحدہ امراض پر
کام میں آتی ہے یہ دوا کھانے اور لگانے دونوں
طرح کے کام کی ہے قیمت دوسروں سے نصف
مگر شیشی میں دوا دوسروں کے برابر ہے قیمت فی
شیشی ۴ر محصولڈاک ایک سے دو تک ۸ آنہ
جورناشک سدھا
بخار کی دوا
جاڑے کا بخار جو روزانہ آتا ہو۔ اکترا۔ تجاری
جو تھیہ وغیرہ ایسے ہی بخار اس دوا سے شرطیہ اچھے ہو جاتے
ہیں دفصلی بخار جسکو ملیریا کہتے ہیں اسکی اکسیر دوا ہے قیمت فی شیشی ۲ر محصول
سکھدا بٹی
ہلکے جلاب کی دوا
رات کو سوتے وقت دو گولی کھا لینے سے صبح ایک دو
دست صاف ہو جاتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ۴ر آنہ
محصولڈاک ایک سے دو تک ۸ر
سنجارک سالسہ
خون صاف کرنے کی دوا
جسم کا خون خواہ بوجہ آتشک یا اور کسی وجہ سے
بگڑ گیا ہو تو اسکے پینے سے صاف اور اچھا ہو جاتا
ہے بدن کے چکتے وست کی تبنیت۔ آنکھ ناک
گلے کے گھاؤ بار بار گلے کا سوجنا۔ جسم کا پھولنا ان
سب کی سب سے اچھی دوا ہے۔ پینے میں خوش ذائقہ
ہے قیمت فی شیشی عہ محصولڈاک ۸ر
نیناامرت انجن
اس سرمہ کی سلائی کو آنکھوں میں لگانے سے پانی
بہنا۔ جیکا۔ دھند وغیرہ امراض دور ہو جاتے ہیں۔
قیمت فی شیشی ۴ر محصول ایک سے چار تک ۸ر
کالا خضاب
بالوں کو پہلے خوب صاف دھو کر اسکو بموجب پرچہ
ترکیب لگانے سے بال کالے ہو جاتے ہیں قیمت فی شیشی مر
محصولڈاک ۸ر
گنج ناشک تیل
جن لوگوں کے سر کے بال ادھڑ ادھڑ کر گرتے ہیں
یا کمزور ہو گئے ہیں یا جن کے بال بالکل ہی اڑ گئے ہیں
انکے واسطے یہ تیل نہایت ہی مفید ہے قیمت فی شیشی عہ محصول ۱۰ر
کرن تیل
یہ دوا کان کے درد کیواسطے مشہور ہے دو چار بوندیں کان میں
ڈالنے سے ہی درد بند ہو جاتا ہے قیمت فی شیشی ۴ر محصول ۸ر
نمک سلیمانی
ہاضمہ کی دوائی ترکیب تیار کی گئی ہے

یہ نمک سلیمانی قوت ہاضمہ کو بڑھاتا ہے جس سے غذا اچھی طرح
سے ہضم ہو کر نیا اور صاف خون انسان کے جسم میں پیدا ہوتا
ہے اسکے استعمال سے بدہضمی کھٹی ڈکاریں آنا کھانا ہضم
ہوتے وقت پیٹ کا پھولنا۔ بھوک کا نہ لگنا پاخانہ صاف نہ ہونا
یہ سب شکایتیں بہت جلد دور ہو جاتی ہیں بواسیر میں بھی اسکا
استعمال بہت مفید ہے قیمت فی شیشی ۸ محصول ڈاک چھوٹی ۴ محصول ۱

دانت کی دوا

کبھی کبھی دانت یا داڑھ میں اچانک ایسا درد ہو جاتا ہے کہ
ایک منٹ گذرنا بھاری پڑ جاتا ہے لیکن ہماری دوا پھریری
سے لگا دینے سے ہی اسی وقت آرام پڑ جاتا ہے

قیمت فی شیشی ۴ محصول چار ٹکٹ ۰

کھاج کا مرہم

اس مرہم کے لگانے سے کھاج کھجلی چھاجن وغیرہ امراض بہت
جلد اچھے ہوتے ہیں یہ مرض بڑا مہلک ہے گھر میں ایک کو ہونے سے
فوراً دوسرے کو ہو جاتا ہے زیادہ عرصہ کا ہونے سے سونے
بیٹھنے اور کھانے پینے میں بھی بڑی تکلیف ہوتی ہے
ہوتے ہی اس مرض کا علاج کرنا ضروری ہے قیمت فی ڈبی ۴ محصول ٹکٹ

مہا سگندھت تیل

یہ مہا سگندھت تیل بہت اقسام کی خوشبو و مفید اشیاء سے
تیار کیا گیا ہے۔ بالوں کو بڑھانے ملائم و نیز کالے بنانے
میں نہایت مفید ثابت ہوا ہے قیمت فی شیشی عہ
محصول ڈاک ۱۵

سکھ سنچارک تیل

جن کا ناطاقتی نسوں کی کمزوری یا گرمی سے درد کرتا ہے
جن کا دماغ کام کرتے تھک جاتا ہے طالب علم وکیل
ماسٹر وغیرہ دماغی کام کرنے والوں کو نہایت فائدہ مند ہے
قیمت فی شیشی ۸ محصول ۱۰ ایک درجن علاوہ محصول للعہ

جیون سدھا سرن

جس طرح سے پیٹ کے امراض دور کرنے کے واسطے
ہمارا سدھا سندھو ہے اسی طرح سے جسم کی کمزوری سے
ہونیوالی بیماریوں کے لئے یہ جیون سدھا سرن ہے جسم
کی نسیں جب کمزور نا قابل ہو جاتی ہیں تب ہی ہاتھ
پیروں میں تھرکن تھوڑے کام سے تھکاوٹ بھوک
نہ لگنا۔ دست صاف نہ ہونا۔ کبھی کبھی سر میں درد
ہو جانا۔ بینائی کم ہو جانا۔ ہاتھوں کا کانپنا۔ کمر میں درد
ہو جانا اس قسم کی شکایتیں اور وہ امراض جن میں
آج کل کے نوجوانوں نے اپنی نادانی کی وجہ سے
مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور بعد کو کف افسوس ملنا پڑتا
ہے۔ ان کے واسطے یہ آب حیات کا کام دیتا
ہے قیمت فی شیشی عہ
محصول ڈاک ۱۰ آنہ

گھاؤ کا مرہم

زخم کیسا ہی خراب کیوں نہ ہو گیا ہو اس مرہم کو لگانے سے
اچھا ہو جاتا ہے قیمت ۴ محصولڈاک ایک یا دو ٹکٹ ۰

تمبا ذی تیل

آتشک کے زخموں کی تو یہ خاص دوا ہے مگر اور بھی

ہمانشوتیل

سوزاک کی دوا

سوزاک کی بیماری کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اس دوا سے ۴۸ گھنٹے میں جلن بند ہونے لگتی ہے سوزاک
کی وجہ سے جو کچھ تکالیف ہوتی ہیں وہ اس کے استعمال سے جاتی رہتی ہیں۔ یہ مرض پورا نا ہونے سے گٹھیا
پیشاب رکجانا وغیرہ امراض ہوجاتے ہیں۔ اسلئے مرض ہوتے ہی ہماری اس دوا کو منگا کر استعمال کیجئے۔
قیمت فی شیشی عہ محصول ڈاک ۸

سپرساری (آتشک کی دوا)

گرمی یا۔ آتشک جب انسان کے ہوجاتی ہے تو اسکا تین پشت تک اثر رہتا ہے اگر ہماری اس دوا کو
استعمال کیا جائے تو آتشک جسم میں جڑ پکڑنے نہیں پاتی جسم کے زخم چکتے وغیرہ سب دور ہوجاتے ہیں
دوا میں کسی طرح کا ذائقہ نہیں ہے اور آسانی سے پی لی جاتی ہے قیمت فی شیشی عہ ڈاک خرچ ۸

طلاء

یہ طلاء بجلی کی طرح اپنا پربھاو (اثر) دکھاتا ہے۔ نسوں کی کمزوری کے لئے بڑا ہی مفید ہے۔ تین
چار دن لگانے سے ہی نسوں میں بیحد تیزی آجاتی ہے۔ قیمت فی شیشی ۸ ڈاک خرچ ایک سے دو تک ۸

یہ طلاء نسوں کی کمزوری کے لئے مجرب اور مشہور ہے تین چار دن کے استعمال
سے اپنا اثر دکھاتا ہے۔ قیمت فی شیشی عہ ایک روپیہ۔

بادام کا تیل

یہ اصلی بادام کا تیل ہے جو فوائد بادام میں ہیں وہ سب
اسمیں ہیں دودھ میں ڈال کر پینے سے دماغ میں تراوٹ آتی ہے
ذہن اور حافظہ تیز ہوتا ہے بدن میں طاقت آتی ہے قیمت دو تولہ کی شیشی ۱۲

سیرپ باسک

یہ باسک یعنی اڑوسہ کا شربت ہے۔ دمہ و کھانسی کیواسطے
مشہور دوا ہے۔ قیمت فی شیشی عہ

کمتا بجن

اس منجن میں موتی وغیرہ ولائتی بیش قیمت اشیا پڑی ہوئی ہیں
جو آنکھوں کو نہایت ہی مفید ہیں اسکے لگانے سے آنکھوں
کی تمام بیماریاں مثلاً پانی گرنا۔ دھند۔ سرخی وغیرہ کو
آرام ہو جاتا ہے آنکھوں سے خراب رطوبت نکلنا بند
ہو جاتا ہے اور روشنی بڑھتی ہے قیمت فی تولہ للعہ

طاقت کی دوا نمبر ۱

یہ دوا ضعیف آدمی کے بڑے کام کی ہے اس سے دست
صاف ہو کر بھوک بڑھتی ہے جسم میں چستی معلوم ہوتی ہے کاہلی
اور اعضا شکنی دور ہوتی ہے
قیمت ۶۰ گولیوں کی شیشی کی عہ محصول ایک
سے دو تک ۸ر

کنٹھ مالا کی دوا

اس دوا کے پینے سے کنٹھ مالا کی گانٹھیں خشک ہو جاتی
ہیں نئی گانٹھوں کا پیدا ہونا بند ہو جاتا ہے قیمت فی شیشی عہ

کھانسی کی میٹھی دوا

یہ دوا کف کی اور خشک کھانسی دور کرنے میں نہایت مفید
ہے پینے میں شیریں خوش ذائقہ ہے اسکو بچے جوان اور
ضعیف سب خوشی سے پی لیتے ہیں قیمت فی شیشی ۱۲ر

چھالوں کی دوا

جیالے بچوں کے منہ میں ہو جاتے ہیں اس دوا کے دو یا تین
دن لگانے سے اچھے ہو جاتے ہیں قیمت فی شیشی ۴ر

پلیگ کی دوا

پلیگ نہایت خطرناک اور ایک سے دوسرے کو اثر کرنیوالا مرض ہے
اس بیماری کے مریض کے پاس لوگ جانے سے بھی خوف
کھاتے ہیں ایسی حالت میں جہاں پلیگ پھیلا ہو وہاں
اس دوا کو منگوا کر ہر ایک کو اپنے پاس رکھنا چاہیے اسکے
لگانے سے گلٹیاں بہت جلد بیٹھ جاتی ہیں اور عرق
لگانے سے ورم کم ہو جاتا ہے اور عرق جو روانہ کیا جاتا ہے اسکے
پینے سے پلیگ کا زہر دور ہو جاتا ہے قیمت تینوں قسم کی دوا عہ

لیوربل

جب کسی آدمی کا لیور بگڑ جاتا ہے تو اسکی تندرستی ایکدم خراب
ہو جاتی ہے نہ غذا ہضم ہوتی ہے نہ دست صاف ہوتا ہے جسم
کمزور اور کاہل ہو جاتا ہے اور زیادہ عرصہ تک اسی حال میں
رہنے سے پیلیا وغیرہ مہلک امراض پیدا ہو جاتے ہیں اسلئے
اسکے شروع ہوتے ہی اسکا علاج کرنا نہایت ضروری
ہے ہماری گولیوں سے مذکورہ بالا سب شکایتیں دور ہو کر
تازہ خون اصلی حالت پر بننا شروع ہو جاتا ہے قیمت ۱۲ر

پان کا مصالحہ

پان کا مصالحہ اسمیں سے تھوڑا سا لیکر پان میں کھا کر کھانے سے منہ خوشبودار ہوجاتا ہے قیمت فی شیشی ۴ محصول ایک سے دو تک ۵

دمہ کی دوا

دمہ کیسا ہی زور پر ہو مریض کیسا ہی بے چین اسکی ایک خوراک پیتے ہی آرام پا کر نیند آجاتی ہے۔ قیمت فی شیشی عہ محصول ڈاک ۵

وشن کانتی چورن

دانتوں کا ہلنا۔ میلا رہنا ٹیس مارنا۔ خون گرنا وغیرہ امراض اس سے اچھے ہوجاتے ہیں دانت موتی کی مانند صاف وچمکدار ہوجاتے ہیں قیمت ۵ محصول ایک سے دو تک ۵

پلھا پرھار

(یعنی تلی کی دوا)

پیٹ میں تلی کے ہوجانے سے دست صاف نہیں ہوتا ہے قبض کی شکایت اور بخار ہوجاتا ہے یہ دوا پینے سے دور ہوکر تلی کو بالکل آرام ہوجاتا ہے قیمت فی شیشی عہ محصول ۵ر

عرق کافور

ہیضہ کیواسطے اب یہ دوا خاص طور سے مشہور ہوگئی ہے اسلئے اسکی تعریف کرنا فضول ہے قیمت ۴ محصول ایک سے ۲ تک ۵

مالتی بھوموتر کی دوا

بھوموتر مرض لاعلاج سمجھا جاتا ہے جان لیکر پیچھا چھوڑتا ہے

لیکن اس دوا سے مریض کو فائدہ پہونچتا ہے لیکن اس دوا سے مریض کو فائدہ پہونچتا ہے جسم میں طاقت آتی ہے قیمت عہ ڈاک خرچ ۵ر

پردراری

عورتوں کے سفید پانی یا خون جانا ٹھیک وقت پر حیض نہ ہونا بچہ دانی میں کسی قسم کی تکلیف یا خرابی وغیرہ ہونا اس دوا سے جاتے رہتے ہیں علاوہ اسکے ہاتھ پاؤں میں پھڑکن جسم میں سستی وغیرہ کا ہونا بھی دور ہوجاتا ہے قیمت فی شیشی عہ محصول ۵

درد کی اپورب دوا

(خاص درد سر کے واسطے)

خواہ کسی وجہ سے آدھے سر میں یا سب سر میں کیسا ہی درد کیوں نہ ہو اسکی ٹکیا پانی کیسا نگلنے سے اسیوقت جاتا رہتا ہے صرف یہی نہیں ہو درد سے سر آدھا ہوتا ہو سر کی ٹیس جھپک سے نہایت پریشانی ہو تو اس دوا سے عجیب خیز فائدہ ہوتا ہے قیمت ۱۲ر محصول ۵ر

بواسیر کا مرہم

جنکو یہ بیماری ہوچکی ہے انکو چاہیئے کہ شکایت قبض نہ ہونے دیں دست صاف ہوتا ہے اسکی احتیاط رکھیں ہمارے بیان کا سالسہ پینا چاہیئے۔ اس مرہم کے لگانے سے خونی بواسیر بہا دی دونوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ دن میں دو یا تین بار اس مرہم کو لگانا چاہیئے۔

قیمت فی شیشی ۸ر

محصول ڈاک ۵ر

۴۲ سال کے بعد

متواتر زبردست کوشش و جانفشانی اور کافی روپیہ صرف کرنے کے بعد ہمکو اِس بیش قیمت دوا کے ایجاد کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

یوبن شکتی

یہ بیش قیمت دوا بالکل سائنسدانوں کے اصولوں پر تیار کی گئی ہے۔ کمزوری دور کرنے کی سب سے بہترین دوائیاں جو کہ آجتک سائنسدانوں نے بنایا تھیں اُن سب کا مرکب کرکے یہ دوا تیار کی گئی ہے۔ اس سے ہر قسم کی کمزوری دور ہو جاتی ہے۔ جسم میں جوانی کی تمام خوبیاں پیدا کرنے میں یہ دوا لاثانی ہے۔

جسم میں طاقت پیدا کرنیوالی اجزا جو کہ قابل سائنسدانوں نے تلاش کرکے اور ہندوستان کی آب و ہوا کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سنہری گولیوں کی شکل میں زبردست تجربہ کیساتھ تیار کی گئی ہیں جس سے کڑوی اور بد ذائقہ دوا سے بچنے والے بھی آسانی سے اس دوا کو استعمال کر سکیں۔

جو اپنی جوانی کو وقت مقررہ سے پہلے ہی برباد کر چکے ہیں یا جن اشخاص کو اپنے جسم کے اندر اور زیادہ طاقت ضرورت ہو یا بڑھاپے کی وجہ سے جسم کمزور ہو گیا ہے اور جوش جاتا رہا ہے۔ یا جن لوگوں نے جوانی سے قبل ہی اپنے ہاتھوں اپنی طاقت کو برباد کرکے زندگی کو ہیچ سمجھ رکھا ہے اور روزانہ آئے دن کمزوری کے باعث انکے سر میں درد، ہاتھ پیر دکھنے، جھنجھناہٹ اور کسی کام کے کرنیکو طبیعت نہیں چاہتی ہو دماغ کی کمزوری وغیرہ خرابیوں میں مبتلا رہتے ہیں ان سب کیواسطے یہ دوا آبحیات ہے۔ مذکورہ بالا تکالیف کے دور کرنے کی اسمیں عجیب طاقت ہے یہ گولیاں استعمال کرتے ہی روز بروز جسم میں قوت پیدا کرتی ہے۔ اسطرح رسائنک طریقوں کے ذریعہ پیدا [illegible] طاقت ہمیشہ قایم رہنے والی ہوتی ہے۔ یہ دوا جسم کو تندرست اور توانا و چست بناتی ہے۔ تمام نسوں کی کمزوری نیز اعضا کے بے حس حرکت و کمزور ہونیکو دور کرتی ہے اور چہرہ کو بارونق بناتی ہے ہر حالتمیں عورت مرد دونوں کو یکساں مفید ہے۔ امید ہے کہ اگر تجربہ منظور ہو تو ہماری محنت کو کامیاب بنانیکی غرض سے اس دوا کی آزمایش کیجئے۔ اس دوا کی ۴۰ گولیوں کی قیمت صرف ۲؍ اس غرض سے رکھی ہے کہ ہر شخص خرید کر استعمال کر سکے اسمیں بیش قیمت اشیا شامل ہونیکی وجہ سے اسکی یہ قیمت کم سے کم ہے۔

سنکھ کا کشتہ

کھانسی اور دل وجگر کی تکالیف کو دور کرتا ہے بدہضمی و قبض و دست صاف ہونے کو رفع کرکے بھوک کو بڑہاتا ہے قیمت فی تولہ ۵ ر

بنگ کا کشتہ

یہ دوا نامردی کے لئے اس قدر مشہور ہوگئی ہے کہ معمولی آدمیوں میں بھی اسکی خوبی پوشیدہ نہیں ہے۔ جن لوگوں نے دنیا کے عیش وعشرت سے ہاتھ دہو لئے ہیں انکو یہ دوا پھر قابل بنا دیتی ہے۔ جریان کو بھی مفید ہے قیمت فی تولہ عہ نمبر ۲ کی قیمت عہ تولہ

مونگے کا کشتہ

کیسا ہی جریان کیوں نہ ہو اسکے استعمال سے بالکل جاتا رہتا ہے خون کو صاف کرتا ہے۔ جسم میں سرخی لاتا ہے قیمت فی تولہ عہ ر

سورن ماکشک بھسم

سونا مکھی کا کشتہ

بواسیر کوڑھ اور مرض پانڈو کی نہایت مجرب دوا ہے قیمت فی تولہ عہ ر

آنند بھیرو رس

بخار۔ اتیسار۔ سنگرہنی کی نہایت مفید دوا ہے قیمت فی تولہ ۸ ر

ناگیشور رس

یہ شیشے کا کشتہ ہے جو ویدک میں سانس و بھوک نہ لگنے کی سب سے اچھی دوا ہے قیمت فی تولہ عہ ر

کف کنجر رس

نام ہی سے سمجھ لیجئے کف کیسا ہی ہو پتہ نہیں لگتا قیمت عہ تولہ

جیون پراس

بڑے بڑے عالی دماغ و قابل ڈاکٹر بھی اسبات کو منظور کر چکے ہیں کہ تپ دق کھانسی وغیرہ سینہ کی ایسی ہی بیماریوں کے واسطے جیون پراش سے بڑھکر دوسری دوا نہیں ہے سائنسداں ڈاکٹروں نے بھی یہ بات منظور کی ہے کہ آنولے میں طاقت زندگی بڑہانیکی قوت بھی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم رشی چیون رشی نے اپنی ضعیفی دور کرنیکے واسطے اسکو استعمال کیا تھا بیری زکام کھانسی دمہ تپ دق وغیرہ ایسے ہی امراض کی آزمودہ دوا ہے قیمت ۲۰ تولہ کی عہ

بسنت کماکر رس

اس رس میں سونا موتی وغیرہ قیمتی اشیاء کے کشتہ جات پڑے ہوئے ہیں جوکہ جسمانی قوت کو بڑہانے کی عجیب دوا ہے اور تپ دق میں بڑے لوگ اسی کو کام میں لاتے ہیں نامردی اور ضعف ودیانت میں سب سے اعلیٰ درجہ کی دوا ہے۔

قیمت فی تولہ ۵ ر

انگوری سنگھی سے تیار کیا ہوا

اگر آپ چاہتے ہیں کہ جسم میں خون اور گوشت بڑہ جائے دست صاف ہو چہرہ پر سرخی آجائے تو اسکو ضرور استعمال کیجئے تپ دق کی کھانسی اور کمزوری کی یہ خاص دوا ہے بغیر کسی مرض کے بھی پینے سے جسم میں طاقت بڑہتی ہے اور تندرستی پر اچھا اثر ہوتا ہے۔ پینے میں خوش ذائقہ ہونیکی وجہ سے سب ہی خوشی سے پی لیتے ہیں۔ پرسوت والی عورتوں کی اسکے پینے سے تمام کمزوری رفع ہوجاتی ہے ضعیف انسان جن کو بوجہ ضعیفی ایک نہ ایک مرض لگا رہتا ہے مثلاً قبض۔ کف۔ نیند نہ آنا بھوک نہ لگنا وغیرہ ایک ہی دوا ہے۔ قیمت چھوٹی بوتل ۱۲ اونس والی عہ بڑی بوتل ۲۴ اونس والی قیمت عہ ر۔ منگاتے وقت خیال رکھئے کہ بڑی بوتل کا ڈاک محصول عہ اور چھوٹی کا عہ پڑجاتا ہے اسلئے منگانے سے پہلے اپنے شہر کے دوافروشوں سے سکہ سنچار کی دواکشا سب خرید لیے نہ ملے تو پاس کو ریلوے سٹیشن کا نام لکھکر اور ۲-۴ شیشی اکٹھی منگانے تو محصول

جیور آنکش بٹی

جس طرح شیر ہاتھی کے ماتھے کو چیر پھاڑ کر ڈالتا ہے اسطرح سے ہاتھی کی مانند یہ دوا بخار کو نیست و نابود کر دیتی آنکس کی مانند ہے اسی وجہ سے اسکو جور آنکس کہتے ہیں۔ اس کے استعمال سے بخار۔ سنپاتک بخار۔ تجاری چوتھیہ۔ پرانا بخار۔ نیا بخار وغیرہ دور ہوتے ہیں۔ قیمت فی تولہ ۸

مرتونجے رس

اس دوا کی تعریف کرنا فضول ہے اس کا نام ہی اس کے فوائد کو ظاہر کرتا ہے یہ دوا سردی سے پیدا ہونے والے بخار کو رفع کرتی ہے۔ خوراک چھوٹے بچوں کو ایک گولی ۱۲ سال سے زیادہ عمر والوں کو دو گولی اور جوان آدمی کو ۳ گولی تک بخار آنے سے ۴ ۵ گھنٹے پیشتر ہر ایک گھنٹے میں ایک ایک گولی پانی یا شہد کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ ایک تولہ کے دام ۲۵ گولیوں کی قیمت ۴

جے منگل رس

یہ دوا بخار نیا ہو یا پرانا۔ تجاری۔ چوتھیہ۔ اکترا۔ وغیرہ ہر قسم کے بخار کے واسطے آب حیات ہے زیادہ کیا تعریف کیجائے۔ استعمال کرنے سے ہی اسکی خوبیاں معلوم

ہوسکتی ہیں۔ قیمت ۲۵ گولی ۸

یوگ راج گگل

بچشم خود دیکھا ہے کہ جو لوگ لقوہ کے ستائے ہوئے بات روگ کی سخت تکلیف میں مبتلا ہو کر چارپائی سے اٹھ نہیں سکتے تھے ان کو اس یوگراج کے استعمال سے حیرت انگیز فائدہ پہنچا ہے کسی قسم کی بات روگ کی تکلیف ہو گٹھیا ہو کمر یا جوڑوں کا درد وغیرہ اس سے رفع ہوجاتے ہیں۔ یہ دوا رسنادی کواتھ کے ہمراہ کھائی جاتی ہے۔ قیمت ۳۲ گولیوں کی شیشی عہ راسنادی کواتھ ۱۲ پوڑیوں کی قیمت ۸ ۳۲ گولیوں کے واسطے ۲ پوڑیاں ہونا چاہییں۔

چندر پربھا بٹی

چکتسا شاستر نے اس بٹی کی جسقدر تعریف کی ہم نے مفید بھی ویسا ہی پایا ہے اس سے سب ہی امراض علیحدہ علیحدہ ترکیب استعمال سے دور ہوسکتے ہیں گھی اور شہد کے ہمراہ کھانے سے بیس طرح کے جریان کو رفع کرتی ہے بواسیر میں یہ دوا شہد اور ادرک کے عرق کے ہمراہ عورتوں کے امراض حیض میں آشوک کی چھال کیساتھ امراض دانت و آنکھ میں زیرہ پانڈو۔ کھجلی۔ سیت۔ کمر کا درد ان امراض میں شہد و پیپل کھجور کے ہمراہ کھانا چاہیے امراض پیشاب چھارہ میں بوره کیساتھ استعمال کرنا پڑتی ہے۔ تھوڑا تھوڑا پیشاب تکلیف سے ہونا، تلی، نوطہ بڑھ جانا ان ہی امراض میں دودھ کیساتھ استعمال کرنے سے عجیب فائدہ دکھاتی ہے ۲۵ گولی والی ڈبی کی قیمت عہ

عرش ناشک بٹی

اس کے استعمال سے بواسیر کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ بواسیر خونی ہو یا بادی ہر قسم کے واسطے یہ عرش ناشک بٹی بیحد مفید ہے نیز مسوں پر لگانے کیلئے بواسیر کا مرہم بھی منگا کر لگانا چاہیئے۔ جسکی قیمت ۸ آنہ ہے۔ اسکے استعمال سے مسوں کا زور کم ہو جاتا ہے۔

مقدار۔ ایک گولی صبح ایک گولی شام کو پانی کیساتھ کھانی چاہیئے۔ قیمت ۵۰ گولی ۱۲؍

ایلادگٹکا

اس کے استعمال سے مُنہ ناک اور پاخانے کے مقام سے خون آنا۔ زیادہ پیاس لگنا۔ نیز پسلی کا درد وغیرہ امراض دور ہوتے ہیں۔

گندھک ایک گولی صبح ایک گولی دوپہر اور ایک گولی شام کو کھا کر اوپر سے مصری ملا بکری کا دودھ پینا چاہیے

قیمت ۵۰ گولی ۶ آنہ

گندھک بٹی

اِسکے استعمال سے قبض۔ بدہضمی وغیرہ امراض دور ہوتے ہیں جب ضرورت ہو دو۔ تین گولی کھایئے۔ قیمت ۴ آنہ

چندر ودیاورتی

اِس دوا کو ٹھنڈے پانی کے ساتھ پتھر پر گھس کر آنکھوں میں لگانے سے آنکھوں کے روہے، کھجلی، تمر، رتوندہ پھلی۔ دُھند۔ وغیرہ امراض کو دور کرتی ہے۔

قیمت فی تولہ ۸ آنہ۔

شول درنجنی ٹکا

یہ دوا ۸ قسم کے امراض پیلیا، تلی، گلم، املت۔ شول ہچکی کرم وغیرہ پیٹ کے امراض کے لئے مفید ہے

مقدار۔ ایک گولی صبح ایک کو شام [illegible] پانی کے ہمراہ

یا بکری کے دودھ کے ساتھ کھانا چاہیئے

قیمت ۵۰ گولی ۸؍

شنکھ بٹی۔

یہ بھی مذکورہ بالا امراض کی دوا ہے۔

مقدار۔ ایک گولی صبح ایک گولی شام کو ۳ ماشہ ادرک کے عرق کے ساتھ کھانی چاہیئے قیمت ۱؍ روپیہ تولہ

سوزاک کی گولیان

یہ گولیاں پیشاب کی جلن دور کرکے آسانی سے لاتی ہے۔ پیپ آنا جلن ہونا وغیرہ دور ہو کر سوزاک کو جڑ سے کھو کر آرام کر دیتی ہے۔ پُرانے سوزاک میں بھی مفید ہے۔

مقدار ایک سے ۴ گولی تک دن میں ۳ بار پانی کے ساتھ کھانی چاہیئے۔ قیمت ۵۰ گولی کا ۸؍

ہنگبا د بٹی

یہ ٹکیاں بدہضمی، کھٹی ڈکار آنا۔ قبض شول، اپھارہ، وغیرہ امراض شکم کو مفید ہے کھانے میں ذائقہ دار ہے۔ کھاتے ہی مُنہ کھلجاتا ہے۔ ڈکار آتی ہے۔

مقدار۔ ایک سے ۴ ٹکیاں تک ضرورت کے مطابق کھانی چاہیئے۔ قیمت فی شیشی ۴؍

دشمول کواتھ۔

[illegible] زیادہ تر بخار میں استعمال میں آتا ہے عورتوں کی پرسوت میں سردی لگنے پر بخار وغیرہ آنے میں بھی [illegible] مفید ہے اسکے علاوہ [illegible] سردی [illegible] آنا [illegible] میں بھی دیا جاتا ہے۔

مقدار۔ ۶ ماشے سے ایک تولہ تک ایک یا دو بار چھوٹی پیپل کا چورن ملا کر دن میں دو بار پینا چاہئیے۔ قیمت دس تولہ کے پیکٹ کی ۴ر آنہ

مہا منجشٹھا دکواتھ

خون صاف کرنے کی خاص دوا ہے یہ جلد اور خون کی خرابیوں کے لئے مفید ہے کنٹھ مالا، خون کی خرابی پھوڑے پھنسی، فیل پاؤں، منہ کے مہاسے وغیرہ وغیرہ امراض کے لئے از حد مفید ہے۔

مقدار۔ ½ تولہ سے ۲ تولہ تک دینا چاہئیے دس تولہ کے پیکٹ کا ۴ر آنہ

ستوپلادی چورن

جسکو زیادہ گرمی، بدہضمی، تپ ہوتی ہو، کھانسی کھانسی کے [illegible] لگا ہوا ہو اس کے لئے یہ چورن مفید ہے۔ سانس اور کھانسی دونوں کو یکساں فائدہ پہونچاتی ہے۔

مقدار ۳ ماشے سے ۶ ماشے تک صبح شام شہد میں ملا کر چاٹنا چاہیے۔ قیمت ۵ تولہ کی شیشی ۱ر

سُدرشن چورن

ویسے تو یہ چورن ہر قسم کے بخار میں مفید دوا ہے مگر شدید بخار، اور پرانی حرارت، دہات جانا، کف، بادی اور پت وغیرہ امراض کی خاص دوا ہے، کلیجہ پر جلن پیاس، کھانسی وغیرہ امراض کی اکسیر دوا ہے۔

مقدار۔ ۳ ماشے ایک تولہ تک چورن صبح شام ٹھنڈے پانی کے ساتھ دن میں دو بار کھانا چاہئیے قیمت آدھ پاؤ کی ۸ر آنہ

سوادشٹ شداورک چورن

اس چورن کے استعمال سے بھوک بڑھتی ہے کھانا ہضم ہوتا ہے پیٹ کے امراض کی اکسیر دوا ہے۔

مقدار۔ ۳ ماشے چورن کھانا کھانے کے بعد پانی کے ساتھ کھانا چاہیے۔ قیمت فی شیشی ۴ر

امرتادی چورن

جگر کی خرابی کے باعث [illegible] پیٹ صاف نہیں رہتا ہو بھوک نہیں لگتی ہو [illegible] استعمال [illegible] سب شکایت دور ہوتی [illegible] بھوک [illegible] کھانا ہضم [illegible] دست صاف ہوتا ہے جگر کی خرابی دور [illegible] ہضم ہوتا ہے یہ چورن [illegible] استعمال [illegible] سے [illegible] کے لئے [illegible] ملتی ہے ۳-۴ دن [illegible] زیادہ فائدہ ہوتا ہے [illegible] درد، چھاتی، گلا اور ہاتھ پاؤں کی جلن دور ہوتی ہے۔

مقدار ۳ ماشے سے ۶ ماشے تک ٹھنڈے پانی کیساتھ دن میں دو بار کھانا چاہئیے۔ قیمت فی شیشی ۱ر

چونسٹھ پہری پیپل۔ پرانی کھانسی، ہاضمہ کی خرابی سانس، دمہ نیز چھاتی کے امراض اور تلی بڑھ جانے وغیرہ پیٹ کے امراض میں بیحد مفید ہے۔

مقدار۔ ۲ رتی سے ڈیڑھ ماشے تک صبح شہد کیساتھ چاٹکر اوپر سے تھوڑا دودھ پینا چاہئیے۔ لال مرچ۔ تیل۔ کھٹائی وغیرہ گرم اشیاء نہیں کھانا چاہئیے۔ قیمت ایک تولہ کی شیشی ۶ر

پنچسکار چورن

یہ دست صاف ہونیکی عمدہ دوا ہے پیٹ میں جلن وانیٹھا نہیں ہوتا۔

مقدار ۴ ماشے سے آدھے تولہ تک گنگنے پانی کیساتھ دن میں ایک بار کھانا چاہئیے پہلے دن ہی دست صاف ہو جائیگا دوسرے روز کھانے کی ضرورت نہیں قیمت ۴ر

پریم ہانتک چورن

یہ چورن پرمہا امراض کو دور کرتا اور طاقت بڑھاتا ہے
دھات کو طاقتور کرتا ہے عورتوں کے پیر درد وغیرہ امراض کو
بھی دور کرتا ہے اور کمزوری کو دور کر کے طاقت بڑھاتا ہے
مقدار ۳ ماشے صبح اور ۳ ماشے شام دودھ کیساتھ
کھانا چاہئیے۔ قیمت فی شیشی عہ

ہنگا شٹک چورن

یہ مشہور عالم ہنگاشٹک چورن بہت عمدہ طریقہ سے
سے تیار کیا گیا ہے۔ بار گولہ اپھرا پیٹ پھولنا کھٹی ڈکار
آنا وغیرہ کے لئے بھی مفید ہے۔ اسکی زیادہ تعریف کرنا
فضول ہے۔ ایک شیشی جسمیں ایک چھٹانک چورن ہوتا ہے
قیمت ۸ ڈانک خرچ ۱۰

ترایھلادی تیل

اس تیل کے لگانے سے گنجے آدمی کے سر میں بال
پیدا ہو جاتے ہیں اس تیل کے استعمال کرنیوالوں کے بال
کالے ہی بنے رہتے ہیں بے وقت سفید نہیں ہوتے جسم
میں بوجہ آتشک چکتے پڑ جانا خارش ہونا۔ اور فساد خون
کیواسطے یہ تیل نہایت مفید ہے آتشک کے زخموں پر
بھی یہ تیل لگایا جاتا ہے۔ قیمت فی شیشی ۱۲ محصول ۱۰

لاچھادی تیل

یہ پرانا بخار۔ اکترا۔ تجاری۔ وغیرہ امراض میں مالش کرنے
سے بیحد فائدہ دکھاتی ہے بخار کی تیزی کو روکتی ہے دوا استعمال
کرتے وقت اس تیل کو لگانے سے بیحد مفید ہے قیمت فی شیشی
۱۲ محصول ۱۰

مہانارائن تیل

کون نہیں جانتا کہ آیور ویدک کے موجد رشیوں کی نہایت
محنت مشقت کا نتیجہ یہی تیل ہے کیسا ہی بات روگ کیوں
نہو اسکے استعمال سے باقی نہیں رہ سکتا گٹھیا۔ بکپ
بات کم وغیرہ کا درد سن بات لقوہ وغیرہ بات مرض
کے متعلق سب امراض اسکے استعمال سے دور ہوتے ہیں
اسکے علاوہ بخار میں بھی یہ تیل مفید ہے قیمت دس تولہ
کی عہ پانچ تولہ کی شیشی عہ

نارائن تیل

یہ تیل بھی مذکورہ بالا تیل کی طرح مفید ہے قیمت دس تولہ
کی شیشی عہ پانچ تولہ کی ۱۰

بش گربھ تیل

یہ تیل بھی مہانارائن تیل کی مانند مفید ہے قیمت دس تولہ
کی شیشی عہ

چندنادی تیل

یہ تیل بہت سی ادویات سے تیار کیا ہوا دماغ کی کمزوری
کو دور کر کے طاقتور بناتا ہے جن کا جسم دکھا رہتا ہے انکو اس
تیل کے لگانے سے بہت فائدہ پہنچتا ہے گرمی والے مریض کو اس سے
فائدہ پہنچتا ہے قیمت دس تولہ کی شیشی عہ محصول ۱۵

مرچادی تیل

(بہاد۔ پیر۔ کشٹھ روگ ادہکار)

جن آدمیوں کے جسم۔ چھاتی اور منہ پر جو سفید سفید
داغ ہو جاتے ہیں انکو اس تیل کے استعمال زبردست فائدہ ہوتا ہے

کچھ عرصہ کے استعمال سے داغ بالکل مٹجاتے ہیں۔
گڑ، تیل، مرچ، کھٹائی، اور زیادہ گرم، قابض اشیا نہ کھانا چاہیئے۔ سادہ غذا کھانی چاہیئے۔ اور صاف کپڑے پہننا چاہیئں۔ قیمت ۵ تولہ کی شیشی ۱۰/

وجے بھیرو تیل

(سر کے امراض کی بےنظیر دوا)

یہ تیل ویدک میں نارائن تیل سے بھی زیادہ مفید ہے۔
قیمت ۵ تولہ کی شیشی عہ

اگنی کمار رس

یہ دوا قبض وغیرہ کے لئے مشہور ہے۔ جن کو بھوک نہیں لگتی۔ پیٹ بھاری رہتا ہے۔ پیٹ میں گڑگڑاہٹ رہتی ہے۔ ہمیشہ قبض کی شکایت رہتی ہے ان کیلئے یہ بیحد مفید ہے۔ اس سے قبض، بدہضمی، شول وغیرہ امراض کو فائدہ ہوتا ہے قیمت ۸ر تولہ۔
مقدار۔ ایک گولی سے ۲ گولی تک دن میں ۳ یا ۴ مرتبہ عرق ادرک کے ساتھ کھانی چاہیئے۔

عرش کٹھار رس

یہ بواسیر کی اکسیر دوا ہے۔ پاخانہ کے مقام کا درد مسوں کا پھولنا، قبض وغیرہ امراض دور ہوتے ہیں۔ ایک گولی صبح اور ایک گولی شام ۳ ماشے شہد کے ساتھ کھانی چاہیئے قیمت ۲ر تولہ

کلپت رو رس

پرسوت کی بےنظیر دوا

یہ دوا عورتوں کے پرسوت وغیرہ امراض میں اپنا نایاب اثر
۲-۳ خوراک دوا پیٹ میں پہنچتے ہی فائدہ معلوم ہوجاتا ہے
مقدار۔ عورتوں کے پرسوت مرض میں ایک ایک گولی دن میں ۲ یا ۳ بار پان کے عرق کے ساتھ یعنی ایک پان میں دوا رکھکر کھانی چاہیئے۔ قیمت عہ تولہ

گودنتی ہرتال بھسم

دمہ، کھانسی، اور بخار کی مشہور دوا ہے۔ ایک ایک رتی بخار آنے سے ۳ گھنٹے ایک ایک گھنٹے کے فاصلہ سے ۳ خوراک شہد کے ساتھ کھانی چاہیئے۔ دمہ۔ کھانسی میں صبح شام کھانی چاہیئے قیمت ۴ر تولہ

امرتارشٹ

بخار کی دوا

اسکے استعمال سے لوٹ لوٹ کر آنے والا بخار دور ہو کر جسم میں طاقت آجاتی ہے۔ اسکے استعمال سے بیماری پڑنے کا ڈر نہیں رہتا۔ تلی جگر وغیرہ کو دور کرتی ہے اور [illegible] بڑھ جاتی ہے۔ ایک تولہ صبح اور ایک تولہ شام کو [illegible] پانی میں ملاکر پینا چاہیئے۔ قیمت ایک پونڈ کی بوتل [illegible]

اشوکارشٹ

اسکے استعمال سے عورتوں کو ایام ماہواری ٹھیک وقت پر ہونا۔ پیٹ میں درد ہونا۔ حیض کے سبب ہاتھ پیر دکھنا، کمر [illegible] ہونا، قبض، بدہضمی وغیرہ امراض دور ہوتے ہیں۔
مقدار۔ [illegible] تولہ سے ایک تولہ تک تھوڑا پانی ملاکر دن میں ۲ بار پینا چاہیئے۔
قیمت [illegible] کی بوتل عہ

کماری آسو

اسکے استعمال سے ہر وقت پیٹ میں درد ہونا پیٹ کی گانٹھیں، پتھری۔ قبض، بدہضمی، وغیرہ وغیرہ دور ہوکر جسم میں قوت پیدا کرتی ہے۔ یہ پیٹ کے تمام امراض کی بہترین دوا ہے ۲ ماشے سے ۶ ماشے تک صبح شام پانی میں ملاکر پینا چاہیئے۔ قیمت ایک پونڈ کی بوتل عہ

دشمولارشٹ

قبض، بدہضمی، جریان، پرسوت، کہانسی، دمہ، وغیرہ امراض کے لئے بیحد مفید دوا ہے۔ ۳ ماشے سے ایک تولہ تک۔ ایکتولہ پانی کے ساتھ دونوں وقت کہانا کہانے کے بعد پینا چاہیئے۔ قیمت ایک پونڈ کی بوتل عہ

سارواد یاس

یہ دوا آتشک سے بگڑے ہوئے خون کو صاف کرنے اور جسم میں نیا خون پیدا کرکے رگوں میں نئی جان ڈالتی ہے۔ گرمی اور پارہ کی خرابی سے بگڑی ہوئی تندرستی کو درست کرنے میں از حد مفید ہے۔ اس سے جگر کی خرابی درست ہوکر دست صاف ہوتا ہے۔ ہاتھ پیر اور آنکھ کی جلن۔ کہانسی۔ سانس پھول گانٹھوں کی تکلیف وغیرہ تھوڑے عرصہ کے استعمال سے رفع ہوجاتے ہیں۔ سوزاک کے سبب پیشاب کی نالی کی جلن دور ہوکر پیشاب صاف ہونے لگتا ہے سوزاک اور گرمی دونوں کے لئے یہ دوا بیحد مفید ہے۔ اگر اسکے رفع کرنے کی فکر فوراً نہ کیجاوے تو اس کے زہر سے خون خراب ہوکر کوڑھ وغیرہ ہر قسم کے جلدی امراض پیدا ہوتے ہیں اسلیئے ہوتے ہی بیماری کی فکر کرنی چاہیئے۔

مقدار۔ ایک تولہ صبح اور ایک تولہ شام تھوڑے پانی کے ساتھ پینا چاہیئے۔ قیمت ایک پونڈ کی بوتل عہ

ادویات کا کار آمد سامان

اصلی عنبر۔ یہ مشہور طاقتور دوا ہے۔ سردی کے موسم میں کھاکر اس کی بہار دیکھئے۔ قیمت فی تولہ للعہ

بھیم سینی کافور۔ کیسی ہی گرمی پڑتی ہو ایک چاول برابر پان میں رکھکر کھائیے دماغ تک تراوٹ پہنچتی ہے۔ قیمت ۱۲ ار تولہ۔

اصلی مشک۔ فی تولہ للعہ

اصلی زعفران۔ سہ ر تولہ

اصلی سلاجیت۔ سہ ر تولہ

چاندی کے ورق۔ ۴ر فی سینکڑہ۔

سونیکے ورق۔ ۱۲ سینکڑہ۔

سچے موتی۔ باریک موتی ۲۵ ۳۵ للعہ تولہ۔ موٹے

ولایتی ادویات

پیپرمنٹ کا تیل

ایک اونس کی شیشی کی قیمت سہ ر چھوٹی شیشی ۱۰ ار ڈاک محصول ۴ر آنہ

پیپرمنٹ کا عرق

ایک اونس کی شیشی کی قیمت ۱۲ ار چھوٹی شیشی ۶ ر

پیپرمنٹ کا ست یا پھول

قیمت بڑی شیشی عہ ۱۲ ر چھوٹی شیشی ۴ر آنہ

عرق پودینہ

قیمت فی شیشی ۱۲ ار چھوٹی شیشی ۶ ر

[illegible]

منیتھل

جب سر میں درد ہو۔ گرمی سے سر چکرا رہا ہو تو اسے رگڑ دینے سے تراوٹ آجاتی ہے۔ سر یا نسوں کی کمزوری سے درد ہو تو اس سے فائدہ ہوتا ہے قیمت فی شیشی ۴ر ڈاک محصول ۸ر

کھٹائی کا سار

یہ کھٹائی کا ست ہے جہاں جہاں آپکو کھٹائی ڈالنے کی ضرورت ہو اسمیں سے تھوڑا سا ڈال دیجیے۔ کھٹائی کا مزہ آجاویگا قیمت فی شیشی ۔ محصولڈاک ۸ر

کلوروڈن

اینٹھا۔ ہیضہ۔ دست۔ نشہ۔ روکنے کی مشہور دوا ہے قیمت فی شیشی ۸ ڈاک محصول ایک سے ۳ تک ۸ر

ادویات کے تیل

اجوائن کا تیل قیمت	۶ر	سونف کا تیل	۶ر
لونگ کا تیل	۶ر	لیموں کا تیل	۶ر
الایچی کا تیل	۶	دال چینی کا تیل	۶ر

لونیڈر کا تیل ۔

اصلی عطر صندل۔ یہ سوزاک کی مشہور دوا ہے قیمت ۱۲ر

ہیزلین

(خون بند کرنے کی دوا)

منہ سے خون گرتا ہو۔ بواسیر کے سبب خون جاتا ہو۔ عورتوں کے ایام ماہواری میں ضرورت سے زیادہ خون جاتا ہو غرضکہ جسم کے کسی حصہ سے ضرورت سے زیادہ خون جاتا ہو اسمیں پانچ پانچ بوند کی دو تین خوراک پینے سے خون بند ہو جاتا ہے قیمت فی اونس ۔ محصولڈاک ۸ر

کونین کی ٹکیاں

ان ٹکیوں سے سب طرح کا بخار۔ پرانا بخار۔ اکثرا بخاری جوتھیا۔ وغیرہ دور ہوتے ہیں قیمت ۱۰۰ ٹکیاں ۱ محصول ۲ آنہ
کونین کی میٹھی ٹکیاں ۱۰۰ کی قیمت ۱ر

مٹھائی کا سار

رسائنک [illegible] ست جیسا [illegible] ثابت ہو چکا ہے یہ کھانڈ کے مقابلہ میں سار [illegible] سو گنا میٹھی ہے اسکو آپ چور۔ کافی۔ میوہ۔ شربت۔ دودھ۔ دہی۔ چینی کوان وغیرہ جہاں جہاں شکر ڈالنے کی ضرورت پڑتی ہے خوشی سے ڈالیے۔ برابر میٹھے کا کام دیگا۔ [illegible] اور بدذائقہ دوا میں اسے ملانے سے انہیں مٹھاس آ جائیگا۔
قیمت بڑی شیشی ایک اونس کی شیشی ۔ چھوٹی شیشی تولہ کی ۸ر

سودیشی عطر

یہ سب عطر اصلی صندل میں منگاتے وقت قیمت اور وزن ضرور لکھیے۔ قیمت نہ لکھنے پر ۱ تولہ کا بھیجا جاویگا۔
گلاب۔ کیوڑہ۔ حنا۔ موتیا۔ چمپا۔ جوہی۔ چمیلی۔ بیلا۔ خس۔ مولسری قیمت ۱ سے ۵ تک تولہ جو عطر جتنا زیادہ قیمتی ہوگا خوشبو بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

خوشبودار تیل

ہمارے یہاں ہر قسم کے تیل موجود ہیں۔ جس خوشبو کا چاہے منگا لیجئے لیکن قیمت پیشگی آئے بغیر تیل نہیں بھیجا جاتا۔ اور آدھ سیر سے کم کوئی تیل نہیں بھیجا جاتا۔

برگونٹ سالس پیرلا قیمت ۲؍
بلکنسن سالس پیرلا " ۳؍
۲۰ پرسنٹ کاربولک سوپ " ۱۵؍
۳۶ " " " " ۶؍
کیوٹی کیورا سوپ چرم روگ کی دوا ۱۱؍
سلفر سوپ (کھجلی کی دوا) ۸؍
اینٹی سیپٹک سار (چرم روگ کے لئے) ۵؍
ڈولیا سوپ دام فی ٹکیہ ۶؍
گولڈن گلوریا سوپ " ۸؍
کاربولک ٹوتھ پاوڈر " ۷؍
یوکلپٹس اوئل فی اونس ۶؍
ادویات کا سامان
امراض معلوم کرنیکا آلہ بڑا کانچ لگا ہوا قیمت
دوا تولنے کی ترازو مع اوزان "
آنکھ میں دوا ڈالنے کی پچکاری " ۱؍
دودھ میں پانی جانچنے کا آلہ " ۸؍
بچوں کے چوسنے کے چھلے " ۶؍
عرق ناپنے کا گلاس ایک اونس " ۶؍
" " " ۲ " ۸؍
ڈش پیٹ صاف کرنیکا آلہ "
پیٹ صاف کرنیکی پچکاری "
پچکاری کانچ کی
کان دھونے، زخم دھونے وغیرہ سب ہی کام کے لئے مفید ہے دام مردانی ۶؍ زنانی ۸؍
چھاتی سے دودھ نکالنے کا آلہ قیمت
پانی کی بوند ناپنے کا آلہ یعنی منم گلاس " ۶؍
آنکھ دھونے کا آلہ
یہ پیالہ کے مانند ہے صاف پانی یا گلاب جل وغیرہ کسی دوا سے آنکھ دھونی ہو تو اس میں بھر کر آنکھ پر لگا لیجئے ایک بوند بھی پانی نہ بہیگا آنکھ دھل جائیگی قیمت ۴؍
تصویر یہ ہے
نقلی آنکھ
آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نقلی آنکھ کے لگانے سے انسان کی گئی ہوئی آنکھ کی خوبصورتی پھر سے آجاتی ہے لیکن اس کے ذریعہ دیکھنا نہیں ہو سکتا۔ ایسی لگتی ہے دوسرا آدمی نہیں پہچان سکتا۔ آنکھ اصلی ہے یا نقلی قیمت فی آنکھ عہ
تصویر آنکھ یہ ہے
بخار دیکھنے کا تھرمامیٹر
95 100 5 110
آجکل اسکی ہر گھر میں ضرورت ہے ایسا کوئی گھر نہیں جہاں بخار نہ آتا ہو اسکو ایک منٹ تک بغل میں یا منہ کی نلی کی طرف سے دبا کر دیکھنے سے جتنا پارہ چڑھے اسکو نیچے لکھے حساب سے سمجھ کر بخار سمجھو ۹۸ ۴/۵ تک تندرست اور جتنا بڑھے اتنے ہی درجہ کا بخار ہے قیمت جرمنی

ہندی کا تھرمامیٹر ۸ جیل کا ۲ ہننک کا ۱۲ اور ٹومیٹک ۸

سُکھ سنچارک کمپنی متھرا کا

خوشبودار حصّہ

یوں تو سبھی لوگ خوشبو وغیرہ بیچتے ہیں لیکن اُن سب کے اندر کیا بھرا ہوتا ہے۔ اِس بات کو نہ تو بہت سے دکاندار ہی سمجھتے ہیں اور نہ بیچارے بھولے بھالے خریدار ہی سمجھتے ہیں ہمنے اسی تکلیف کو دور کرنے کی غرض سے اپنے یہاں خوشبودار حصہ بھی قائم کرلیا ہے آپکو کسی قسم کی خوشبو کی کوئی چیز بھی چاہیئے تو پہلے لکھئے ہم سے بھاؤ منگایئے۔ نمونے منگا کر دیکھئے دیسی صندلی عطروں کا استعمال اسی فہرست میں دواؤں کے تیل کے نیچے آگیا ہے۔ اسلئے یہاں نہیں لکھا وہاں ہی دیکھئے

رُوحیں یعنی سار بھاگ

رُوح گلاب ۲۵ر، ۱۴ر، ۱۲ر، ۵ر، ۲ر، ۱ر تولہ
رُوح خس ۱ر، ۳ر، ۱۴ر، ۵ر، ۴ر تولہ
رُوح پانڑی ۱ر، ۳ر، ۱۴ر تولہ

تیل بنانے کے سینٹ

یہ سینٹ بہت ہی اونچے درجہ کے ہونیکے سبب بہت تھوڑی مقدار میں ملانیسے خوشبودار تیل تیار ہوجاتا ہے آجکل جو بازار میں تیل بکتے ہیں وہ انہیں سینٹوں کے ذریعہ تیار ہوتے ہیں دکانداروں کو اس عمدہ خوشبو سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

گلاب	فی اونس	۱۲ر	مشک	فی اونس	۸ر
چمیلی (جیسمین)	،،	۱۲ر	چمپا	،،	۸ر
نرگس	،،	۸ر	لوینڈر	،،	۸ر
نیرولی	،،	۸ر	درگومیٹ	،،	۸ر
ہائی سنتھ	،،	۸ر			

اصلی عرق گلاب

یہ عرق اتنے اونچے درجہ کا ہے کہ جسکو سونگھتے ہی آپکا دماغ تر ہوجائے گا عرق گلاب رومالوں اور کپڑوں میں چھڑکنے کے سوائے محفلوں میں چھڑکنے آنکھ میں ڈالنے پانی میں ڈالکر پینے وغیرہ کاموں کے لئے بہت ہی مفید ہے قیمت آدھ پاؤ کی شیشی ۸ر

شربت بنانے کے لئے

پھل پھولوں کا سار

اس سار کے ذریعہ آپ چاہے جس طرح کا شربت فوراً تیار ہوجاتا ہے اِس قسم کے شربت فائدہ اور خوشبو میں عمدہ ہوتے ہیں بیوپاریوں کو شربت منگانے میں ریلوے خرچ نہیں دینا پڑتا۔ ایک ایک اونس کی یعنی قریب ڈھائی تولہ کی شیشی جس سے ۲ بوتل شربت تیار ہوتا ہے قیمت ۸ر مندرجہ ذیل میں سے جو پسند ہو منگائیے۔

گلاب کیوڑہ خس سنگترہ انگور
آڑو ربھری سیب آم کیلا
انناس سونف سونف انار لیمو
بادام آئسکریم سوڈہ شربت میں ملانیکے رنگ
ہرا۔ لال۔ نارنگی قیمت ۶ر اونس۔

متھرا کے چورن چٹنی
اور اچار و مربّے

جہاں دہوتی۔ شرنگار انگوچھے وغیرہ مشہور ہیں وہاں اچار چورن چٹنی وغیرہ بھی مشہور ہیں ہم اپنے خریداروں کی فرمائش کے مطابق بازار سے خرید کر بھیجتے تھے لیکن اب ہمنے اپنے یہاں ہی چورن وغیرہ کا کارخانہ کھولدیا ہے جو ایک تجربہ کار ویدکی نگرانی

میں تیار کرنے کے سبب بے حد مفید چیز ہے امید ہے کہ آپ انکو منگا کر اور استعمال کرنے کے بعد خوش ہوں گے۔ بہ ضرور خیال رہے کہ چورن اچار مربّہ تیل کپڑا اور چہرہ یہ سب سامان ریلوے سے ہی بھیجا جاتا ہے۔ اس لئے منگاتے وقت ریلوے اسٹیشن کا نام اور تھوڑا روپیہ بھی پیشگی بھیجئے ڈاک سے منگانا ہو تو خط میں صاف لکھیئے۔

پاچک چورن

نام	قیمت فی سیر
انار دانے کا چورن	عہ
آک کے پتوں کا چورن	؎
زیرہ کا چورن	عہ/
دھنیئے کا چورن	عہ/
کالی مرچ کا چورن	عہ
سفید مرچ کا چورن	عہ/
سونٹھ کا چورن	عہ/
سونٹھ کے پترے مصالحہ دار	عہ/
املویت کا چورن	عہ/
ہر نیبو کے رس کی	عہ/
ہر کا چورن	عہ/
لونگ کا چورن	عہ/
سونف کا چورن	عہ/
الائچی کا چورن	عہ/
کچریا کا چورن	عہ/
پودینہ کی چٹنی	۸/
مولی کھار کا چورن	۸/
جوا کھار کا چورن	۸/
پیپل نیبو کے رس کی	[illegible]
ٹینٹی کا چورن	عہ/

جل زیرہ کا چورن

اس چورن میں سے ۲ ماشہ لیکر مٹی یا کانچ کے گلاس میں چھٹانک بھر پانی میں ڈالکر پینے سے بے حد ذائقہ دار پانی جل زیرہ کا تیار ہوتا ہے جس کے پیتے ہی طبیعت خوش ہو جاتی ہے کھٹی ڈکار بدہضمی وغیرہ دور ہوتی ہے قیمت عہ/ سیر

مربّے

مندرجہ ذیل مربّے ہمارے یہاں عمدہ پھلوں کے صاف تیار ہوتے ہیں۔ انکو ضرور منگا کر امتحان کیجئے ایک سیر سے کم نہیں بھیجے جاتے اسکی قیمت کے علاوہ ٹین کے ڈبے کے دام ۳ر اور لکھیں کہ منگاتے وقت اسٹیشن کا نام اور چوتھائی قیمت ضرور بھیجنا چاہئے

نام	قیمت فی سیر
آم کا مربّہ	عہ/
سیب کا مربّہ	۸/ ۴/
بیلگری کا مربّہ	عہ/
ہڑ کا مربّہ	۸/
انگور کا مربّہ	للعہ/
سپاری کا مربّہ	سے للعہ
آنولہ دیسی کا مربّہ	عہ/
آنولہ بنارسی کا مربّہ	عہ/ ۸/
چندن کا مربّہ	۸ سے
پونڈا دگنے کا مربّہ	عہ ۱۱/
انناس کا مربّہ	سے/ للعہ
بنارسی لکڑی کا مربّہ	سے/ للعہ

بڑھیا اچار

مندرجہ ذیل اچار وغیرہ ایک سیر سے کم نہیں بھیجے جاتے ایک سیر کی قیمت کے علاوہ ۳ر ڈبی وغیرہ کے دام اور لگیں گے منگانے وقت ریلوے اسٹیشن کا نام اور چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنی ہوگی۔

نام	قیمت فی سیر
نیبو مصالحہ دار	۱۲/
نیبو ڈورما	۱۴/
چھوارے مصالحہ دار	۱/
نورتن چٹنی	۱/
آم بھرے ہوئے	۱۲/
آم کی اچاری	۱۲/
ٹینٹی نیبو کے رس کی	۱/
ٹینٹی تیل و پانی کی	۸/
مصالحہ بھری مرچ	عہ/
کریلا و ادرک	۱۲/

بھوگلی یعنی ناک چھبی

یہ عورتوں کے ناک میں پہننے کا مشہور زیور ہے سُونے کی خوبصورت ڈائمنڈ کٹ کی اور جڑاؤ بنی ہوئی ہیں اُوپر امیٹیشن ہیرا، موتی وغیرہ جڑے ہوئے ہیں قیمت ڈائمنڈ کٹ اور جڑاؤ کی ۸/ ۱۲/ ۱/ ۱؁ ۱۲؁ ۱۲ ؂ ۲؁

سُودیشی سنہری انگوٹھیاں

نمبر ۳۱ — نمبر ۳۲ — نمبر ۳۳ — نمبر ۳۴ — نمبر ۳۵

نمبر ۳۶ — نمبر ۳۷ — نمبر ۳۸ — نمبر ۳۹ — نمبر ۴۰

نمبر ۴۱ — نمبر ۴۲ — نمبر ۴۳ — نمبر ۴۴ — نمبر ۴۵

یہ انگوٹھیاں اُوپر لکھے نمبروں کی ہم نے خاص طور پر تیار کرائی ہیں جو دیکھنے میں سُونے کی مانند معلوم ہوتی ہیں۔ ناپسند ہونے پر قیمت واپس دیجاتی ہے۔ قیمت فی انگوٹھی ۴ر یہ انگوٹھیاں سچی نہیں ہیں۔

تصویر والی نگدار انگوٹھیاں

ان انگوٹھیوں میں اُوپر نگ جڑے ہوئے ہیں۔ اور نیچے ہندو دیوتاؤں کی تصویریں لگی ہیں۔ انگوٹھیوں پر سُونے کی گلٹ ہو رہی ہے قیمت فی انگوٹھی ۴ر

درشنی انگوٹھیاں

ان انگوٹھیوں میں ہندو دیوتاؤں کے بہت قسم کی تصویریں ہیں۔ ان کے علاوہ مشہور لیڈران کی بھی تصویریں ہیں۔ ان انگوٹھیوں میں ملیں گی قیمت ۱؁ر درجن ۶ انگوٹھیوں سے کم نہ بھیجی جاوینگی۔ ایکدرجن کا ڈاک خرچ ۸ر

گاڑنے کے جاپانی آفس کلاک

یہ آفس کلاک ایکبار چابی دینے سے ۸ روز چلتے ہیں۔ گھنٹا اور آدھا گھنٹا بجتا ہے گارنٹی تین سال
نمبر ۶۱۵ - ۱۰ انچ کا ڈائل قیمت ۱۲ؔ
نمبر ۶۱۶ - ۸ انچ کا ڈائل قیمت عہ ر
آفس کلاک منگاتے وقت ۵ؔ پیشگی بھیجیے اور پاس کے ریلوے اسٹیشن کا نام لکھیے۔

ٹپنیگ الارم ٹائم پیس
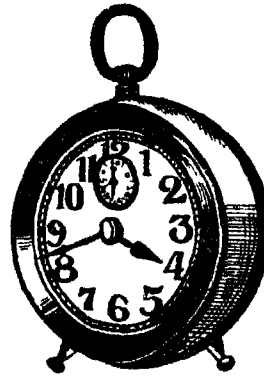
نمبر ۶۶۱ یہ ٹائم پیس بناوٹ میں بگوین کے مانند ہے چلنے میں بہت مضبوط اور سچی ٹائم بتانیوالی ہی ایکبار چابی دینے سے ۲۴ گھنٹے چلتی ہے
الارم بھی دیر تک بجاتی ہے۔ قیمت سے گارنٹی ۳ سال۔
نمبر ۶۶۴ شیکوشا کمپنی کا انسٹرمینٹ پیٹر الارم ٹائم پیس قیمت للعہ
نمبر ۶۶۵ - یہی ریڈیم ڈائل قیمت صہ ر

جرمنی بی ٹائم پیس

نمبر ۶۵۰ یہی ٹائم پیس دیکھنے میں انسونیا کمپنی کی بی ٹائم پیس کے مانند ہے چابی چوبیس گھنٹے کی ہے قیمت عہ ر

انسونیا ٹاپ بی ٹائم پیس

نمبر ۶۶۳ - یہ ٹائم پیس بالکل انسونیا ٹائم پیس کمپنی کے موافق ہے۔ اسی طرح کی چابی ہے ویسی ہی ٹین کی ڈبی میں ہے جرمنی سے خاص آرڈر دیکر بنوائی ہے قیمت ہے گارنٹی دو سال۔
نمبر ۶۴۷ - برما الارم ٹائم پیس۔ اِس ٹائم پیس کا ڈائل ۴ انچ کا ہے چلنے میں قیمت کے دیکھنے بہت اچھا ہے قیمت سے ر
نمبر ۶۴۶ - یہی ڈبل الارم یعنی دوہری گھنٹی کا ہے عہ ر

جوکر ٹائم پیس نمبر ۶۴۳

یہی ٹائم پیس دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے تین طرف کانچ لگے ہیں اور اوپر ڈائل کے آس پاس پھول پتی
نہایت خوشنما بنے ہوئے ہیں گھنٹہ اور آدھا گھنٹہ بجاتی ہے جرمنی کا بنا ہوا قیمت عہ گارنٹی ۲ سال نمبر ۶۶۸ یہی جاپانی شوکشا کمپنی کی قیمت معہ ر نمبر ۶۶۹ - الارم کے وقت باجا بجاتی ہے جاپانی قیمت ۸ؔ

نالیور واچ

نمبر۱۱۰۱ اسستی گھڑیوں میں یہ سب سے اچھی ہے شبس لیور ہونے سے چلنے میں مضبوط ہے کھلا منہ سرے پر چابی سیکنڈ کی سوئی قیمت ۵ ؍ گارنٹی ایک سال۔

نمبر۱۱۰۲ - ۱۵ لائن سائز ۴ جویل قیمت ۱۲ ؍

امریکن لیور واچ

نمبر۱۰۱۵ یہ گھڑیاں امریکہ کے مشہور کارخانے کی بنی ہوئی ہیں۔ ایکبار چابی دینے سے ۳۰ گھنٹے چلتی ہے کھلا منہ سرے پر چابی گارنٹی ایک سال

قیمت پانچ روپیہ

ویکلی وائنڈنگ واچ

(آٹھ روزہ چابی کی گھڑی)

نمبر۱۰۱۴ اس گھڑی میں ایکدن چابی دینے سے ایک ہفتہ کی فرصت ہوجاتی ہے روزانہ چابی دینے سے نجات ملجاتی ہے گھڑی کی بناوٹ تصویر کے موافق ہے گارنٹی ۳ سال قیمت نکل یعنی سفید دھات کی قیمت ۸ ؍ یہی بڑھیا ہیوڈوس میکر کی عل کس کی قیمت ۱۰ ؍

چاندی کا کیس کھلا منہ قیمت ۱۰ ؍

ہیوڈوس میکر چاندی کی ۱۲ ؍

چاندی کا کیس سنڈ ڈھکن کی ۱۵ ؍

کلینڈر واچ
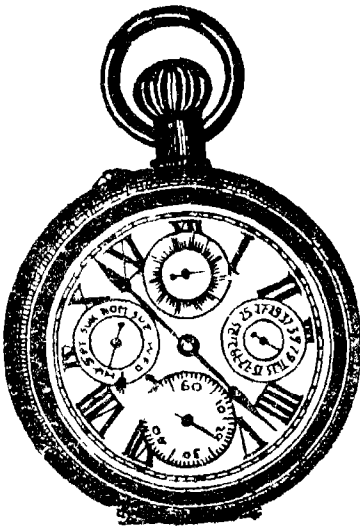
نمبر۱۰۱۷ روانچ سفید دھات کا کیس نہات عمدہ لیور کھلا منہ سرے پر چابی ایک بار چابی دینے سے گھنٹہ منٹ کے علاوہ دن تاریخ مہینہ اور چاند کا گھٹنا بڑھنا بھی معلوم ہوتا ہے قیمت ۱۲ ؍

راسکوپ سسٹم مشینوں کی جیبی گھڑیاں
یہ سب گھڑیاں سوئزرلینڈ کی بنی ہوئی مشین کی ہیں
ایکبار چابی دینے سے ۲۴ گھنٹے چلتی ہیں
نمبر ۲۰۱ روشنی واچ
نمبر ۱۰۰۴ کھا
نمبر ۱۰۰۴ اک
نمبر ۲۰۱ یہ گھڑی ریلوے کمپنی کی تصویر کے مطابق ہے
راسکوپ سسٹم مشین رات میں بجھ جانے کے وقت
بتانے والی قیمت صرف سکنڈ کی سوئی والی
قیمت
نمبر ۱۲۹۳ فینسی رلیف واچ
نمبر ۴ اک یہ ریلوے ریگولیٹر گھڑی ایک خوبصورت کیس
میں بنی ہوئی ہے کھلا منہ سر سے پر چابی ایکبار چابی دینے سے
۳۰ گھنٹے چلتی ہے بغیر سکنڈ کی بغیر ریلوے ٹھاک کی قیمت
نمبر ۱۰۰۴ کھا یہی سکنڈ کی سوئی والی
نمبر ۱۰۰۴ اک یہی سنہری گلٹ سکنڈ کی سوئی قیمت
نمبر ۱۰۰۵ ریلوے ریگولیٹر قبضہ دار ڈھکن دوسرے
ڈھکن میں کانچ لگا ہوا بغیر سکنڈ کی سوئی - ۱۵ اور ۱۶
لائن سائز سسٹم مشین قیمت
سستی راسکوپ سسٹم واچ
نمبر ۱۰۹ یہ ایک بار چابی
دینے سے ۲۴ گھنٹے چلتی
ہے
اس میں صرف ایک جوایل لگا
ہوا ہے
قیمت یہی چھوٹے سائز کی قیمت
نمبر ۱۲۹۳ میٹل کیس رنگین خوبصورت تصویر کے
مطابق ہے ڈائل نہایت فینسی قیمت
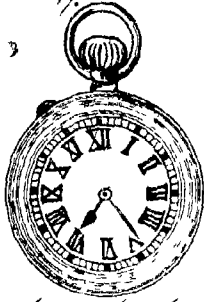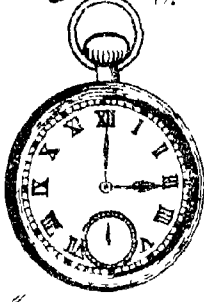
پیٹنٹ واچ

ہندوستان کا بچہ بچہ اس گھڑی کی عمدگی کو جانتا ہے جب نقلی راسکوپ یعنی اسکوپ سسٹم کے نام سے لاکھوں گھڑیاں بازار میں بکجاتی ہیں تو اصلی کی عمدگی آپ سمجھ ہی سکتے ہیں۔ باوا اور پونا برتتے وہ یہی گھڑی ہے قیمت ۱۲ لائن سائز [illegible] ۱۶ لائن سائز سکنڈ کی سوئی [illegible] ۱۵ لائن سائز [illegible] بند ڈھکن کی [illegible]

بڑھیا ریلوے شیپ راسکوپ سسٹم واچ
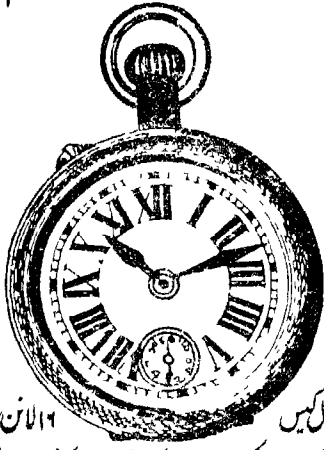
نمبر ۱۰۱۱ نکل کیس ۱۶ لائن سائز موٹا کانچ دوہرہ ڈھکن ۷ جوئیل سیکنڈ کی سوئی قیمت [illegible]

نمبر ۱۰۱۲ یہی ۱۰ جوئیل والی [illegible]

نمبر ۱۰۱۳ یہی ۱۵ جوئیل کی بڑی مضبوط [illegible]

راسکوپ پیٹنٹ رسٹ واچ

۱۳ لائن سائز لیور ۱۵ جوئیل قیمت [illegible]

رسٹ واچ یعنی کلائی پر باندھنے کی گھڑیاں

ایک جوئیل سلینڈر مشین کی رسٹ واچیں گارنٹی ایک سال

ہر ایک کے ساتھ میں کلائی پر باندھنے کا چمڑا مفت
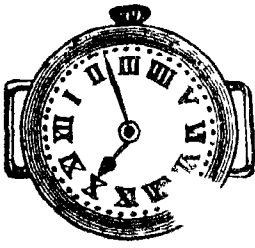
نمبر ۵۱۱ کالے ڈائل کی رسٹ واچ

سفید دہات کا کیس کالا، نیلا، ہرا و سرخ ریڈیم ڈائل سیکنڈ کی سوئی قیمت [illegible] نمبر ۵۱۱ کہا۔ سنہری کیس [illegible] نمبر ۵۱۱ گ۔ چاندی کے کیس کی قیمت چھ روپے چار آنے۔

نمبر ۵۰۳ ریڈیم رسٹ واچ
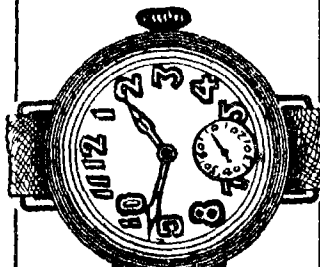
نکل کیس سیکنڈ کی سوئی اندھیرے میں وقت بتانے والی [illegible] نمبر ۵۰۳ کہا۔ سنہری [illegible] کی قیمت [illegible] نمبر ۵۰۳ گ۔ چاندی کے کیس کی قیمت [illegible]

نمبر ۵۰۱ میٹل رسٹ واچ

نکل کیس سلینڈر بلا سیکنڈ قیمت [illegible] نمبر ۵۰۱ کہا۔ یہی سنہری گلٹ کی ہوئی [illegible] نمبر ۵۰۱ گ۔ چاندی کے کیس کی [illegible]

ا جوئل کی سلینڈر مشین کی رسٹ واچیں

نمبر ۲۰۵ چوکور رسٹ واچ
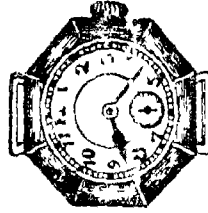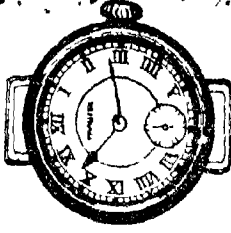
نکل کیس سلینڈر سکنڈ کی سوئی سادہ ڈائل قیمت [illegible]

نمبر ۲۰۵ کہا۔ یہی ریڈیم ڈائل [illegible]

نمبر ۲۰۵ گ۔ یہی سنہری گلٹ کی قیمت ۶/ ے

نمبر ۲۰۴ آٹھ پہلو رسٹ واچ

نکل کیس سلنڈر سکنڈ کی سوئی سادہ ڈائل قیمت [illegible]

نمبر ۲۰۴ کہا یہی ریڈیم ڈائل قیمت [illegible]

نمبر ۲۰۴ گا یہی سنہری گلٹ کی قیمت ۶/ ے

نمبر ۵۱۲ … واچ

نکل کیس سلینڈر سکنڈ کی سوئی قیمت [illegible]

نمبر ۵۱۲ د یہی سنہری گلٹ کی قیمت [illegible]

نمبر ۵۱۲ دگ یہی چاندی کے کیس کی قیمت ۶/ ے

نمبر ۵۳۲ میراج فینس رسٹ واچ
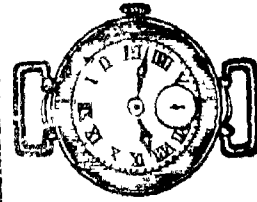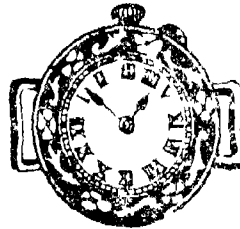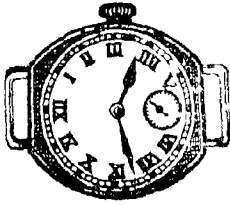
نکل کرومم کیس سلینڈر سکنڈ کی سوئی بہت خوبصورت سادہ ڈائل قیمت [illegible]

نمبر ۵۳۲۔ یہی سنہری گلٹ کی قیمت [illegible]

میے کے کام کی رسٹ واچ

نکل کیس سنڈ اوپر کے ڈھکن پر تصویر کے موافق خوبصورت بنے کا کام ہو رہا ہے یہ اٹھ پہلو چوکور اور گول تین طرح کی ہوتی ہیں قیمت تینوں کی یکساں ہیں۔ قیمت [illegible]

نمبر ۵۰۹ ٹونو شیپ رسٹ واچ

نکل کیس سکنڈ کی سوئی سلینڈر مشین قیمت [illegible]

نمبر ۵۰۹ کہا ریڈیم [illegible]

نمبر ۵۰۹ گ یہی سنہری گلٹ ریڈیم ڈائل قیمت [illegible]

سیپ … ٹ واچ
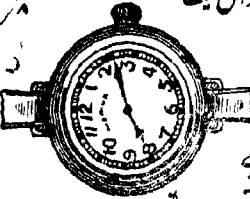
ان رسٹ واچوں میں اوپر کا حصہ سب … سنہری گلٹ ہو رہی ہے یہ گول، چوکور اور اٹھ پہلو ۳ طرح کی آتی ہیں قیمت سب کی یکساں ہے قیمت [illegible]

نمبر ؟ ج فیشن

یہ تصویر کے موافق ٹونو فیشن کی بنی ہے سونے کی گلٹ ہو رہی ہے قیمت للعہ/

نمبر ۵۱۹ چوکور میراج رسٹ واچ

یہ تصویر کے موافق چوکور ڈائل کی میراج فیشن کی بنی ہے سونے کی گلٹ ہو رہی ہے قیمت للعہ/

نمبر ۵۱۰ گول میراج رسٹ واچ
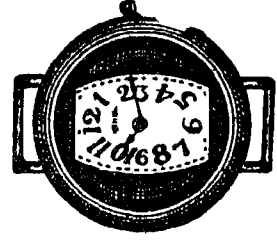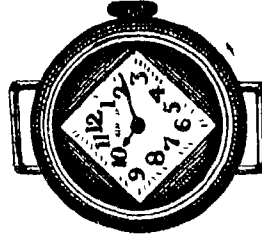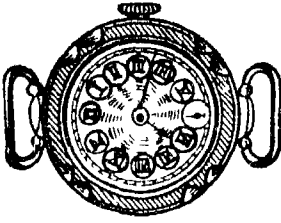
اسکے ڈائل کے حروف تصویر کے موافق بہت خوبصورت بنے ہوئے ہیں اوپر دمکتی ہوئی سونیکی گلٹ ہو رہی ہے قیمت للعہ/

براسلیٹ واچ

براسلیٹ واچ نگدار

نمبر ۱۰۲۲ کھا۔ یہ بھی نمبر ۱۰۲۲ اک کے مطابق ہے اس گھڑی میں چاروں طرف تصویر کے موافق دمکتے ہوئے نگ جڑے ہوئے ہیں۔ جس کے سبب اُس کی خوبصورتی بہت بڑھ گئی ہے قیمت ۶ے/

براسلیٹ واچ سادہ

نمبر ۱۰۲۲ اک عورتیں اس گھڑی کو بہت پسند کرتی ہیں ان میں اسپرنگ لگی ہونے کے باعث چاہے جیسے چھوٹے بڑے ہاتھوں میں پہنی جاسکتی ہیں انکی بناوٹ تو خوبصورت ہے ہی اوپر سونے کی گلٹ ہونے سے بہت ہی عمدہ معلوم پڑتی ہے سلینڈر مشین قیمت معہ/
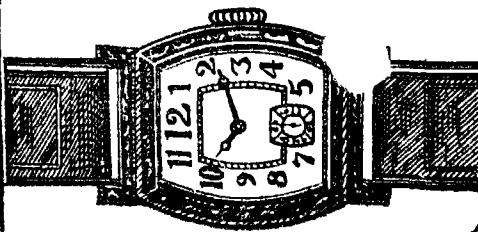
ہورن لیس رسٹ واچ

نمبر ۵۰۵ اِس فیشن کی رسٹ واچیں آجکل کے شوقین بہت پسند کرتے ہیں اِس میں چوڑا فیتہ باندھا جاتا ہے۔ سلینڈر مشین سیکنڈ کی سوئی سفید دھات کا کیس قیمت سے/

نمبر ۵۰۵ کھا۔ سنہری گلٹ کی قیمت معہ/

ہورن لیپس رسٹ واچیں
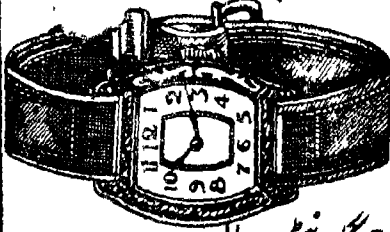
نمبر ۵۲۴ یہ گھڑی تصویر کے مطابق بہت خوبصورت فیشن
کی بنی ہوئی ہے۔ سلینڈر مشین بغیر سکینڈ کی سفید دھات کا
کیس قیمت [illegible]
نمبر ۵۲۵ سنہری گلٹ کی ہے

نمبر ۱۰۲۱ ویکلی رسٹ واچ گارنٹی ۳ سال
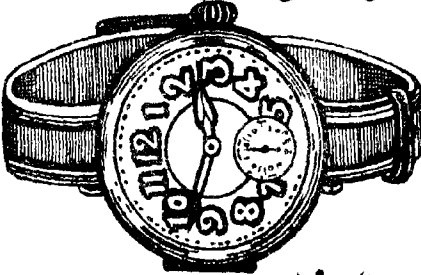
یہ رسٹ واچ ایکبار چابی دینے سے ایک ہفتہ تک چلتی ہے
روزانہ چابی دینے کی دقت نہیں اٹھانی پڑتی لیور مشین
سیکنڈ کی سوئی لگی ہوئی یا ویکلی فیشن کی کٹ ڈائل کی
بغیر سیکنڈ کی قیمت سفید دھات کی [illegible]
چاندی کے کیس کی [illegible]

فینسی لیور رسٹ واچیں گارنٹی ۳ سال

سادہ ڈائل — ریڈیم ڈائل — مشین کے پرزوں کی دکھاوٹ
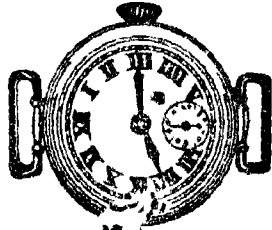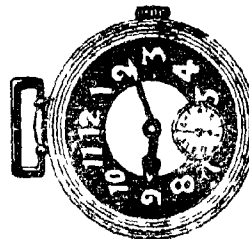
نمبر ۱۰۲۲ یہ رسٹ واچیں تصویر کے مطابق بہت خوشنما بنی ہوئی ہیں انکی مشین کی بناوٹ اور مضبوطی تصویریں
دیکھنے سے ہی سمجھ سکیں گے یہ گھڑیاں خاص آرڈر دیکر بنوائی گئی ہیں۔ ۱۵ جوئیل کی لیور کا مشین سیکنڈ کی
سوئی مشین کے پرزوں پر گلٹ کی ہوئی گھڑیاں سچا ٹائم بتاتے ہیں اور مضبوطی ہیں ویسٹ اینڈ کا مقابلہ
کرتی ہیں۔ قیمت سفید دھات کی (سٹیل) کیس [illegible] چاندی کی [illegible]
رولڈ گولڈ کی [illegible] سونے کے کیس کی [illegible]
یہی رسٹ واچیں ریڈیم ڈائل ہونے سے [illegible] فی گھڑی زائد لگے گا۔

ر ڈاچوں (ہاتھ پر باندھنے کی گھڑی) کی چینیں

یہ تصویریں مانند اصلی چینوں کے ہیں یہ چینیں نہایت خوشنما بنی ہیں
منگاتے وقت نمبر اور قیمت جیسی چاہیے ضرور لکھیے

نمبر ۴۰۱
اینٹھواں چین کی سفید دہات کی ۴ر
سنہری ۵ر چاندی کی ۱۲ر ۶ر

نمبر ۴۰۲
اسپرنگ والی رولڈ گولڈ کی چینیں اس چین میں
اسپرنگ لگی ہے قیمت عہ

نمبر ۴۰۳
سیلینچ چین قیمت سنہری ۹ر
سفید ۶ر ۳ر چاندی کی ۱۲ر

نمبر ۴۰۴
پیچ کی اسپرنگ دار چین ۴ر
۲ر چاندی کی ۱۲ر

نمبر ۴۰۵
اسپرنگ والی چین ۴ر
۸ر چاندی کی ۱۲ر

نمبر ۴۰۶
رسٹ واچ کے ریشمی پٹے
قیمت ۴ر ۶ر ۸ر

نمبر ۴۰۷
اسپرنگدار چین یہ چین نکل نامی دہات
کی بنی ہوئی ہیں قیمت ۱۲ر

محافظ گھڑی یہ ٹین کا بنا ہوا ہے اسے رسٹ واچ پر لگا دینے سے شیشہ ٹوٹنے [illegible] ہے اور وقت برابر معلوم ہوتا رہتا ہے قیمت فی ۱۴ر

رسٹ واچ کے واچ کیس۔ یہ گھڑی رسٹ کے ڈبی نما بنے ہوتے ہیں ان میں گھڑی رکھنے سے کیس خراب ہونے سے بچتا ہے قیمت فی ۴ر

جیبی گھڑیوں کی چینیں

کنیڈین چینیں

یہ چینیں دیکھنے میں بہت خوبصورت اور گنی سونے کی سی معلوم ہوتی ہیں انکی پالش بہت دن تک خراب نہیں ہوگی چاہے جس فیشن کی منگا لیجئے۔ قیمت سب کی یکساں ہے۔
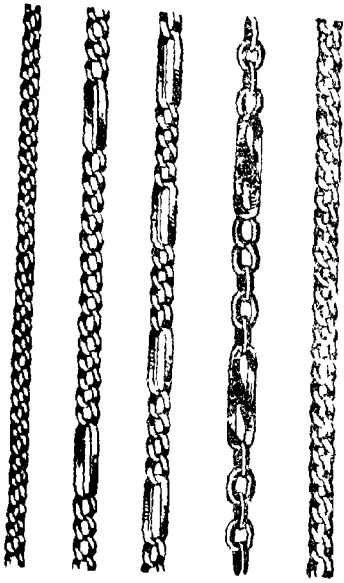
قیمت فی چین ۱۲ آنہ

نکل نام کے سفید دھات کی چینیں

یہ چینیں بہت ہی [illegible] بنی ہیں دور سے دیکھنے سے چاندی کی سی معلوم ہوتی ہیں اور کبھی کالی نہیں پڑتی ان کی بناوٹ بھی [illegible] کی سی معلوم ہوتی ہے قیمت فی چین ۸ر

سستی چینیں۔ یہ چینیں سنہری روپہلی دونوں طرح کی ہر قسم کی بنی ہوئی ہیں۔ قیمت فی چین چار آنے ۔ آٹھ آنے۔

چاندی کی چین۔ ہر قسم کی چین [illegible] ۱۲ ۱ تولہ سے کم نہو گی قیمت ۱۰؍ تولہ۔

جیبی گھڑیوں کے واچ کیس

اسمیں گھڑی رکھنے سے میلی نہیں ہوتی۔ ٹائم دیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی قیمت فی ۱۰؍ ۱۴؍

رام لیلا اور سوانگ ناٹکوں کیلئے

سرنگار اور بال سامان
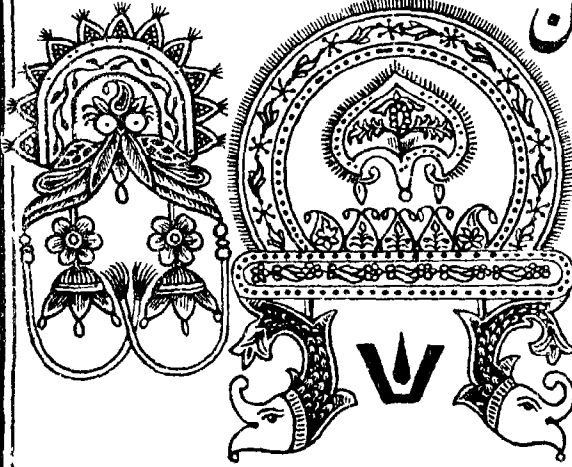
رام لیلا کا سرنگار

ایک سیٹ میں یہ سامان ہوتا ہے

۱ کریٹ ۲ مکٹ ۲ تلک

۲ تیج کرن ۱ نتھ یعنی بیسرا چندرکا

۱ جوڑا جھمکا ۲ بلاق ۲ پھول مالا

قیمتیں حسب ذیل ہیں

نمبر ۱ - ۱۲ روپے پچے کام کا ۱۴ روپے

نمبر ۲ - ۱۵ روپے " ۵۰ روپے

نمبر ۳ - ۲۰ روپے " ۶۰ روپے

نمبر ۴ - ۲۵ روپے " ۷۵ روپے

نمبر ۵ - سستے سیٹ جو معمولی مخمل یا ساٹن پر بنا ہوا ہوتا ہے۔ اور جس میں تیج کرن پھول مالا بلاق اور تلک کے سوائے باقی سب چیزیں ہوتی ہیں قیمت ۸ روپے

نمبر ۲۰ جٹا

یہ جٹا معمولی بالوں کی بنی ہوئی ہے
شب جی ، منی
مہاتما وغیرہ
کے پاٹ میں کام آتی ہے
قیمت
ایک روپیہ
سفید ۱ روپے
کالی ۱ روپے

نمبر ۳ مونچھ

کالی، لال، سفید جاہے جس رنگ کی اور جاہے جس فیشن کی لیجئے قیمت فی دو آنہ۔ سستی چمڑے کے بالوں کی اور بڑھیا کپڑے پر سلی ہوئی ۶ روپے

گل پھا نمبر ۲

یہ گل گپھا تصویر کے مطابق ہے
قیمت ۵ سفید ۵ سیاہ ۵

زنانہ سر کے بال نمبر ۲۱
بڑھیا پٹی دار بنگالی فیشن کے بال

یہ بال بہت ہی ملائم ہیں ریشمی پٹی سے سجا کر خاص طور پر تیار کئے گئے ہیں انکی خوبصورتی دیکھنے سے ہی معلوم ہوتی ہے خاص کر رانی پارٹ کے کام آتے ہیں قیمت فی بال مٹے ر ۵ر للعہ ر ۔

نمبر ۲۲ زنانے سر کے بال

یہ بال تصویر کے مطابق بنے ہوئے ہیں قیمت سے ۶ر ۶ر
عہ ر فی بال سیاہ
بال سفید زنانے
بال سرخ عہ ر فی عدد

اِس کے علاوہ راجاؤں کے تاج کلنگی ۔ پوشاک پردہ ۔ پچھوائی ۔ وغیرہ سب سامان ملتا ہے

پورا حال معلوم کرنے کے لئے شرنگار کی فہرست منگا کر دیکھئے۔

نمبر ۱۰ بادشاہی گھونگرو کرل وینگ

یہ بہت ہی خوبصورت اصلی بالوں کے مطابق ہیں سر پر لگا لینے سے یہ پہچان کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ بناوٹی ہیں کالے یا سفید جیسے چاہئیں منگائے قیمت فی بال سے ر للعہ ر ۵ر

مردانہ بیبری (پٹے) نمبر ۱۱

یہ بال بھیم بودھا وغیرہ بھیانک ۔ بہادر پارٹ میں پہنانے لایق ہیں قیمت عہ ر ۶ر سے ر فی عدد

لمبی ڈاڑھی مونچھ معمولی نمبر ۲

یہ ڈاڑھی مونچھ تصویر کے مطابق بنی ہوئی ہے قیمت فی داڑھی مونچھ سفید ۸ر کالی ۸ر لال ۸ر

گول ڈاڑھی مونچھ معمولی نمبر ۴

یہ ڈاڑھی مونچھ تصویر کے مطابق بنی ہوئی ہیں قیمت سیاہ ۶ر سفید ۶ر سرخ ۶ر
نمبر ۳ ڈاڑھی کپڑے پر سلی عہ ر

ہارمونیم

جو لوگ باہر سے صرف نوٹس دیکھکر کارڈ بھیجکر منگاتے ہیں
اُن کو بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ صرف قیمت ہی
دیکھتے ہیں۔ مال کیسا ہے یہ دیکھنے کا موقع انکو قیمت دیکھنے
سے پہلے نہیں مِلتا۔ ہمارے یہاں کے ہارمونیموں میں
کیا خوبی ہے ؟

۱۔ یہ ہے کہ جو باجے ہم ۲۱ سے ۲۵ روپیہ میں بیچتے ہیں
اُنکے اُوپر پردوں کو ڈبک کر جس سے دھول نہ جائے۔ اُسی
میں تالا لگا دینے کا انتظام ہے جس سے بغیر بکس کے سفر
میں ساتھ رکھنے سے کچھ دشواری نہیں ہوتی۔

۲ ہمارے باجونکی ہوا اتنی فٹ رہتی ہے کہ ایکبار ہوا بھر
کر چھوڑ دینے سے پورے میوزیشنک بجائے جا سکتے ہیں۔

۳ سُروں کا مٹھاس اور مضبوطی کیلئے تو ہم دعوے کیساتھ
کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے باجوں کا مقابلہ کسی سے نہ ہو سکے گا۔
منگانے وقت قریب کے اسٹیشن کا نام اور ۵ پیشگی ضرور بھیجیے۔

قیمت و گارنٹی

نمبر ۵ سنگل ریڈ اکہرے سُرونکا ڈھکن دار بکس معہ چابی
۲۱ روپیہ، گارنٹی ۳ سال۔

نمبر ۶۔ ڈبل ریڈ یعنی دہرے سُرونکا ڈھکن دار معہ بکس و تالا
چابی قیمت ۲۵ روپیہ بہی بڑھیا ۲۸ روپیہ، ۳۲ روپیہ، ۳۵ روپیہ۔

ڈبل ریڈ سفری ہارمونیم

جو دُہرے سُر کا ہونے پر بھی بہت ہلکا اور دیکھنے میں
بہت چھوٹا ہے۔ اُسکا وزن معہ بکس ۴ ۱/۲ سیر ہے یہ ڈاک سے
چاہے جہاں بھیجا جا سکتا ہے قیمت ۴۰ روپیہ

کپلنگ ہارمونیم

یہ ایکدم نئی اور بہترین کاریگری ہے جو کام دونوں
ہاتھ سے ہارمونیم بجانے سے ہوتا ہے وہی کام ایک
ہاتھ سے بجانے سے ہوتا ہے۔ ایک پردے کو دبانے
سے دوسرے سپتک کا پردہ اپنے آپ بولیگا قیمت [illegible]

بچوں کے چھوٹے ڈاک سے بھیجنے لایق ہارمونیم

ہارمونیم بچوں کے کیا بڑوں کے بھی کام کا ہے ہر جگہ ڈاک سے
بھیجا جا سکتا ہے قیمت ۱ ۱/۲ سپتک سنگل ریڈ ۱۰ روپیہ،
۲ سپتک سنگل ریڈ ۱۲ روپیہ، ۲ سپتک ڈبل ریڈ ۱۵ روپیہ اور بھی بہت قسم
کے ہارمونیم ہمارے یہاں ملتے ہیں بڑے بجانے کے ہارمونیم قیمت [illegible]

جاپانی گانے کی مشین
پورٹیبل (بیگ نما)
مشین نمبر ۴ سنگل اسپرنگ
مشین نمبر ۵ ڈبل اسپرنگ
نمبر ۶ ٹیبل مشین صندوق نما قریب ۱۲ انچ اونچی جو
ایکبار چابی دینے سے ۳ رکارڈ سناتی ہے قیمت
گانا بھرے پلیٹ
جیسے بلومنگل وا بھینو وغیرہ مشہور گویوں کے گانے ہنسی مذاق اور ناٹکوں
کے پلیٹ ہمارے یہاں ملیں گے جیسے چاہئے منگائیے
۱۰ انچ کے گراموفون کے دونوں طرف گانا بھرے پلیٹ فی عدد
جونوفون کے فی پلیٹ ٹوئین کے ریکارڈ
البم جسمیں ۱۲ پلیٹ بڑے حفاظت سے رکھے جاتے ہیں قیمت فی البم
ٹوئین کی سوئیاں ہزار۔ ایک ڈبی کی قیمت ۵۔ کتا مارک کی گراموفون کی سوئیاں قیمت ہزار ایک ڈبی ۱۲ ایک
ڈبی میں ۲۰۰ سوئیاں ہوتی ہیں۔
ستار ستاری
ستاری قیمت
نمبر ستار
ستار کے پکے تار قیمت تولہ پیتل کے عمدہ تار تولہ
اچھی دلربا قیمت
سارنگی ہولی
سچ سچ جو گانے کے سُر اس باجے میں نکلتے ہیں۔ ویسے کسی دوسرے باجے میں نہیں
نکلتے۔ بڑی عمدگی کے ساتھ بنائی گئی ہیں قیمت یہی بڑھیا
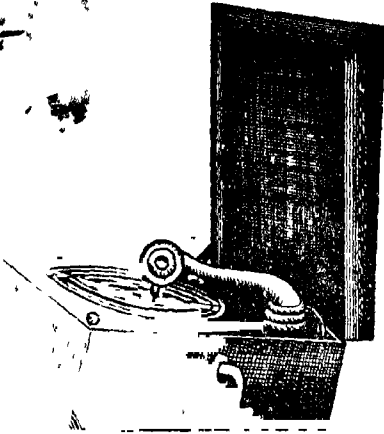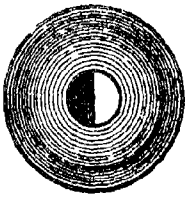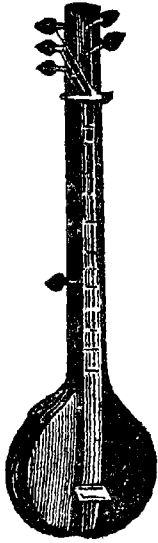
ربڑ کی مہریں
ہمارے یہاں ہندی، اُردو، گجراتی، انگریزی ہر قسم کی ربڑ کی مُہریں بڑی ہی مضبوط اور خوبصورت تیار ہوتی ہیں جنکے چند نمونے ذیل میں دئے جاتے ہیں۔ مہروں کے کل نمونے جدا جدا ہیں منگا کر دیکھئے۔ ہر طرح کی بیمہ کی مُہریں اور چپڑاسیں بھی بنتی ہیں۔ منگاتے وقت مُہروں کے اُوپر کا نمبر اور قیمت اوشیہ (ضرور) لکھئے۔ نام مونوگرام۔ اور رسیدی لائن کی مہریں بھی نمونے کے مطابق بھیجی جاتی ہیں۔ آرڈر کے ساتھ ۴ر پیشگی بھیجنا ضروری ہے۔
نمبر ۱۱۲ قیمت عہ ر
نمبر ۱۱۱ قیمت عہ ر
نمبر ۱۶۹ قیمت عہ ر
نمبر ۱۱۲ قیمت عہ ر
सर्दार झंडा सिंह पंजाबी
मिस्त्री
कारखाना आटा चक्की
पुरवा-उन्नाव,
نمبر ۱۶۹ قیمت عہ ر
نمبر ۱۸۵ قیمت عہ ر
نمبر ۱۵۱ قیمت عہ ر
نمبر ۱۸۵ قیمت عہ ر
मुकनलाल पोपामल
نمبر ۱۵۱ قیمت عہ ر
हिंगोली दक्खन.
نمبر ۱۸۶ قیمت عہ ر
نمبر ۱۳۶ قیمت عہ
शान्तिजी जैन टेलर मर्चेंट
टोपीवाला मंगोना पुर्व
तीप्रसाद
نمبر ۱۳۶
पी. सैपऊ, धौलपुर.
نمبر ۱۰۳ قیمت عہ ر
نمبر ۱۶۶ قیمت عہ ر
نمبر ۱۶۴ قیمت عہ ر
Sheikh
n Bakhsh Leather Merchant
Bundi State.
شیخ کریم بخش
ٹھیکہ دار چرم
ریاست بوندی
ठेकेदार चर्म हौस करीमबक्स, बूंदी.
نمبر ۱۶۶ قیمت عہ ر
نمبر ۱۶۴ قیمت عہ ر
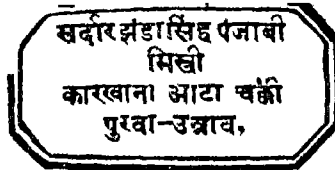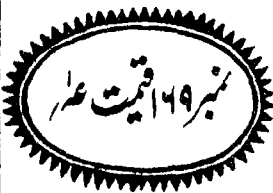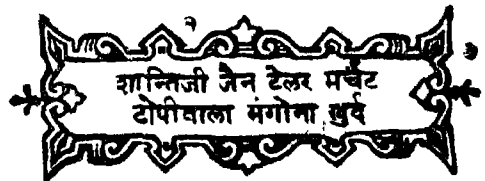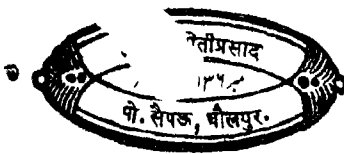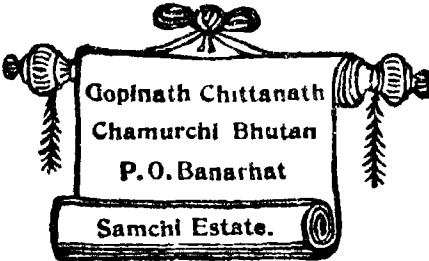
نمبر ۱۹۶ قیمت
Muni Lall &
Satya Narayan Ram,
Tari Keeper
Buxar.
نمبر ۱۰۲ قیمت
श्री राजीवलोचन
संस्कृत विद्यालय राजिम, क्षेत्र
जि० रायपुर सी० पी०
स्थापित ता० १।१।१९०१
نمبر ۱ قیمت
نمبر ۱۱۶ قیمت
نمبر ۱۰۰ قیمت
نمبر ۱۱۶
قیمت
نمبر ۲۲ قیمت
نمبر ۲۰۶ قیمت
Gopinath Chittanath
Chamurchi Bhutan
P.O. Banarhat
Samchi Estate.
نمبر ۲۰۶
قیمت
پیتل کی چپراس قیمت
مہر لاکھ لگانے کی
پیتل کی مہر
قیمت
مونوگرام قیمت
P.KSHETRAPAL
SHARMA
MUTTRA
نسکھ سنچارک کمپنی متھرا سے طلب فرمائیے
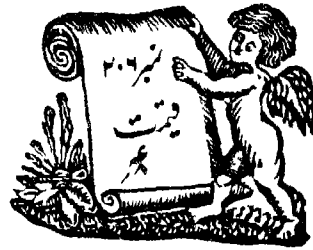
ہماری [illegible] کے بارے میں مشہور اخبار والوں کے دوا استعمال کرنیکے بعد چھپے ہوئے تعریفی مضامین

ارجن دہلی ۱۸ اپریل ۱۹۳۱ء

ہمارے پاس سکھ سنچارک کمپنی کی مندرجہ ذیل ادویات بغرض استعمال آئیں۔

دراکشا سو - سُدھا سندھو - دو روغن کیسری اور بال سُدھا

یہ چاروں ادویات آزمودہ ہیں۔ ہمارے یہاں انکا استعمال ہمیشہ سے ہوتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بچوں والے گھر میں انکا رکھنا ضروری اشیا میں سے ہے۔ جن کا ہر گھر میں رہنا ضروری اور لازمی ہے۔ ہمارے یہاں ولایتی پیٹنٹ ادویات کا استعمال بہت بڑھ رہا ہے لیکن دیسی ادویات بھی کچھ اُن سے کم نہیں ہیں۔ مگر ہندوستانیوں کا بھی فرض ہے کہ وہ جہانتک ممکن ہو دیسی ہی ادویات استعمال کریں۔

مادہری - لکھنؤ اپریل ۱۹۳۱ء

سکھ سنچارک کمپنی متھرا اپنی سچائی اور ایمانداری کے لئے ہندوستان بھر میں مشہور ہے۔ سدھا سندھو۔ بال سدھا اور روغن کیسری نے اپنی عمدگی اور زود اثر ہونے کے باعث کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ سدھا سندھو کی تو ہمنے کئی مرتبہ آزمایش کی ہے۔ اور ہمیشہ مفید ثابت ہوا کچھ دنوں سے کمپنی نے دراکشا سو بنانا شروع کیا ہے امراض کے لئے بیحد فائدہ مند ہے ساتھ ہی اس کے خوش ذائقہ دار بھی ہے۔ اسلئے جملہ صاحبان کو چاہیئے کہ وہ ان چیزوں سے فائدہ اٹھاویں کمپنی کے مالک پنڈت چھتر پال [illegible] ہیں۔ جنھوں نے ہندوستان کی آب و ہوا اور مزاج کو مد نظر رکھکر ادویات کے بنانے میں کافی تجربہ حاصل کیا ہے منیجر کو کارڈ لکھنے سے یہ ادویات عمدہ اور کفایت سے مل سکتی ہیں۔

دینک ورتمان کانپور ۱۰ مئی ۱۹۳۱ء

متھرا کی مشہور سکھ سنچارک کمپنی نے مندرجہ ذیل ادویات ہمارے پاس بغرض آزمایش بھیجی ہیں۔

سدھا سندھو - یہ وہ دوا ہے جس کو ہندوستان کا تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ ہندوستان میں کثرت سے فروخت ہوتا ہے اسکے لاکھوں ایجنٹ ہیں۔ اور یہ دوا سرکار سے رجسٹری کی ہوئی ہے۔ اس سے ہیضہ۔ کف۔ کھانسی۔ دمہ۔ شول سنگرہنی۔ اتیسار۔ پیٹ درد۔ قے۔ دست۔ جی مالش کرنا وغیرہ امراض دور ہوتے ہیں۔ یہ دوا ہر گرہست میں رہنے کے لایق ہے۔ قیمت فی شیشی ۸؍

بال سدھا - سدھا سندھو کی طرح اپنے مفید ہونیکے سبب بیحد مشہور ہو گئی ہے۔ اسکے پلانے سے [illegible] بچے تندرست اور طاقتور ہو جاتے ہیں۔ با[illegible] [illegible] گھر میں اسکا رکھنا ضروری ہے۔ قیمت ۱۲؍

سکھ سنچارک دراکشا سو - دراکشا سو کو ہندوستان کے تمام لوگ [illegible] تے ہیں۔ یہ انگوری منقاؤں کا بنا ہوا ہے جسم میں طاقت ا[illegible] پھرتی پیدا کرتا ہے قبض دور کرکے ہاضمہ بڑھاتا ہے۔ یہ بڑھاپے کی کھانسی و کمزوری سردی کھانسی اور زکام کی بینظیر دوا ہے۔ قیمت بڑی بوتل ۲؍ چھوٹی بوتل ۱؍

ہماری ایورویدک ادویات کے بارے میں مشہور ویدوں اور بڑے قابل لیڈران کی رائے

متھرا ۱۰ ؍دسمبر ۱۹۳۱ء۔

مہاشے پنڈت چھیتر پال جی شرما تسلیم

میں ویدک سمیلن میں گوالیار جاتے وقت سری چھتہ متھرا میں آیا تھا اُسوقت آپ کی دواؤں کا کارخانہ بغور دیکھا آیورویدک ڈیپارٹ میں ویدراج جی سے ملاقات کی۔ آیورویدک تمام ادویات کو شاستر کیمطابق تیار ہوتے دیکھکر بیحد طبیعت خوش ہوئی اور دعا کی کہ اے پرماتما (خدا) اس کارخانے کو اور زیادہ ترقی دے۔

گنیش ترتوک ویدلا گونکر۔ سداشو گلی گرگاؤں

ممبئی نمبر ۴

متھرا چیت شکل پرت پد شاکے ۱۸۵۴

نکھل بھارت ورش آیوروید ودیاپیٹھ پرکشا کے پرسنگ میں متھرا آتے وقت سکھ سنچارک کمپنی کے مالک پنڈت چھتر پال شرما سے ملا اور کارخانے کے ہر ڈیپارٹ کو بغور دیکھا اگرچہ ڈیپارٹ اور [illegible] کئی ڈیپارٹ دیکھکر بیحد مسرت ہوئی میں نے صرف آیورویدک ڈیپارٹ کو بہت غور اور توجہ سے دیکھا۔ آیورویدک ڈیپارٹ کا کام ویدراج پنڈت بشمبر دت جی کی زیر نگرانی ہے۔

پنڈت بشمبر دت جی ایک نہایت تجربہ کار عالم وید ہونے کے باعث۔ ادویات تیار کرنے کے کام میں بیحد مہارت اور تجربہ رکھتے ہیں۔

ادویات کس آیوروید پاٹھ کے مطابق تیار کیجاتی ہیں وادویات کا کھرل کس تاریخ سے شروع ہوا ہے اور دوا کتنی کس تاریخ کو تیار ہوئی یہ تک لکھا رہا ہے۔ پوری چندرودیہ دھر قیمت کی دوا پورے نیپال سے تیار کیجاتی ہے۔ پنڈت چھیتر پال جی سے پوری آیورویدک کی قدمت ہو یہی ایشور (خدا) سے پرارتھنا (دعا) ہے۔

کرشن شاستری نارائن کوڈے بی۔اے

وید پنچائن منتری مہامنڈل ودیاپیٹھ پونہ

متھرا کی سکھ سنچارک کمپنی کمرچھی ڈیپارٹ کے نگراں نے سب کارخانہ دکھلایا اور ہر ایک ڈیپارٹ کو سمجھا سمجھا کر بتلایا کارخانہ کا کام زیادہ تر دوا تیار کرنیکا ہے یہ کام ایک زبردست تجربہ کار وید کے سپرد ہے۔ اس لئے ادویات تیار کرنا شاستر کے مطابق ہوتا ہے کارخانے کے تمام اصولوں کو دیکھکر بیحد طبیعت خوش ہوئی۔ اسلئے ہماری خواہش ہے کہ اس کارخانہ کی اور زیادہ ترقی ہو۔

۲۸ ستمبر ۱۹۳۲ء۔ پنڈت کیشرالکر۔ کنہاڈ۔

گنیش آپاجی مارولکر وکیل کنہاڈ سدیشور شاستری چترا و وڈیانده۔ پونہ۔

سودیشی آندولن کے سبب بہت سی باتیں بدل گئی ہیں لیکن سودیشی ادویات نے بھی بیحد ترقی اور شہرت حاصل کی ہے جو لوگ زیادہ تر ایلوپیتھک دوا استعمال کرتے ہیں یہ آیورویدک دوا بھی اسی طرح تیار کی گئی ہیں جو کہ مرضی کے مطابق اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ مگر سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا انگور کے رس

کا بنا ہوا موتی جیسی دیسی چیز ہر پہلو سے
جسم کی حفاظت کرتی ہے جسم کو طاقتور بنانے میں
اس انگور کے شربت کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسری
چیز ہوگی۔ دوا کیا ہے ایک قسم کی اکسیر یا آب حیات
ہے ہندوستان سے محبت رکھنے والوں کو اس **سکھ سنچارک کمپنی متھرا** کے بنے ہوئے دراکشاسو کو ضرور استعمال کرنا چاہیے

ہندوستان ٹائمس تاریخ ۸ اگست ۱۹۳۱ء

میں کئی سال سے سکھ سنچارک کمپنی متھرا سے واسکے
مالک پنڈت چھیترپال جی شرما سے بخوبی واقف ہوں اور بہت
زور کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے یہاں بیوپار کے جتنے عمدہ
قواعد ہیں ان سب کی پابندی بہترین طریقے سے کیجاتی ہے
ایمانداری۔ اور کم منافع پر زیادہ بکری، خریداروں کو ہر طریقے
سے خوش رکھنا۔ اور اُن کی باتوں پر دھیان دینا۔ ان
سب قاعدوں کا آپکے یہاں یوروپین دکان کی طرح برتاؤ کیا
جاتا ہے۔

یہ سب پنڈت جی کے بہترین اصولوں کا سبب ہے اور یہی
انکی ترقی کا باعث ہے میں اُمید کرتا ہوں کہ آپکے صاحبزادہ
بھی آپکے ان اصولوں کو ذہن نشین کرینگے۔ اور آپکے ہی مطابق
ترقی حاصل کرینگے۔

کرشن مراری لال ڈپٹی کلکٹر اناؤ

مجھے ابھی آپ کا بھیجا ہوا دراکشاسو کا نمونہ ملا۔ اس
عجیب و غریب آیورویدک ادویات کو دیکھکر مجھے تعجب
ہوتا ہے۔ یہ دوا نہایت عمدہ اور خوش ذائقہ اور میٹھی
ہے۔ اور ہاضمہ درست کرنیمیں بہترین ہے یہ صرف
طاقتور دوا ہی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی غذا ہے
جو آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے۔ دوسرے اس کا
استعمال کچھ نقصان دہ نہیں ہوتا اسلئے یہ نہایت

مقبول عام ہے۔

ورتمان راجنیتک اوستھاؤں میں جبکہ ہندوستان
جیسے ملک میں ولایتی ادویات کے مقابلہ میں دیسی ادویات
نے بہت کچھ ترقی حاصل کی ہے مجھ کو ایسی ادویات کی
بہت تلاش تھی آپ کا بھیجا ہوا **دراکشاسو** بہت خوش ذائقہ
اور عمدہ ہے۔ اور بے ضرر یا نقصان دہ امراض کو دور کرنے
میں زیادہ مفید ہے

آپکا ہتیشی۔ ایم۔ ایل اتری۔ ایل ایم۔ ایس

اتری اسپتال گیا

آج میں نے سکھ سنچارک کمپنی متھرا کے کارخانہ (ریس ا
دوا بریو گشالہ۔ ٹائپ فونڈری اور چکتسالیہ ڈپارٹ
اور سورم وغیرہ کو دیکھا۔ اس دنیا میں کمپنی نے جو
ترقی حاصل کی ہے وہ پنڈت چھیترپال جی شرما کے تجربہ
اور اُن کے عمدہ بیوپاری اصولوں کا سبب ہے اس
کے عمدہ قاعدوں کو دیکھکر بحد طبیعت خوش ہوئی اور دیا
ڈیپارٹمنٹ میں چکتسا کے اصول برتے جاتے ہیں اس
میں ادویات شاستر کے طریقوں سے بنائی جاتی
ہیں اور انجن کے ذریعہ پریس وشین چلتی ہیں جو اپنے
ہی یہاں کا کام چھاپتی ہیں اور [illegible] کا بھی
اپنے ہی یہاں انتظام کر [illegible] اپنے وطن کے
لوگوں کو فائدہ دیتا ہے [illegible] میں سے چکتسا ڈپارٹ
کھولا ہے، اُمید ہے کہ یہ ڈپارٹ اور بھی [illegible]
ترقی کرے گا۔

دیکھکر بہت خوش ہوا کہ اس کمپنی کی سب
چیزیں فہرست کے مطابق ہیں یہی سبب ہے کہ اس کمپنی کو سرحد عزت کی نگاہ
سے دیکھا جاتا ہے امید ہے کہ پنڈت جی کے فرزند بھی ان
اصولوں پر کاربند ہونگے (دین پال شرما دیا لکھیان اچھپتی)

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

مرتبہ دیا نرائن نگم، بی۔اے

جلد ۶۴	فروری سنہ ۱۹۳۵ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

تصویر۔ فردوسی

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت فی پرچہ ۸/

قیمت سالانہ ممالک غیر سے تین ... ہندوستان سے ...

کرشن جلّ شانہٗ

کلامِ ربّانی

(یعنی)

شریمد بھگوت گیتا کا منظوم اُردو ترجمہ

یہی وہ کتاب ہے

جس پر مصنف (پنڈت نظر سوہانوی) کو راجاؤں مہاراجاؤں اور سیٹھ ساہوکاروں کی طرف سے پانچ ہزار روپیہ نقد انعام مِلا۔

پنڈت مالوی۔ سر سپرو جیسے معزز لیڈروں اور جناب رواں مرحوم۔ منشی پریم چند۔ مولانا مہیش پرشاد جیسے فاضل ادیبوں نے اور زمانہ کانپور۔ ادبی دنیا لاہور۔ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد جیسے معزز رسائل نے شاندار ریویو کئے ہیں اور جسے متفقہ طور پر تمام اُردو منظوم ترجموں سے ممتاز قرار دیا گیا ہے۔ فوراً خریدئیے ورنہ تیسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

سائز $\frac{20}{26} \times \frac{1}{16}$ — **قیمت** — صفحات دو سو سے زائد

(۱) رئیسوں سے ... ... اُنکی ہمت کے مطابق

(۲) عوام سے ... ... صرف بارہ آنہ ۱۲/

(۳) کالجوں اور اسکولوں کے پروفیسروں ماسٹروں طالبعلموں سے صرف ۸/

(۴) مسلمان حضرات سے صرف محصول ڈاک بیشگی ۳/۶ پائی

(۵) ہندو نادار طلبا سے بھی اگر اُن کے پروفیسر یا ماسٹر تصدیق کر دیں ۳/۶ پائی

(ہندی حروف میں بھی چھپ رہی ہے)

جن حضرات نے ٹکٹ بھیجے ہوں اُنکو کتاب مل ہو دہ بی۔ این بجل کمپنی سے خط و کتابت کریں نظر صاحب کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے

ملنے کا پتہ۔ بی۔ این بجل بالش کا پھاٹک۔ بنارس شہر

ایران کا شاعرِ اعظم ابوالقاسم فردوسی مصنف ''شاہنامہ''

ولادت سنہ ۳۲۹ھ   وفات سنہ ۴۱۱ھ

زمانہ

جلد ۶۵ — فروری سنہ ۱۹۳۵ء — نمبر ۲

کوٹلیہ ارتھ شاستر

(از مسٹر مالک رام، ایم۔اے، ایل ایل، بی۔)

سنہ ۱۹ء کا ذکر ہے کہ ضلع تنجور کے ایک گانوں کا ایک برہمن ریاست میسور کے سرکاری مشرقی
کتب خانہ میں آیا اور مسٹر شام شاستری مہتمم کتب خانہ کو سنسکرت کے دو قلمی مسودے پیش کئے۔ مسٹر شاستری
نے جب ان قلمی نسخوں پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ایک کوٹلیہ کا ارتھ شاستر ہے جو مدت سے نایاب تھا اور
دوسرا نسخہ اسی ارتھ شاستر کے ایک حصہ کی بھٹ سوامی نامی کسی شخص کی لکھی ہوئی شرح ہے۔

ارتھ شاستر کا سنسکرت کی علمی تاریخ میں جو مرتبہ ہے وہ مسٹر شام شاستری سے پوشیدہ نہ تھا، انھوں
نے سنہ ۱۹۰۵ء میں اور اس کے بعد ولایت کے انگریزی رسالہ انڈین اینٹی کوری Indian Antiquary
اور میسور ریویو میں اس کے بعض حصوں کا ترجمہ شائع کرایا، اس ترجمہ کا چھپنا تھا کہ علمی حلقوں میں ایک ہلچل
مچ گئی مستشرقین مغرب نے یکے بعد دیگرے اس کی اہمیت کا بڑے شاندار الفاظ میں اظہار کیا، ڈاکٹر جالی
ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ۔ ڈاکٹر فلیٹ۔ ڈاکٹر ایف۔ ڈبلیو۔ ٹامس وغیرہ فاضلوں نے اسے ہندوستان کی
قدیم تاریخ کا ایک بیش بہا ماخذ قرار دیا۔ اور تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والوں نے ان مختصر و نامکمل مضامین
کو سر آنکھوں پر لیا اور مترجم کی حوصلہ افزائی کی، کتاب کی اہمیت اور پبلک کی مانگ کو مد نظر رکھتے ہوئے
مسٹر شام شاستری نے سنہ ۱۹۰۹ء میں اصل سنسکرت مسودہ مرتب کر کے شائع کر دیا اور اس کے پانچ
برس بعد سنہ ۱۹۱۴ء میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی پہلی بار چھاپ دیا۔ اصل کتاب دو دفعہ اور ترجمہ تین دفعہ

چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں کتاب کے تمام الفاظ کا ایک انڈکس Index (اشاریہ) بھی چھاپ دیا۔

اس وقت تک سنسکرت اور پالی کی جس قدر کتابیں شائع ہو چکی ہیں وہ ہندوؤں کی دماغ اور روحانی ترقی کی ناقابل تردید شہادت ہے۔ مگر ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جو دنیاوی او عملی میدان میں ہندوؤں کی نمایاں کامیابی کی دلیل سمجھی جائیگی۔ مگر ارتھ شاستر نے یہ گم شدہ کڑی مہیا کر دی ہے، اس نے دنیا پر روشن کر دیا ہے کہ اگر ہندو مذہب و اخلاقیات، فلسفہ و روحانیات میں اقوام دنیا کے پیشرو ہیں تو عملی دنیا میں بھی وہ کسی سے کم نہیں۔

اس کتاب کے پندرہ حصے اور ڈیڑھ سو ابواب ہیں جن کا مجموعی حجم سوا چار سو صفحات ہے اور قانون۔ سیاست و معاشرت کا کوئی شعبہ نہیں جس کے متعلق اس کتاب میں مفصل احکام نہ ہوں اس کے ہر باب کے آخر میں کوٹلیہ کا نام درج ہے اور پوری کتاب کے اختتام پر لکھا ہے:۔

> "یہ شاستر اس نے لکھا ہے جس نے احکام مذہبی، علم حرب اور دنیا کو جو نند خاندان کے بادشاہ کے ماتحت تھے بدنظمی سے بچا لیا۔ یہ کتاب کے پہلے باب سے ایکسو پچاسواں باب ہو یوں کوٹلیہ کے ارتھ شاستر کا پندرھواں حصہ ختم ہوا۔ شاستروں کی شرحیں لکھنے والوں کی غلطیاں دیکھکر وشنوگپت نے خود یہ اسوترا اور شرح لکھی ہے۔"

ان سطور میں مصنف نے اپنے دو نام کوٹلیہ اور وشنوگپت دیے ہیں، روایت اسے ایک تیسرے نام چانکیہ سے بھی موسوم کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وشنوگپت اس کا اصلی نام ہے کوٹلیہ (ٹیڑھا۔ بوجہ اپنی حکمت عملی کے) لقب اور چانکیہ (چنک کا بیٹا) کُنیت ہے۔

چانکیہ نے مگدھ کے نند خاندان کے استیصال اور موریا خاندان کے برسر اقتدار آنے میں کام کیا وہ تاریخ کے طالب علم سے مخفی نہیں۔ چندرگپت کے تخت نشین ہونے کے بعد وہ مدتوں اس کا وزیر رہا۔ اور اگر روایت پر اعتبار کیا جائے تو حکومت کے استحکام کے بعد عنانِ وزارت نند خا کے وزیر راکشش کے سپرد کرکے آپ گوشہ نشین ہو گیا۔[۱]

بعض حلقوں میں کتاب کی قدامت اور مصنف کی تاریخی ہستی سے انکار کیا گیا ہے۔ اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام دلائل کو یکجا کر دیا جائے جن سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ارتھ شاستر واقعی چندرگپت موریا کے وزیر چانکیہ کی تصنیف ہے، اس کا زمانہ ۳۰۰ قبل مسیح سے ۔۔۔

[۱] مدرا راکشس ناٹک (وساکھ دت)

۲۹۵ ق۔م تک ہے۔

جیسا کہ ارتھ شاستر کی مندرجہ بالا نقل شدہ عبارت سے ظاہر ہے چانکیہ نے نند خاندان کی معزولی میں نمایاں حصہ لیا۔ اگر اس کی ریشہ دوانیاں، حکمت عملی اور عقل پختہ کار چندر گپت کی پشت پناہ نہ ہوتی تو چندر گپت کا شاہی خاندان کے ایک خاص رکن اور رعایا میں بجید ہردلعزیز ہونے کے باوجود بھی، مہاراجہ مہاپدم آخری بادشاہ نند خاندان کے مقابلہ میں کامیاب ہونا محال ہوتا۔ چندر گپت اور چانکیہ کے مابین اس سیاسی تعاون کا ثبوت وشنو پران کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ملتا ہے:۔

"پہلے مہاپدم پھر اس کے بیٹے صرف نو کی تعداد میں سو سال کے لئے دنیا کے حکمران ہو گئے۔ ان نندوں کو ایک برہمن کوٹلیہ قتل کریگا۔ ان کی موت پر موریا (خاندان کے بادشاہ) دنیا (کی بادشاہت) کا لطف اٹھائیں گے۔ کوٹلیہ خود چندر گپت کو تخت نشین کریگا، اس کا بیٹا بندوسار ہوگا اور اس کا بیٹا اشوک وردھن"[1]

چندر گپت کی تخت نشینی کے لئے بھاگوت پران۔ ستیسیہ۔ وایو اور برہمانڈ پران بھی کوٹلیہ کو ہی ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

چندر گپت اپنے آخری ایام میں جین مت کا مقلد ہو گیا تھا، اور چونکہ جین مت میں ایسی موت جو فاقہ کشی (برت) سے ہو بہت بڑے ثواب کی موت سمجھی جاتی ہے، اس لئے روایت ہے کہ چندر گپت دکن میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر جا کر عزلت گزین ہو گیا تھا، وہاں ریاضت اور فاقہ کشی سے اس کی موت واقع ہوئی۔ ریاست میسور میں ایک پہاڑی چندر گری ہے، ممکن ہے وہ اس عظیم الشان انسان کی آخری آرام گاہ ہو۔ بہرحال اس واقعہ سے چندر گپت کو جینیوں کے مذہبی حلقوں میں بہت وقعت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ جین مت کے اولیا کی فہرست میں اس کا نام بھی شامل کر لیا گیا ہے ہیم چندر نے اپنی کتاب "بھاویرا ولی چرت" (جین ولیوں کے سوانح حیات) میں جہاں چندر گپت کا حال درج کیا ہے وہاں چانکیہ کا نام بھی چندر گپت کے حلیف اور نند خاندان کے اقتدار کو تباہ کرنے والے حلیف ... ... کی حیثیت سے درج ہے۔ اسی طرح نند سوتر میں جو پراکرت زبان میں جینیوں کی مشہور مذہبی کتاب ہے درج ہے کہ چانکیہ کو چندر گپت کے وزیر مالیات کی حیثیت سے بڑی کامیابی ہوئی۔ جینیوں کے "رشی منڈل پرکرن ورتی" میں بھی ان دونوں کے دوستانہ

---

[1] وشنو پران (۴ : ۲۴)

تعلقات کا ذکر ہے۔ اِن کے علاوہ بودھوں کی کتابوں میں چانکیہ کی سیاسی خدمات کا بڑے شاندار الفاظ میں تذکرہ ہے:۔

کامندک نہایت زوردار الفاظ میں اسی واقعہ کا یوں ذکر کرتا ہے[1]:۔

"سلام پہونچے زیرک و فاضل وشنو گپت پر جو اس مشہور اور عظیم الشان خاندان کا نام لیوا تھا جس کے افراد نے رشیوں کی سی زندگی بسر کی۔ سلام پہونچے اُس پر جس کی توانائی کی آگ برق خاطف کے مانند تھی اور جس کی غیر معمولی طاقتوں نے جو اپنی تاثیر اور تیزی کے لحاظ سے بادل کی کڑک کی مثال تھیں، نند خاندان کی وسیع مشہور۔ طاقتور اور باجبروت سلطنت کو ہمیشہ کے لئے بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جس نے تنہا اپنی دانائی اور سرگرمی سے تمام دنیا کو چندر گپت (موریا) کے قدموں پر لا ڈالا، جو بہترین حکمران تھا سلام پہونچے اُس دانا ترین مشیر پر جس نے ارتھ شاستر کے ساگر سے نیتی کا امرت نکالا"

درحقیقت نیتی سار۔ ارتھ شاستر کے بعض حصوں کو چھوڑ کر باقی کا خلاصہ ہے۔ ڈنڈی نے اپنی دش کمار چرتر میں بھی ارتھ شاستر اور کوٹلیہ کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے[2]:

"ڈنڈ نیتی کا گیان (علم سیاست) آچاریہ وشنو گپت نے موریا بادشاہوں کی رہنائی کے لئے چھ ہزار اشلوکوں میں لکھا ہے۔"

اس بیان کی صداقت خود ارتھ شاستر سے عیاں ہے۔ کوٹلیہ لکھتا ہے[3]:۔

تمام علوم کے مطالعہ اور متداول اسلوب بیان پر غور کرنے کے بعد کوٹلیہ نے قانون کے متعلق یہ اصول و قواعد بادشاہوں کے فائدے کے لئے لکھے ہیں۔"

پھر لکھتا ہے[4]:۔

"اس کتاب میں سب کچھ ہے، تمام کتاب میں پندرہ حصے، ڈیڑھ صد ابواب، ایک سو اسی سیکشن اور چھ ہزار اشلوک ہیں۔"

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، اول یہ کہ ارتھ شاستر واقعی کوٹلیہ کی تصنیف ہے، دوسرے یہ کہ موجودہ کتاب ہی وہ اصل کتاب ہے جو کوٹلیہ نے لکھی تھی اور اس میں تحریف کا کوئی شبہ نہیں، کیونکہ موجودہ صورت میں بھی کتاب تقریباً چھ ہزار اشلوکوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ڈنڈی نے جو اقتباس ارتھ شاستر سے دیئے ہیں وہ موجودہ کتاب میں من و عن موجود ہیں۔

پنچ تنتر کے مقدمہ میں ہے:۔

---

[1] نیتی سار (۱: ۴-۶)، [2] دش کمار چرتر (۲: ۸)، [3] ارتھ شاستر (۲: ۱۰)، [4] ارتھ شاستر (۱: ۱)

"دھرم شاستر منو اور دوسرے مصنفوں کے، ارتھ شاستر چانکیہ اور دوسروں کے اور کام سوتر وتسایین اور دوسروں کے ہیں"

گویا پنچ تنتر کے مصنف کے نزدیک بھی ارتھ شاستر کوٹلیہ کی تصنیف ہے۔

بعض اور اُمور جو ارتھ شاستر کے زمانۂ تصنیف پر دلالت کرتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) اشوک وردھن (۲۷۲-۲۳۲ قبل مسیح) کے کتبوں میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن کا اس وقت تک ٹھیک طور پر سمجھنا مشکل ہے، جب تک ارتھ شاستر کی مدد نہ لی جائے۔ یہ الفاظ اِن کتبوں میں بھی پہلی بار ہی استعمال ہوئے ہیں اور بعد کے مصنفین نے بھی انھیں اپنی کتابوں میں استعمال نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک نے یہ الفاظ ارتھ شاستر سے مستعار لیئے۔ پس ارتھ شاستر ان کتبوں سے پہلے کی تصنیف ہے۔

(۲) پانینی نے سنسکرت صرف ونحو جو مشہور زمانہ کتاب "اشٹا دھیائی" لکھی ہے وہ اس فن کی مسلمہ طور پر بہترین کتاب ہے۔ اس کی تصنیف کے بعد کسی مصنف کو ان قواعد کی خلاف ورزی کی جو اس میں درج ہیں جرأت نہیں ہوئی۔ ارتھ شاستر میں پانینی کے اصولوں کے خلاف ایک نہیں دو نہیں بیسیوں مثالیں درج ہیں، جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ پانینی سے ماقبل کے زمانہ کا ہے کیونکہ یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ کوٹلیہ جیسا فاضل شخص مسلمہ قواعد صرف ونحو کے خلاف کچھ لکھکر اپنی تضحیک کا سامان مہیّا کرتا۔

(۳) ارتھ شاستر میں جس سوسائٹی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ بدھ مت اپنے عروج پر نہیں پہونچا تھا، جہاں چندر گپت کے پوتے اشوک وردھن کی سرپرستی نے اسے پہونچا دیا یاگیہ ولکیہ اور منو میں اس بات کا صاف ثبوت ملتا ہے کہ بدھ مت نے بہت نمایاں حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ارتھ شاستر اشوک سے پہلے کی تصنیف ہے۔

مگر ان سب سے بڑھکر حسن اتفاق سے ایک اور زبردست شہادت بھی ایسے شخص کی جو ارتھ شاستر کے مصنف کا ہم عصر تھا ہم تک پہونچ گئی ہے۔

جب اسکندر اعظم کی ہندوستانی یلغار سے واپسی پر کثرتِ شراب کے باعث بابل میں قبل از وقت موت واقع ہوئی۔ تو اس کی عظیم الشان سلطنت کے حصے بخرے ہوگئے اور مشرقی حصہ کا مالک اسکندر کا جرنیل سیلوکس نکاطور بن گیا۔ یہ بڑا اولوالعزم شخص تھا اور اسکندر کے ہندوستانی حملہ میں اس کے ہمراہ آیا تھا۔ اس نے ۳۰۵ ق م میں فیصلہ کیا کہ اسکندر کے ماتھے پر جو ناکامی کا داغ ہے اُسے مٹائے۔

چنانچہ اس نے اسی سال ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ مگر اب حالات بدل چکے تھے۔ وہ اسکندر کے وقت کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں، اور کمزور راجہ غائب ہو گئے تھے اور اُن کی جگہ ایک زبردست سلطنت اور جابر حکمران سیلوکس کا مقابلہ کرنے کو موجود تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیلوکس کو شکست ہوئی اور تاوان جنگ کے طور پر اپنی سلطنت کے تین مشرقی اضلاع (کابل۔ قندھار۔ ہرات؟) چندرگپت کے حوالے کرنے پڑے اور اپنی دختر بلند اختر بھی ہندوستانی فاتح کے حبالۂ عقد میں دینا پڑی اور آئندہ کے لئے سیلوکس نے اپنا سفیر چندرگپت کے دربار پاٹلی پُتر میں رہنے کے لئے بھیجا سب سے پہلا سفیر میگاستھنیز میجسطنی (Megasthenes) تھا۔ اس نے اپنے قیام ہندوستان کے دوران میں ایک کتاب لکھی، جس میں اپنے چشم دید اور لوگوں سے سُنے ہوئے واقعات درج ہیں، بدقسمتی سے یہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ مگر بعد کے مصنفین نے اپنی تصانیف میں اس کے اقتباسات دئے ہیں، یہ اجزا جمع کرکے چھاپ دئے گئے ہیں ظاہر ہے کہ ان منتشر حوالوں سے ہم پوری کتاب کا اندازہ نہیں لگا سکتے تاہم ان سے اُس وقت کی سوسائٹی، معاشرت اور نظام حکومت کے متعلق جو کچھ پتہ چلتا ہے وہ ہمارے لئے نہایت بیش بہا ہے ڈاکٹر اسمتھ نے اپنی تاریخ ہندوستان قدیم (Early History of India) میں ارتھ شاستر اور میگاستھنیز کے ان اجزا کا مقابلہ کرکے ثابت کیا ہے کہ دونوں ایک ہی معاشرت اور حکومت کا ذکر کر رہے ہیں مثالاً جزو ۳۴ کو لیجئے۔

میگاستھنیز لکھتا ہے:۔

"۱۔ حکومت کے بڑے افسروں میں سے بعض بازار کے مہتمم ہیں بعض شہر کے اور بعض سپاہ کے"

"۱۔ ارتھ شاستر کے سنی دھاتا (جس کے ماتحت کئی ملازم تھے جو تجارتی معاملات کے ذمہ وار تھے) اور ناگرک یعنی داروغہ شہر (جو میونسپل انتظامات اور شہر کی حفاظت کا نگراں تھا) اور سیناپتی (فوج کے افسر اعلیٰ) کے مترادف ہیں"[1]

"۲۔ بعض افسر دریاؤں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، بعض زمین کی پیمائش اور راجباہوں کی نگرانی کرتے ہیں جن کے ذریعہ پانی بڑی نہروں سے تقسیم کیا جاتا ہے۔"

کوٹلیہ دریاؤں اور بحری راستوں کی حفاظت پر بھی مفصل بحث کرتا ہے، یہ شعبے امیرالبحر کے ماتحت تھے، کاشت کے ذرائع میں نہروں کا ذکر ہے[2]۔ زمین کی پیمائش اور متعلقہ پیمانوں پر احکام درج ہیں[3]

---

[1] ارتھ شاستر (۲۰۰۱)، [2] ارتھ شاستر (۲: ۳۵)

۳۔ "یہی لوگ شکاریوں کی نگرانی کے ذمہ دار ہیں۔"
ارتھ شاستر میں شکاریوں کی نگرانی چراگاہوں کے افسر اعلیٰ کے سپرد کی گئی ہے[1]۔
۴۔ "وہ محصول وصول کرتے، پیشہ وروں کی نگہداشت کرتے اور سڑکیں بنواتے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ
ارتھ شاستر میں مختلف طرح کے محصولات اور لگان وغیرہ وصول کرنے پر بھی نہایت تفصیلی احکام درج ہیں[2]۔"

میگاستھینز نے جو ذکر محکمۂ جنگ اور اس کے مختلف شعبوں کا کیا ہے وہ بعینہ وہی ہے جو ارتھ شاستر میں درج ہے، بہر حال جو کچھ میگاستھینز نے حکومت اور معاشرت کے متعلق لکھا ہے اُس کا مثنیٰ ارتھ شاستر میں بھی موجود ہے۔

اِن صفحات میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس سے ناظرین پر یہ بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ:-
(۱) کوٹلیہ اور چندر گپت موریا کے درمیان سیاسی رشتہ تھا اور مؤخر الذکر کی کامیابی میں کوٹلیہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔
(۲) کوٹلیہ نے ایک کتاب ارتھ شاستر علم سیاست کے اصولوں پر تصنیف کی تھی، اور
(۳) وہ ارتھ شاستر یہی کتاب ہے جو ہمارے پاس موجود ہے، یہ بالکل وہی ہے جیسی کوٹلیہ نے لکھی تھی اور اس میں کوئی ردو بدل نہیں ہوا۔

آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج سے اڑھائی ہزار برس پہلے ایسی کتاب کا لکھا جانا ہمارے ملک کے لئے کس قدر باعث فخر و مباہات تھا۔ اس مقام پر پہونچنے کے لئے کتنا طویل زمانہ درکار ہوا ہوگا۔

سرزمینِ محبت

(از جناب حسرت موہانی)

عرفانِ عشق نام ہے میرے مقام کا
حامل ہوں کس کے نغمۂ نَے کے پیام کا

مہکے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بوئے اُنس
دنیائے جاں میں شور ہے جس کے دوام کا

مخلوق اک نگاہِ کرم کی امیدوار
ستانہ کر رہی ہے بھجن رادھے شیام کا

محبوب کی تلاش ہوئی رہبرِ عجب
برسانے سے جو قصد کیا نند گام کا

گوکل کی سرزمین بھی عزیزِ جہاں بنی
کلمہ پڑھا جو اُن کی محبت کے نام کا

بِرندا کا بن بھی رشکِ جنت بنا، کہ تھا
پامالِ نازِ اُنھیں کی بہارِ خرام کا

لبریزِ نور ہے دلِ حسرت زہے نصیب
اک حُسنِ مشک فام کے شوقِ تمام کا

---

[1] ارتھ شاستر (۲: ۲۳)؛ [2] ارتھ شاستر (۲: ۶)

میکدہ کی صبح

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

میخانے کو صبح جا کے دیکھا / عالم تھا سکوتِ خواب کا سا
ہلکی سی وہ روشنی گلابی / کہتی تھی کہاں گئے شرابی
تھی فرش پہ سِمٹنیں سی ہر سو / زانو سے ملے تھے شب کو زانو
پیدا تھا سکوت سے ترانہ / تھی فرش کی ہر شکن فسانہ
شیشوں سے جو مے چھلک گئی تھی / رودادِ نشاط کہہ رہی تھی
کچھ نقشِ قدم جہاں بنے تھے / سجدوں کے وہیں نشاں بنے تھے
حجروں کی ہوا بسی ہوئی تھی / خوشبو سے نئی جوانیوں کی
آتی تھی خموشیوں سے ہر بار / رقاصہ کے گھنگھروؤں کی جھنکار
شیشوں کے خطوط میں بصد ناز / غلطیدہ تھی ہاؤ ہو کی آواز
گوشوں میں تھی محوِ پر فشانی / اربابِ نظر کی شعر خوانی
پھولوں میں بھری تھیں داستانیں / پردوں میں مچلتی تھیں زبانیں
ملبوسِ حریر و پرنیاں کے / لہریں سی ہوائیں لے رہے تھے
بالائے ہوا بنے ہوئے تھے / دزدیدہ نگاہیوں کے جادے
غنچے سے فضا میں کھل رہے تھے / نظروں کے خطوط مل رہے تھے
آئینوں میں کچھ عیاں تھا کچھ گم / اک زہرہ جمال کا تبسم
وہ حجلۂ کیف جس میں شب بھر / تھا مطرب و مے سے ایک محشر
ہنستا ہی تھا وہ، رو رہا تھا / جاگا ہوا شب کا سو رہا تھا
نغمے، کہ چھڑے رہے تھے شب بھر / آسودہ تھے بام و در کے اندر
حجرے میں تھی رات یوں سمائی / جاذب میں ہو جیسے روشنائی
یوں جذب کئے ہوئے تھے ذرّات / انفاس و تبسم و خیالات
ذرّوں کو کوئی فشار کر دے / پھر منعقد ایک بزم کر دے

فردوسی

(از مولوی محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔اے)

یہ عجیب بات ہے کہ جس قدر کوئی شخص زیادہ نامور ہوتا ہے اُسی قدر اُس کے متعلق واقعات و روایات میں اختلاف ہوتا ہے۔ یہی کیفیت فردوسی کے حالات کی ہے۔ اگرچہ اس کی سوانح عمری شعرائے ایران کے تمام تذکروں میں تفصیل کے ساتھ درج ہے لیکن ان سب میں سخت اختلافات موجود ہیں۔ اس سلسلے میں چار کتابیں زیادہ مستند سمجھی جاتی ہیں۔ (۱) چہار مقالہ (۲) دیباچہ شاہنامہ جو امیر تیمور کے پوتے بائسنقر نے لکھوایا تھا۔ (۳) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی۔ (۴) مجمع الفصحا، مرزا ہدایت۔ یہ چاروں کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔ اِن کے علاوہ عربی زبان میں قزوینی کی کتاب آثار البلاد میں بھی فردوسی کا کچھ حال لکھا ہے۔

بعض تذکروں میں فردوسی کا نام حسن بن اسحاق بن شرف لکھا ہے۔ مولانا آزاد نے سخندان پارس میں ابوالقاسم ابن اسحاق تحریر کیا ہے، اور مجالس المؤمنین میں اس کا نام ابوالقاسم منصور بن فخرالدین احمد بن مولانا فرخ بیان کیا گیا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا نام احمد تھا۔ ان مختلف بیانات کی موجودگی میں تحقیق طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ فردوسی کا اصلی نام کیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ ابوالقاسم منصور کے نام سے زیادہ مشہور ہے اس لئے ہم بھی اسے اسی نام سے یاد کرتے ہیں، حالانکہ ابوالقاسم نام نہیں بلکہ فردوسی کی کنیت اور منصور اس کی ولدیت ہے۔

فردوسی کے وطن کے متعلق بھی تذکروں میں اختلاف ہے۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ طبرستان کے باژ نامی گاؤں میں پیدا ہوا تھا لیکن امیر بائسنقر کے حکم سے شاہنامہ کا جو دیباچہ لکھا گیا تھا اس میں فردوسی کے گاؤں کا نام شاداب لکھا ہے۔ اِس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کا وطن اضلاع طوس میں تھا اسی لئے وہ فردوسی طوسی کہلاتا ہے۔

چھ سال ہوئے ایک انگریز محقق نے ایران جا کر فردوسی کے وطن موضع باژ کی تلاش کی تو معلوم ہوا کہ موجودہ مشہد سے تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر کسی زمانہ میں باژ نامی ایک گاؤں تھا مگر اب اسکا

نام و نشان تک باقی نہیں رہا، البتہ اسی کے قریب فاز نامی ایک گاؤں ہے جو کسی زمانہ میں باز کہلاتا تھا۔

فردوسی کی پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں، مگر یہ تحقیق ہے کہ ۴۱۱ھ میں اس کی وفات ہوئی، اُس کے اِس شعر کے مطابق :-

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد　　　امیدم بہ یکبارہ بر باد شد

مرنے کے قریب اُس کی عمر تقریباً اسّی برس کی تھی، اس لحاظ سے فردوسی غالباً ۳۲۹ ہجری مطابق ۹۴۱ عیسوی میں پیدا ہوا ہوگا۔

فردوسی ایک دہقان کے گھر پیدا ہوا اس کا آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ فردوسی کا باپ حاکم طوس کی طرف سے باغاتِ شاہی کا مہتمم تھا۔ رواج کے مطابق فردوسی نے ابتدائی تعلیم مسجد کے مکتب میں حاصل کی اور جب پہلوی اور عربی میں کامل عبور حاصل ہوگیا تو ایران کی قدیم روایات و تواریخ کا مطالعہ کیا جس سے اُسے شاہنامہ لکھنے میں بڑی مدد ملی۔ فردوسی کی ابتدائی زندگی کا نقشہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی نے کس قدر دلفریب الفاظ میں کھینچا ہے، ملاحظہ ہو:-

"صحرائی آبادی میں اس کی شاعری کے لئے کوئی ترغیب یا جبر نہ تھا باوجود اس کے وہ بچپن سے شعر کہتا تھا کہ وہ اس کا مادر زاد جوہر تھا۔ اپنے کھیتوں میں پھرتا تھا، نہروں کے کناروں پہ بیٹھتا تھا اور جو دل سے اُگتا تھا اُسے کاغذ پر ہرا کرتا تھا۔

چرند پرند کے گوشت، قدرت کی غذائیں، برفانی چشموں کے بہتے پانی جس طرح بدن کو فربہ اور زورمند کرتے تھے، اسی طرح خیالات کو نیچر کی ہوا میں بلند کرتے تھے اور اُسے ملک سخن کا پہلوان بناتے تھے۔ کبھی فراخ جنگلوں، ہرے ٹیلوں، صبح کی بہار، شام و شفق کے نقش و نگار میں قدرت کے جلوے دیکھتا اور طبیعت پر خوشی کے رنگ لیتا، کبھی جنگلوں کے خوشنما، خوش آواز جانوروں سے بھر کر ذوق و شوق کو پھیلاتا"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ فردوسی کا باپ شاہی باغات کا مہتمم تھا اس لئے اُس کی زندگی ہر وقت گلگشت میں بسر ہوتی تھی۔ چنانچہ اسی مناسبت سے اُس نے اپنا تخلص فردوسی رکھا اسی طرح حکیم عمر نے اپنا تخلص خیام اور شیخ فریدالدین نے عطار رکھا تھا لیکن ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جب فردوسی سلطان محمود غزنوی کے دربار میں حاضر ہوا تو اُس نے سلطان کے منظور نظر غلام ایاز کی شان میں اس قدر عمدہ قصیدہ پڑھکر سُنایا کہ سلطان پھڑک گیا اور اُس کی

زبان سے بیساختہ یہ الفاظ نکلے کہ "اے شاعر طوس تو نے میرے دربار کو فردوس بنا دیا" اُسی وقت سے اُس نے اپنا تخلص فردوسی رکھا۔

جو مرتبہ رومیوں میں ورجل کی اینیاڈ، یونانیوں میں ہومر کی الیاڈ، سنسکرت میں بالمیک کی رامائن اور بیاس جی کی مہابھارت کو حاصل ہے وہی مرتبہ ایران میں فردوسی کے شاہنامہ کا ہے۔ جس نے ایرانیوں میں وحدت قومی کی روح پھونک کر تمام قوم کو بیدار کر دیا۔ فردوسی نے جو نسلاً عجمی تھا قومی روایات سے متاثر ہو کر اپنا مقصد زندگی قدیم شاہان ایران کے کارنامے نظم کرنا قرار دے لیا۔ نوشیرواں کے حکم سے سلطنت کے مختلف حصوں سے قدیم قومی روایات اور اسلاف کی داستانیں جمع کر کے ایک کتاب مرتب کر لی گئی جو شاہی کتبخانہ میں محفوظ تھی۔ ساسانیوں کے آخری دور میں اس کتاب میں مزید اضافہ کیا گیا اور ایک فاضل ایرانی "دہقان دانشور" نے بہت سے موبدوں (علمار دین زرتشت) کی مدد سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی جس کا نام "خدائے نامہ" رکھا گیا۔ یہ کتاب ایران میں بہت مقبول تھی۔ اس کتاب کا ترجمہ عبداللہ بن مقفع نے کر کے اس کا نام "سیر الملوک الفرس" رکھا۔ جسے فارسی میں "پاستان نامہ" بھی کہتے ہیں۔ الغرض ایران قدیم کے متعلق فارسی عربی زبانوں میں بہت سی کتابیں موجود تھیں جن سے فردوسی نے استفادہ کیا۔ چنانچہ مرزا ہدایت اپنی کتاب مجمع الفصحا میں لکھتے ہیں :-

"قدیم تاریخی کتابوں میں ایک جاماسپ نامہ ہے جس میں شاہان ایران کا ذکر ہے۔ دوسری کتاب "آئین بہمن" ہے جو بہمن کے احوال میں ایک داراب نامہ ہے، ایک دانش افزائے نوشیروانی ہے جس کا جامع حکیم بزرگ مہر تھا۔ دیگر کتابیں پاستان نامہ۔ دانشور نامہ و خرد نامہ ہیں جن سے حکیم ابوالقاسم محمد بن منصور فردوسی نے شاہان عجم کے کارنامے معلوم کئے۔"

لیکن فارسی زبان میں ایران قدیم کی مستقل تاریخ سب سے پہلے ابوعلی محمد بن احمد بلخی نے مرتب کی، جس کا نام "شاہنامہ" رکھا۔ یہ کتاب عربی و فارسی کی متعدد کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھی گئی تھی۔

سلاطین آل سامان خالص عجمی النسل بادشاہ تھے جن کا سلسلۂ نسب بہرام چوبین تک پہونچتا تھا۔ اس خاندان کی ہمیشہ یہ خواہش تھی کہ اُن کے بزرگوں کی داستانیں نثر سے نظم میں منتقل ہو کر قبولیت عامہ حاصل کریں۔ چنانچہ جب ۳۶۵ھ میں نوح بن منصور تخت نشین ہوا تو اس نے بخارا کے مشہور زمانہ شاعر منصور بن احمد دقیقی کو جس کا اس زمانہ میں طوطی بول رہا تھا طلب کر کے شاہنامہ نظم کرنے کی فرمائش کی۔ جس نے بقول فردوسی :-

ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار — بگفت و سر آمد ورا روزگار

یعنی دقیقی نے گشتاسپ سے لیکر ارجاسپ تک شاہنامہ کے ایک ہزار شعر لکھے تھے کہ

یکایک از و بخت برگشتہ شد — بدست یکے بندہ کشتہ شد

یکایک اپنے ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہوا۔ فردوسی نے دقیقی کے یہ اشعار اپنے شاہنامہ میں داخل کر لئے۔ چنانچہ فردوسی اس کا اقرار اس طرح کرتا ہے۔

چناں دید گوینده یک شب بخواب — کہ یک جام مے داشتے چوں گلاب

دقیقی ز جاۓ پدید آمدے — بداں جام مے داستانہا زدے

بہ فردوسی آواز دادے کہ مے — مخور جز بہ آئین کاؤس کے

... ...

از اندازہ من بیش گفتم سخن — اگر باز یابی بخیلی مکن

ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار — بگفتم سر آمد مرا روزگار

گر آں مایہ نزد شہنشہ رسد — روان من از خاک بر مہ رسد

بداند کہ پیش از تو آخر کسے — دریں داستاں رنج بردش بسے

بپذیرفتم و داشتم زو سپاس — مرا در دل آمد ز ہر سو ہراس

کہ روزے مرا ہم بباید گزشت — ز گفتار او در نشاید گزشت

ز گفتار او بشنو اکنوں سخن — کہ گفت است این داستان کہن

اس کے بعد فردوسی نے دقیقی کے ایک ہزار اشعار لکھے ہیں۔

دقیقی کے بعد شاہنامہ کے نظم کرنے کا سلسلہ موقوف رہا، آخر سلطان محمود غزنوی کا زمانہ آیا جو علم و فن کا بڑا قدردان تھا۔ کسی ذریعہ سے سلطان کے ہاتھ پاستان نامہ کا ایک نسخہ لگ گیا جسے پڑھکر اس نے سات داستانیں منتخب کیں اور اپنے دربار کے سات مختلف شاعروں کو ایک ایک داستان نظم کرنے کے لئے دی تاکہ ہر شخص کی قابلیت کا اندازہ ہو سکے۔ عنصری کو رستم و سہراب کی داستان سپرد کیگئی تھی جسے سلطان نے سب سے زیادہ پسند کیا اور اس کے بعد عنصری کو پورا شاہنامہ نظم کرنیکا حکم دیا۔

فردوسی اس وقت طوس میں تھا، دقیقی کے اشعار اس کے ہاتھ لگ چکے تھے۔ چنانچہ اس نے دقیقی کے بعد سے "شاہنامہ" کا سلسلہ شروع کیا۔ فردوسی کا بیان ہے کہ اس نے "شاہنامہ" کی بنیاد ایک قدیم کتاب پر رکھی جو تقریباً دو ہزار سال پیشتر کی تھی۔

یکے نامہ دیدم پُر از داستاں   سخنہائے آں پُرمنش داستاں
فسانہ کہن بود و منثور بود   طبائع ز پیوند او دور بود
گذشتہ برو سالیاں دو ہزار   گر ایدوں کہ برتر نیاید شمار
گرفتم بگوینده برآفریں   کہ پیوند را راه داد اندریں

لیکن یہ قول قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ فردوسی سے دو ہزار سال پہلے ایران کی جو زبان ہوگی وہ ژندو اوستا کی زبان ہوگی۔ پہلوی نہ ہوگی۔ اس لئے اس کتاب کے سمجھنے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ خود فردوسی اس قدیم زبان سے واقف تھا یا اُسے اس زبان کا کوئی ماہر مترجم مل گیا تھا لیکن ان دونوں سے کسی بات کا ثبوت نہیں ملتا، اس لئے ہمارے نزدیک صاحب مجمع الفصحاء کا قول جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں زیادہ صحیح ہے۔

فردوسی نے رستم و شغاد کا قصہ شروع کرتے ہوئے تمہید میں لکھا ہے کہ سام بن نریمان کی اولاد سے ایک بڈھا احمد بن سہل کے دربار میں تھا جس کے پاس قدیم سلاطین عجم کی تاریخ تھی اور رستم کی بہت سی داستانیں اس کو زبانی یاد تھیں۔ اسی شخص سے لیکر شغاد کا قصہ نظم کیا گیا۔

بہر نوع دقیقی کے بعد سب سے پہلے فردوسی نے شاہنامہ نظم کرنے کا بیڑہ اُٹھایا، سلطان محمود کے دربار تک رسائی سے پیشتر وہ اپنی عمر عزیز کے بیس برس اسی شغل میں صرف کر چکا تھا جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے:-

من ایں نامہ فرخ گرفتم بفال   ہمی رنج بردم بہ بسیار سال
ندیدم سرافراز بخشندهٔ   بگاهِ کیاں بر نشینندهٔ
سخن را نگہ داشتم سال بیست   بداں تا سزاوار ایں گنج کیست
جہاندار محمود با مزد و جود   کہ اورا کند ماه و کیواں سجود

اس بیان سے فردوسی کا ایک مقصد اپنے اسلاف کا نام زندہ و مشہور زمانہ کرنا بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ وہ شاہنامہ کی وجہ تصنیف میں خود بتاتا ہے۔

ہمی خواہم از دادگر یک خدائے   کہ چنداں بمانم بہ گیتی بہ جائے
کہ ایں نامۂ شہریاران پیش   بہ پیوندم از خوب گفتار خویش
بسے رنج بردم دریں سال سی   عجم زندہ کردم بدیں پارسی
ہمہ مرده از روزگارِ دراز   شد از گفت من نام شاں زنده باز
چو عیسیٰ من ایں مردگاں را تمام   سراسر ہمہ زندہ کردم بنام

بے انگشتم از نظم کاخ بلند کہ از باد و باراں نیابد گزند

اِن اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے اپنا شاہنامہ تیس سال میں مکمل کیا۔

فردوسی نے پہلے زوال جمشید اور ترقی ضحاک کی داستان نظم کرکے اپنے دوستوں کو سنائی اور جب یہ عام طور پر پسند کی گئی تو اُس نے شاہنامہ نظم کرنے کا شغل جاری رکھا۔ وہ فکرِ معاش سے آزاد تھا کیونکہ آبائی جائداد کی آمدنی کے علاوہ طُوس کا صوبہ دار ابو منصور بھی اس کی سرپرستی کرتا تھا۔ ابو منصور کے بعد طوس کا گورنر ارسلان خاں مقرر ہوا۔ شاہنامہ کا جو دیباچہ امیر بائسنقر بہادر شاہ کے عہد میں لکھا گیا تھا اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فردوسی کے شاہنامہ کا شہرہ دُور دُور ہو چلا تھا۔ رفتہ رفتہ جب سلطان محمود غزنوی کو اس کا حال معلوم ہوا تو اُس نے اپنے عامل ارسلان خاں کی معرفت فردوسی کو غزنی طلب کیا جب فردوسی وطن سے چلکر ہرات پہونچا اور دربار محمود کے شاعروں کو اُس کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت سراسیمہ ہوے، کیونکہ سلطان کو مدت سے شاہنامہ نظم کرانے کا خیال تھا لیکن ابھی تک اُس کے درباری شاعروں میں سے کوئی بھی اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا تھا اس لئے اُنھوں نے آپس میں سازش کرکے فردوسی کو ایک خط لکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ تمہارا غزنی آنا فضول ہے۔ فردوسی یہ خط پاکر ہرات ہی میں رُک گیا۔ لیکن چند روز بعد جب سلطان کے میر منشی بدیع الدین کا خط اُس کی طلبی کو پہونچا تو وہ اس خط کی ہدایت کے بموجب غزنی کی طرف روانہ ہوگیا۔ فردوسی نے اس خط کے جواب میں میر منشی کو دو شعر لکھ بھیجے تھے جو درج ذیل ہیں:۔

بکوشش از سروشم بسے مژدہاست دلم گنج گوہر زباں اژدہاست

چہ سنجد سخن سنجی عنصری گیا چوں کشد پیش گلبن سری

غزنی پہونچکر فردوسی نے اپنے دوستوں کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ اور ایک باغ کے قریب ٹھہر گیا اسی باغ میں دربارِ محمود کے تین سربرآوردہ شعرا عنصری۔ فرخی۔ عسجدی بزمِ نشاط جمائے بادہ و جام کا شغل کررہے تھے۔ فردوسی بھی ٹہلتا ہوا ادھر کو جانکلا۔ ان لوگوں کو ایک اجنبی شخص کا اس طرح مخل صحبت ہونا قدرتاً ناگوار ہوا مگر بدکلامی سے اسے نکال دینا خلاف تہذیب سمجھکر ان تینوں نے یہ مشورہ کیا کہ رباعی کی بحر میں ایک برجستہ مصرعہ کہا جائے اگر اجنبی اس کا چوتھا مصرعہ لگاکر اس کو مکمل کردے تو فبہا ورنہ خود شرمندہ ہوکر چلا جائیگا۔ عنصری نے کہا ع

چوں عارض تو ماہ نباشد روشن

فرخی نے مصرعہ لگایا
مانند رخت گل نبود در گلشن

عسجدی نے کہا:۔

مژگانت ہمی گذر کند از جوشن

اِس پر فردوسی نے برجستہ کہا:۔

مانندِ سنانِ گیو در جنگ پشن

اِس معرکہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ قافیہ میں "شن" کا آنا ضروری تھا اور پہلے تین قافیوں کے بعد کوئی شگفتہ قافیہ باقی نہیں رہا تھا، لیکن فردوسی نے مصرعہ لگا کر کمال دکھادیا۔ مگر چونکہ مصرعہ تلمیح طلب تھا اس لئے فردوسی نے جنگ پشن کی تفصیل بیان کی تو سب دنگ رہ گئے اور آتش حسد سے فردوسی سے جل گئے۔

مگر جب بخت یاور اور ستارۂ اقبال چمکنے کو ہوتا ہے تو اُس کے اسباب پردۂ غیب سے خود بخود پیدا ہوجاتے ہیں چنانچہ روایت ہے کہ سلطان محمود کے دربار میں ماہک نامی ایک شخص صاحب مذاق سلیم تھا جس سے اسی باغ میں فردوسی کی ملاقات ہوگئی اور وہ فردوسی کی قابلیت اور شیریں کلامی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُسے اپنے گھر لے آیا اور اپنے یہاں ٹھہرالیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سلطان محمود نے ایران قدیم کے سات مختلف فسانے نظم کرنے کے لئے اپنے دربار کے سات شاعروں کو سپرد کئے تھے۔ ماہک نے شاہنامہ کی تصنیف اور شاعروں کے انتخاب کا ذکر کیا اور یہ بھی بیان کیا کہ ملک الشعراء عنصری نے رستم و سہراب کی داستان نظم کرکے دربار میں سنائی ہے جسے سلطان نے بہت پسند کیا اور بقیہ شاہنامہ کی تکمیل کا کام بھی عنصری کے سپرد کردیا۔

رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد فردوسی نے بھی رستم و سہراب کی داستان نظم کرکے دوسری صبح کھانے کے وقت ماہک سے کہا کہ عنصری سے پہلے ایک اور شاعر اسی داستان کو نظم کرچکا ہے جس کے سامنے عنصری کے اشعار کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر موقع ملے تو آپ اسے سلطان کو سنادیجئے۔

ماہک نے ایک روز موقعہ پاکر وہ نظم سلطان محمود کے سامنے پیش کردی اس کی تمہید یہ تھی:۔

کنوں خورد باید مے خوشگوار   کہ می بوئے مشک آید از جویبار

ہوا پر خروش و زمیں پُر ز جوش   خنک آنکہ دل شاد دارد ز نوش

ہمہ بوستاں زیرِ برگِ گل است   ہمہ کوہ پُر لالہ و سنبل است

درم دارد و نقل و ناں و نبید   سر گوسفندے تواند برید

یہ اشعار سنتے ہی سلطان محمود بھڑک گیا۔ ماہک نے کل حال بیان کر دیا، چنانچہ اسی وقت فردوسی کی طلبی ہوئی اور محمود نے اس سے طوس کی مفصل تاریخ دریافت کی جسے فردوسی نے بیان کر دیا۔ سلطان نے اپنے ساتوں شاعروں کو بلا کر وہ داستان سنوائی، سب دنگ رہ گئے اور تعریف کی۔ سلطان نے خلعت عطا کی اور فردوسی کو شاہنامہ کی تصنیف کا کام سپرد کر دیا۔ قصر شاہی کے قریب ایک عالیشان محل رہنے کو دیدیا جو قدیم وجدید آلات جنگ اور شاہان وبہادران وپہلوانانِ عجم کی تصویروں سے خوب آراستہ تھا، فی شعر ایک اشرفی صلہ ٹھہرا، اور حکم دیا گیا کہ جب ایک ہزار شعر پورے ہو جائیں تو ہزار اشرفیاں دیدی جایا کریں۔ لیکن فردوسی نے اپنا صلہ یکمشت لینے پر اصرار کیا جس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس رقم سے فردوسی اپنے لڑکے اور لڑکی کی شادیاں کرنا چاہتا تھا۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ فردوسی اپنے باغ واقع طوس میں جس چشمہ کے کنارے بیٹھکر آب رواں کا لطف اٹھایا کرتا تھا اس کا بند برسات کے زمانہ میں ٹوٹ جاتا تھا۔ وہ اس بند کو اس صلہ کی رقم سے پختہ کرانا چاہتا تھا۔

بہر صورت فردوسی نے چار سال تک غزنی میں قیام کیا اور شاہنامہ کی تصنیف میں مصروف رہا۔ اس کے بعد وہ طوس آکر کام کرتا رہا اور وہاں سے غزنی واپس آکر مکمل شدہ داستانیں سلطان کو سناتا رہا۔

مگر افسوس کہ شاہنامہ کی تصنیف ہی کے دوران میں جب فردوسی کی عمر پینسٹھ [۶۵] سال کی تھی تو اس کے جوان بیٹے نے ۳۷ سال کی عمر میں داغ مفارقت دیا جس سے فردوسی کو سخت صدمہ ہوا، چنانچہ وہ شاہنامہ میں اس طرح اظہار رنج والم کرتا ہے۔

مگر بہر بانِ جواں یافتی ۔۔۔ کہ از پیشِ من تیز بشتافتی
جواں را چو شد سال بر سی وہفت ۔۔۔ نہ بر آرزو یافت گیتی ورفت
مرا شصت وپنج و ورا سی وہفت ۔۔۔ نپرسید ازیں پیر و تنہا برفت

دنیائے ادب کا سب سے بڑا افسوسناک واقعہ یہ ہے کہ فردوسی کو اس کی دماغ سوزی اور جانفشانیوں کا حسب وعدہ صلہ نہیں ملا، یعنی ایک اشرفی فی شعر کا وعدہ تھا جس کی جگہ اسے ایک درہم فی شعر دیا گیا۔ اس واقعہ کے متعلق متعدد روایتیں ہیں، مثلاً:۔

۱۔ دولت شاہ سمرقندی کی روایت یہ ہے کہ چونکہ فردوسی نے سلطان محمود کے منظور نظر غلام ایاز کی کبھی خوشامد نہیں کی اس لئے اس نے اس کی طرف سے سلطان کے کان بھر دیئے اور اس کو فردوسی

کے مذہبًا شیعہ ہونے کا یقین دلا دیا۔

۲۔ چہار مقالہ میں نظامی عروضی نے لکھا ہے کہ خواجہ حسن میمندی فردوسی کا سرپرست و مربی تھا مگر اہل دربار کا ایک بہت بڑا گروہ خواجہ کا دشمن تھا اور ان لوگوں نے سلطان کو فردوسی کے خلاف برگشتہ کر دیا۔

۳۔ عہد بائسنقر کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ فردوسی کی تباہی کا باعث خود حسن میمندی ہوا، جس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اطراف و جوانب سے لوگ فردوسی کو تحائف بھیجتے تھے اور یہ بات حسن کو ناگوار گذرتی تھی۔ علاوہ ازیں حسن میمندی مذہبًا خارجی تھا اور فردوسی شیعہ۔

۴۔ دیلمی خاندان کے سلاطین شیعہ مذہب تھے اور سلطان محمود کو ان سے سخت عداوت تھی۔ فخرالدولہ دیلمی فردوسی کا بڑا قدردان تھا۔ چنانچہ جب اُس نے رستم و اسفندیار کی داستان سنی تو فردوسی کو ایک ہزار اشرفیاں بطور صلہ ارسال کر کے اسے اپنے دربار میں بلایا۔ مگر جب اس کا حال محمود کو معلوم ہوا تو اُسے سخت ناگوار گذرا۔

بایں ہمہ سلطان کو فردوسی کی محنت و قابلیت کا کافی احساس تھا اور اس نے حکم دیا کہ ساٹھ ہزار اشعار کے صلے میں ساٹھ ہزار اشرفیاں ایک ہاتھی پر بار کر کے فردوسی کے پاس بھیجدی جائیں، لیکن ایاز ساٹھ ہزار اشرفیوں کے بجائے ساٹھ ہزار درہم (چاندی کا سکہ) لیکر فردوسی کے پاس پہونچا۔ کہتے ہیں کہ فردوسی اس وقت ایک حمام میں نہا رہا تھا مگر شاہی انعام کی خبر سُنکر وہ بیتاب ہو کر حمام سے نکل آیا۔ لیکن جب ایاز نے اشرفیوں کے بجائے درہموں کی تھیلیاں پیش کیں تو اس کا دل ٹوٹ گیا، اُس نے اس کی کو اپنی توہین سمجھا، اور غصہ میں آ کر بیس ہزار درہم حمام والے کو، بیس ہزار شیرینی فروشوں کو اور بیس ہزار صلہ لانے والے غلام کو عطا کر دیئے اور کہلا بھیجا کہ "میں نے یہ خونِ جگر ان درہموں کے لئے نہیں کھایا تھا"۔

ایاز نے واپس آ کر یہ تمام کیفیت سلطان سے بیان کی تو سلطان بہت ناخوش ہوا اور اس حرکت کو اپنی بدنامی و رسوائی کا باعث خیال کر کے فوراً حسن میمندی کو طلب کر کے جواب طلب کیا۔ لیکن حسن ان باتوں میں بہت چالاک تھا، اُس نے تمام الزام فردوسی کے سر تھوپ دیا اور سلطان سے کہا کہ "فردوسی نے ایسی حرکت کر کے سلطان کی شان میں واقعی بڑی گستاخی کی ہے اُسے چاہیئے تھا کہ سلطان اُسے خاک کی چٹکی بھی بھیج دیتا تو اُسے آنکھوں سے لگاتا"۔ سلطان کو یہ جواب پسند آیا اور اُس نے کہا کہ "اچھا کل میں اس قرمطی کو اس گستاخی کا مزا چکھاؤنگا"۔ چنانچہ سلطان نے دوسرے روز صبح کو حکم دیدیا کہ فردوسی کو ہاتھی کے پاؤں تلے روند دیا جائے۔

جب اس حکم کی خبر فردوسی کو ہوئی تو بہت سٹ پٹایا، اور سلطان محمود کی خدمت میں حاضر ہوکر قدموں پر گر پڑا اور عرض کیا:۔

چو، ملک سلطان کہ چرخش ستود بسے ہست ترسا و گبر و یہود
گزیفند در ظل عدلش قرار شدہ ایمن از گردش روزگار
چہ باشد کہ سلطان گردوں شکوہ رہی راشمارد یکے زاں گروہ

سلطان فردوسی کی قابلیت کا تو قائل تھا ہی، یہ لجاجت دیکھکر اُسے رحم آگیا اور فردوسی کو معاف کردیا۔

اس کے بعد کے واقعات کے متعلق بھی دو بیانات ہیں، ایک روایت تو یہ ہے کہ فردوسی کے دل پر جو زخم لگا وہ مندمل نہ ہوسکا۔ چنانچہ اُس نے سلطان محمود سے انتقام لینے کی فکر کی اور شاہنامہ کا جو نسخہ اس نے شاہی کتب خانہ کو دیا تھا اُسے لیکر اس میں فی البدیہہ سلطان محمود کی ہجو لکھکر اضافہ کردی اور فوراً غزنی سے فرار ہوگیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ فردوسی غزنی سے چلتے وقت ایاز کو ایک سربمہر لفافہ دیکر اور یہ درخواست کرکے کہ اسے سلطان کو بیس دن کے بعد دیدیا جائے، ہرات کو چل دیا۔ بیس روز بعد جب لفافہ کھولا گیا تو اس میں سلطان محمود کی ہجو کے یہ اشعار تھے۔

یکے بندگی کردم اے شہریار کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
پے افگندم از نظم کاخ بلند کہ از باد و باراں نیابد گزند
بسے رنج بردم دریں سال سی عجم زندہ کردم بدیں پارسی
چو بر باد دادند گنج مرا نہ بد حاصلے سی و پنج مرا
اگر شاہ را شاہ بودے پدر بسر بر نہادے مرا تاج زر
وگر مادر شاہ بانو بدے مرا سیم و زر تا بزانو بدے
پرستار زادہ نیاید بکار وگر چند دارد پدر شہریار
سر ناسزایاں برافراشتن وز ایشاں امید بہی داشتن
سر رشتۂ خویش گم کردن است بجیب اندروں مار پروردن است
درختے کہ تلخ است وے را سرشت گرش بر نشانی بباغ بہشت
ور از جوے خلدش بہنگام آب بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب
سر انجام گوہر بکار آورد ہماں میوۂ تلخ بار آورد

زبد اصل چشم بہی داشتن   بود خاک در دیدہ انباشتن
ازاں گفت ایں بیت ہائے بلند   کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا   بماند ہجا تا قیامت بجا

فردوسی کی یہ پیشگوئی جو آخری شعر میں ہے حرف بحرف پوری ہوئی، کیونکہ اب نہ محمود ہے نہ سلطنت غزنوی ہی باقی ہے لیکن فردوسی کی یہ ہجو ہنوز باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ لیکن ان روایات کی صحت بہت مشکوک ہے۔ کیونکہ سلطان محمود کے فردوسی کی جان بخشی کرنے کے بعد اس کا شاہی کتب خانہ سے لیکر شاہنامے میں ہجو کا اضافہ کرنا قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ ہم کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے اِن اشعار کا اضافہ سلطنت غزنوی سے باہر نکل کر اپنے ذاتی نسخہ میں کیا ہوگا مگر اس کے بعد یہ اشعار دنیا بھر میں مشہور ہو گئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب فردوسی غزنی سے بھاگا تو اُس کے پاس ایک چادر اور عصا کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مگر ایاز نے خفیہ طور پر اُسے کچھ زادِ راہ بھجوا دیا تھا۔ فردوسی غزنی سے ہرات اور وہاں سے طوس پہونچا۔ طوس سے قہستان گیا جہاں کا گورنر ناصر لک تھا۔ یہ شخص اگرچہ فردوسی کا بڑا قدر دان تھا مگر وہ بھی سلطان کے خوف سے فردوسی کو زیادہ عرصہ تک ٹھہرا نہ سکا، بالآخر وہ قہستان سے نکلکر ماژندران پہونچا جہاں کا فرمانروا اس وقت سپہبد تھا۔ اگرچہ کچھ دنوں وہ یہاں آرام سے رہا لیکن سپہبد نے بھی فردوسی کو کچھ دے دلا کر اپنے پاس سے چلتا کیا۔ ماژندران سے وہ بغداد آکر خلیفہ عباسی کے پاس رہنے لگا جہاں اُس نے یوسف زلیخا لکھی۔

تذکرہ نویسوں کا یہ لکھنا کہ سلطان محمود نے فردوسی کی گرفتاری کا حکمنامہ جاری کر دیا تھا اور بغداد کے خلیفہ کو بھی دھمکی دی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی تردید ذیل کے واقعہ سے ہوتی ہے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ جب سلطان محمود ہندوستان کی کسی مہم سے واپس آرہا تھا تو راستہ میں کسی دشمن کا قلعہ ملا اُس نے فوراً خط بھیجکر اطاعت طلب کی۔ اتفاق سے جواب خط آنے میں دیر ہوئی تو سلطان مضطرب ہوا اور اُس نے اپنے وزیر سے کہا کہ اگر ہمارے خط کا جواب خاطر خواہ نہ آیا تو کیا ہوگا؟ اُس کے جواب میں وزیر نے فردوسی کا یہ شعر پڑھا:۔

اگر جز بکامِ من آید جواب   من و گرز و میدان و افراسیاب

سلطان یہ شعر سنتے ہی پھڑک گیا اور پوچھا کہ کس کا شعر ہے، وزیر نے عرض کیا کہ اُسی فردوسی کا جس نے سالہا سال خونِ جگر کھایا اور ناکام رہا۔ سلطان کو بہت افسوس ہوا اور اس نے غزنی پہونچتے ہی

ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے پاس روانہ کردیں۔ لیکن ادھر تو یہ اشرفیاں طوس کے دروازہ "باب رودبار" سے شہر میں داخل ہو رہی تھیں، اُدھر شہر کے دوسرے دروازے سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔

ہائے کس وقت ہوئیں دونوں مرادیں حاصل
یار بالیں پہ جب آیا تو قضا بھی آئی

روایت ہے کہ مرتے وقت فردوسی کی کوئی اولاد نہیں تھی صرف ایک بہن تھی، صلہ کی اشرفیاں جب اس کی خدمت میں پیش کی گئیں تو اُس نے یہ کہکر کہ "میں بادشاہوں کی دولت لے کر کیا کرونگی" صلہ لینے سے انکار کردیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ فردوسی نے ایک بیٹی چھوڑی تھی جس نے یہ کہکر صلہ کی اشرفیاں لینے سے انکار کردیا کہ "جس چیز کی حسرت میں باپ مرگیا اس سے اس کی اولاد کیونکر فائدہ اُٹھا سکتی ہے"۔
جب اس واقعہ کی اطلاع سلطان محمود کو دی گئی تو اُس نے حکم دیا کہ وہ اشرفیاں امام ابوبکر اسحٰق کے حوالہ کردی جائیں تاکہ وہ فردوسی کی یاد میں ایک کاروانسرائے تعمیر کردے۔ فرہنگ رشیدی اور چہار مقالہ کے مطابق یہ سرائے "سرائے چاہ" کے نام سے مرو اور نیشاپور کے راستہ پر بنائی گئی تھی۔
فردوسی دنیا میں باقی نہیں لیکن شاہنامہ کی صورت میں اس کی یادگار ہمیشہ باقی رہے گی، فردوسی کا مزار جو طوس میں ہے اِس وقت زیارت گاہ عالم بنا ہوا ہے۔ قاضی نوراللہ شوستری نے لکھا ہے کہ عبداللہ ازبک نے فردوسی کا شاندار مقبرہ بنادیا تھا جس کی زیارت کو عام لوگ جاتے تھیں لیکن زمانہ کے انقلابات سے یہ مقبرہ کس مپرسی کی حالت میں پڑ کر تباہ ہوگیا، مگر شہنشاہ ایران رضاشاہ پہلوی نے اب اسے از سر نو تعمیر کرا دیا ہے، جہاں پچھلے سال حکومت ایران کی سرپرستی میں اسں شاعر اعظم کی وفات کی ہزار سالہ جوبلی غیر معمولی دھوم دھام سے منائی گئی اور تمام دنیا کے علما و فضلا اس میں شریک ہوئے، ہندوستان سے بھی کئی ادیب اس تقریب میں مدعو ہوئے تھے۔

پروگرام

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

اے شخص! اگر جوش کو تو ڈھونڈھنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا

اور صبح کو وہ ناظر نظارۂ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملے گا

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرارِ معانی
شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا

اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خوش اوقات
رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا

اور رات کو وہ خلوتیِ کاکل و رخسار
بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا

اور ہوگا کوئی جبر تو وہ بندۂ رنجور
مُردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا

از منشی تلوک چند صاحب محروم بی۔اے

((۱))

وہ میری ابتدائی شاعری کا دورِ رنگیں تھا
طبیعت شعر کہنے پر مجھے مجبور کرتی تھی
حسیں تھی کس قدر فطرت! سراپا حسن تھی گویا
یہ سحر آگیں نظاروں سے مجھے مسحور کرتی تھی

(۲)

نہ تھا میں واقفِ بزمِ مے و مینا۔ مگر پھر بھی
اُچھلتا تھا مرا دل جب گھٹائیں گھر کے آتی تھیں
سُرور انگیز تھیں کیسی ہوائیں آہ! ساون کی
جو فردوسِ تصور سے پیامِ شوق لاتی تھیں

(۳)

نمایاں رہگزاروں میں لہک تھی سبزہ زاروں کی
نگاہوں میں مری بزمِ بہارِ حسن تھی دُنیا
نہ تھی ذوقِ نظر کو جستجو دلکش نظاروں کی
بہ فیضِ شوقِ پنہاں جلوہ زارِ حسن تھی دُنیا

(۴)

نظر آتا نہیں ہرگز کہیں اب چشمِ حیراں کو
فسونِ جاں فروزی وہ جو پتوں پر سحر میں تھا
نگاہیں ڈھونڈتی ہیں اُس طلسمِ جلوہ ساماں کو
جو تنویرِ سحر میں تھا کہ خود میری نظر میں تھا

(۵)

وہی آبِ رواں ہے اور عالم موجِ رقصاں کا
مگر دل میں تلاطم ان سے اب پیدا نہیں ہوتا
بہ سطحِ آب پرتو ہے وہی مہرِ درخشاں کا
مرے جذبات میں جوشِ طرب پیدا نہیں ہوتا

(۶)

سوادِ شام مثلِ سایۂ گیسوئے خوباں تھا
سکوتِ شہرِ خاموشاں مگر اب اسمیں پاتا ہوں
شفق میرے لئے خمخانہ تھا صہبائے رنگیں کا
نشانِ خونِ ارماں سر بسر اب اسمیں پاتا ہوں

(۷)

شبِ مہتاب ہنسنے کو تو ہنستی ہے مگر ہمدم!
کہوں کیا اِس ہنسی اور اِس ہنسی میں فرق کتنا ہے
گلِ تر کی ہنسی تھی وہ طرب کی بارشِ پیہم
ہنسی یہ زخم کی ہے جس کی صورت حسرت افزا ہے

(۸)

میں اب بھی شاعرِ رنگیں نوا مشہور ہوں لیکن	چھپاؤں تجھ سے کیا اے ہمنوا اپنی حقیقت کو
ضرورت مجھکو پڑتی ہے سخن آرائی کی جس دن	یہ مجبوری بہت مجبور کرتا ہوں طبیعت کو

رباعیاتِ محمود

(از جناب محمود اسرائیلی)

حقیقتِ کائنات

قطرہ ہی تو ہے گوہرِ تاباں کیا ہے	پتھر ہی تو ہے لعلِ بدخشاں کیا ہے
اک چاک ہے کوزہ گر کا دہرِ رقصاں	مٹی کا کھلونا ہے یہ انساں کیا ہے

تغیر پسندی

باراں کی جو کثرت ہو تو اس سے تکلیف	سورج کی حرارت ہو تو اس سے تکلیف
انسان کو نہیں چین کسی حالت میں	اِن دونوں کی قلت ہو تو اس سے تکلیف

جزائے اعمال

اخلاقِ جمیلہ کی جزا پاتا ہے	افعالِ خبیثہ کی سزا پاتا ہے
پھل نیکی بدی کے ملتے ہیں دنیا میں	انسان یہیں ان کا مزا پاتا ہے

مردمِ چشم

ہے مردمِ چشم اک تماشا گویا	شیشے میں اُتر رہا ہے نقشا گویا
ہے اوس کی بوند میں چمن کا پرتو	قطرے میں سما رہا ہے دریا گویا

وسعتِ شاعری

غنچے کے چٹکنے کی جو آواز ہے یہ	بزمِ طرب نطق کا اک ساز ہے یہ
منقارِ عنادل میں جو یہ نغمے ہیں	جادوئے سخن کا میرے اعجاز ہے یہ

اصلاح دیہات کا پروگرام

صحت کو بہتر بناؤ

از شیخ سعیدالدین احمد، محکمہ کوآپریشن (پنجاب)

اقوام کا عروج و زوال، سلطنتوں کی ترقی اور تنزل، اور ملوکیت کی فنا و بقا کا انحصار کلی طور پر قوم کے افراد کی مجموعی طاقت پر مبنی ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ طاقتور اقوام ہمیشہ کمزور قوموں پر حملہ آور ہوتی رہی ہیں، اور حکومت ہمیشہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو طاقت و ہمت میں اپنی ہمعصر اقوام پر فوقیت رکھتے تھے۔ اگر محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ حملہ آور قوم طاقت میں اہل ہند سے کہیں زیادہ تھی اور ہمارے آباؤ اجداد اس قابل نہ تھے کہ انکا مقابلہ کر سکیں۔ اسی طرح جس وقت ہمارے آباؤ اجداد یعنی آریاؤں نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا تو ہندوستان کے اصلی باشندوں میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ہمارے اسلاف کا مقابلہ کر سکیں، اِسی لئے وہ وسط ایشیا سے بلا روک ٹوک چلکر پنجاب اور گنگا جمنا کے میدانوں کو فتح کرتے اور بھارت ورش کے قلب کو چیرتے ہوئے نہاندی اور گوداوری کے کناروں تک پہونچ گئے۔ یہ تو کئی ہزار سال کا ذکر ہے، بابر کے حملے کو ابھی ہزار سال نہیں ہوئے، اس کی فوج نے ہندوستان میں وہ شجاعت دکھائی کہ رانا سانگا جیسے سورماؤں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور ابراہیم لودھی جیسے بادشاہ کو میدان کارزار میں موت نصیب ہوئی۔ شہنشاہ بابر کو یہ فتح اس کی فوج کی بہادری اور جوانمردی کی بدولت نصیب ہوئی۔ اسی طرح نادر شاہ دُرانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے بھی یہی بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ طاقتور اقوام ہمیشہ کمزور قوموں پر حملہ کرکے انھیں محکوم بنا لیتے ہیں۔ فی الحقیقت جس قوم کی صحت اچھی ہوتی ہے اس کے افراد تندرست توانا شجاع وجوانمرد اور نڈر ہوتے ہیں اور یہی صفات انھیں فاتح بنا دیتے ہیں، جہاں جاتے ہیں فتح و نصرت اُن کے قدم چومتی ہے اور کامرانی و کامیابی اُن کی پیشوائی کرتی ہے۔

بہر حال یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اعلیٰ صحت کا ملک گیری اور ملک داری سے بڑا تعلق ہے کمزور اقوام کو محکوم بنکر رہنا پڑتا ہے۔ آریاؤں کے حملے کے بعد ہندوستان کے اصلی باشندے اچھوت

کہلائے جس کا اثر ابھی تک باقی ہے۔ جس وقت وسطی ایشیا میں سے چراگاہوں کی تلاش میں ہمارے اسلاف پھرتے پھراتے ہندوستان پہونچے تو اُن کا کوئی مقابلہ نہ کرسکا اور وہ ہندوستان کے مالک بن گئے، اسی طرح مغلوں اور پٹھانوں نے جس وقت ہندوستان پر حملہ کیا تو ہمارے بزرگ اُن کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکے جس کی بدولت ہمیں سیکڑوں سال اُن کا محکوم رہنا پڑا۔ بہرصورت بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ اہل ہند کبھی نہ کرسکے اور اس کی اصل وجہ اُن کی صحت کی کمزوری ہے۔

غرض صحت کا اچھا ہونا ایک خاص نعمت ہے۔ صحت اچھی نہ ہوگی تو جسم میں اتنی توانائی ہی نہ ہوگی کہ اچھی طرح سے کوئی کام کیا جاسکے۔ جسمانی طاقت کے بغیر زراعت کا کام بھی پورے طور پر نہیں ہوسکتا ہے، اور جب تک زراعت پوری طرح سے نہ ہوگی غلہ کہاں سے آئیگا اور لوگ کیا کھائینگے۔ اس لیئے یہ بات حق الیقین ہے کہ صحت کے اچھا ہونے ہی سے دنیا میں گزر ہوسکتا ہے۔ تندرستی ہی سے آدمی میں کام کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اسی پر تمام کام کاج کرنے کا شوق منحصر ہے، اسی کے بھروسے سرگرمی کا اظہار ممکن ہے۔

صحت کو ترقی دینے کے بہت سے آسان طریقے ہیں جن پر ہمارے آباؤ اجداد کاربند تھے، کھلی اور تازہ ہوا، سادہ اور ہلکی غذا، تازہ اور صاف پانی۔ یہ سب چیزیں صحت کو بہتر بنانے کی ذمہ دار ہیں جسم کی صفائی اور لباس کی صفائی بھی تندرستی کے لئے بہت مفید ہے۔ ان اصولوں پر ہمارے زمیندار بھائی نہایت آسانی سے کاربند ہوسکتے ہیں، مگر یہ سخت افسوس کی بات ہے کہ جن چیزوں سے صحت بہتر بن سکتی ہے ہم ان سے اجتناب کرتے ہیں، ہم اپنی رہائش کے لئے اس قسم کے مکانات تعمیر کرتے ہیں جن میں ہوا کا گذر نہیں ہوتا۔ جب تک مکانوں میں کافی کھڑکیاں اور روشندان نہ ہونگے تازہ ہوا کہاں سے آئیگی اور جب تک تازہ ہوا نہ ملے صحت کو کیسے ترقی ہوسکتی ہے۔ دیہاتوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس کوٹھری میں لوگ سوتے ہیں وہیں مویشی بھی باندھے جاتے ہیں۔ ان کے تنفس کی کثیف اور غلیظ ہوا کمرہ کی تمام ہوا کو خراب کردیتی ہے۔ گوبر اور پیشاب کا تعفن ہوا کے ساتھ ملکر سانس کے ذریعہ سے پھیپھڑوں میں داخل ہوجاتا ہے جس کی بدولت صحت خراب ہوجاتی ہے۔

تازہ ہوا صحت کی بہتری اور بحالی کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے مگر ہم اس سے گریز کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی صحت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ اپنے مکانات میں روشندان لگوائیں، کھڑکیاں کھلوائیں اور سونے کی جگہ میں کبھی مویشی نہ باندھیں۔ محکمہ اصلاح دیہات پنجاب کے افسر اعلیٰ مسٹر ایف ایل۔ برین آئی۔ سی۔ ایس نے محکمہ حفظان صحت کے ڈائرکٹر سے ایک اچھے اور سستے روشندان کا

نمونہ تیار کرایا ہے جو حال کی لاہور نمائش میں دکھایا گیا تھا۔ اس روشندان سے کمرہ میں پوری طرح ہوا آتی ہے اور کوئی جانور از قسم چڑیا۔ کبوتر یا کوا کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے روشندان کی قیمت دو روپیہ کے اندر اندر ہے۔ ہمارے زمیندار بھائیوں کو چاہیئے کہ اپنے اپنے مکانات میں اس قسم کے مفید اور کارآمد روشندان لگوائیں تاکہ وہ ہر وقت تازہ اور صاف ہوا سے فائدہ اٹھا سکیں۔

تازہ اور صاف پانی بھی صحت کے لئے از حد ضروری چیز ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے کنوئیں صاف ستھرے رکھیں، مگر ہمارے ملک میں لوگ کنوؤں ہی پر کپڑے دھوتے اور غسل کرتے، مویشی نہلاتے، اور برتن صاف کرتے ہیں غرض پانی سے جو کام لیا جا سکتا ہے وہ کنوؤں ہی پر کرتے ہیں، حالانکہ اس سے کنوئیں میں غلیظ اور پلید پانی پڑتا رہتا ہے۔ کوئی بیمار نہائیگا یا کسی بیمار کے کپڑے دھوئے جائیں گے تو طرح طرح کے جراثیم کنوئیں کے پانی میں مل جائیں گے جس سے اس کا پانی خراب ہو جائے گا اور اس کے پینے سے طرح طرح کی بیماریوں کا احتمال رہیگا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ پینے کے پانی کے کنوؤں کی خاص احتیاط کی جائے اور انھیں ہر طرح صاف ستھرا رکھا جائے، ان کے گرد منڈیر بنا دی جائے اور ان کی سطح زمین سے اونچی بنائی جائے۔

اسی طرح جسم اور لباس کی صفائی بھی ضروری ہے، غسل کرنا بھی صحت کے لئے بہت ضروری ہے اس سے بدن کے تمام مسامات کھل جاتے ہیں اور پسینہ کے ذریعہ جسم کا تمام غلیظ مادہ خارج ہو جاتا ہے

یہ تمام باتیں نہایت آسان اور معمولی ہیں اور ہر شخص انھیں جانتا ہے، صرف عمل کی ضرورت ہے، ان باتوں کا ہماری روزانہ زندگی سے چولی دامن کا ساتھ ہے صحت اچھی ہو تو جسم کے تمام اعضاء قوی تندرست اور صحیح ہونگے اور دماغ میں سوچنے اور غور کرنے کی پوری قوت ہوگی جس کی بدولت ہم اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی تدابیر سوچ سکیں گے۔ دماغی حالت صحیح ہو تو ہم کہیں لاسلکی تیار کریں گے کہیں ٹیلیفون اور اسی قسم کی اور بہت سی چیزیں ایجاد کریں گے۔ لیکن اگر صحت اچھی نہ ہوگی تو تپ دق۔ کھانسی۔ دمہ۔ بخار۔ گٹھیا۔ اور اسی قسم کے بہت سے اور امراض میں مبتلا ہونگے اور ہمیں کسی معاملہ کو سوچنے یا غور کرنے کا وقت ہی نہ ملے گا۔ بیمار آدمی کے مزاج میں ایک خاص قسم کی چڑچڑاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے عقل و تدبّر کافور ہو جاتے ہیں ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں پوری طرح سے یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ ہم صحت کو بہتر بنانے کے تمام اصولوں پر کاربند رہیں اور بیماریوں سے بچنے کے لئے ہر طرح کی احتیاط کریں۔

پلیگ۔ ملیریا۔ ہیضہ چیچک اور دیگر وبائی امراض سے بچنے کے لئے ہمیشہ حفاظتی تدابیر اختیار کرنا چاہئے پلیگ یا طاعون کی بیماری چوہوں کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے اور ایک خاص قسم کے پسوؤں سے پھیلتی ہے۔

جو چوہوں کا خون چوستے رہتے ہیں اور جس وقت کوئی چوہا مر جاتا ہے تو اپنی خوراک کی تلاش میں انسانوں کو کاٹتے ہیں جس کی وجہ سے پلیگ کے جراثیم انسانی خون میں سرایت کر جاتے ہیں اور بالآخر ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔ پلیگ سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ چوہوں کو مکانوں میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ چوہے ہمیشہ ایسے مکانات میں ہونگے جہاں انھیں کھانے پینے کو ملے گا، اسلئے ہمیں چاہیئے کہ اناج اور دیگر کھانے پینے کی چیزوں کو حفاظت کے ساتھ اس طرح رکھیں کہ چوہوں کا گذر ہی نہ ہوسکے۔ غلہ اور آٹا وغیرہ ہمیشہ کنستروں اور کوٹھیوں میں بند رکھنا چاہیئے تاکہ چوہے کھا ہی نہ سکیں، جب چوہوں کو کھانے کے لئے کچھ نہ ملے گا تو وہ خود بخود اس مکان کو چھوڑ دیں گے۔

چوہے مکانات کے ہمیشہ تنگ و تاریک حصوں میں پائے جاتے ہیں، ہمیں چاہیئے کہ ایسے مکانات بنائیں جن میں کافی روشنی آسکے اور چوہوں کو رہنے کا موقع ہی نہ ملے۔ زمین پر ایسے پکے فرش لگوائیں جن میں چوہے بل نہ بنا سکیں، ان تدابیر پر عمل کرنے سے ہم پلیگ سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

ملیریا بھی ایسا موذی مرض ہے جو جسم میں ہمیشہ کے لئے اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے، ان دنوں لنکا میں ملیریا کا بڑا زور ہے، ناظرینِ زمانہ نے اکثر اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ وہاں لاکھوں نفوس اس نامراد مرض میں مبتلا ہیں جن میں سے تقریباً تین لاکھ اشخاص ہسپتالوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ ملیریا اپنے مریضوں کو اس درجہ نحیف اور مضمحل کر دیتا ہے کہ اس نقاہت کا اثر کئی سال میں بھی زائل نہیں ہوتا ہے بعض حالات میں اس کے مضر اثرات زندگی کو دوامی طور پر ناخوشگوار بنا دیتے ہیں۔ موسمی بخار ایک خاص قسم کے مچھروں سے پیدا ہوتا ہے جو "انفلیز" کہلاتے ہیں۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو ان مچھروں کو ہلاک کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ یہ مچھر پانی کے گڑھوں تالابوں کے کناروں مزبلوں اور گوبر کے اوپلوں پر پرورش پاتے ہیں، اس لئے ان مقامات کی خاص طور پر حفاظت کرنا چاہیئے۔ یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ انھیں صاف اور ستھرا رکھا جائے۔ گاؤں کے ارد گرد پانی کے تمام گڑھوں کو مٹی سے پُر کر دیا جائے تالابوں کے کناروں پر جو گھاس پھوس اُگی ہو اسے کاٹ دیا جائے اور کناروں کے ساتھ ساتھ جو پانی ہو اُس پر مٹی کا تیل ڈال دیا جائے۔ مزبلوں یعنی اُن مقامات کو جہاں گاؤں کا کوڑا کرکٹ جمع ہوتا ہے وہاں سے اُٹھا دیا جائے اور گاؤں کی تمام گندگی غلاظت اور کوڑا کرکٹ گڑھوں میں بند کر دیا جائے، اسی طرح گوبر کے اوپلے بھی نہ بنائے جائیں بلکہ کھاد کے گڑھے بنائے جائیں جن میں تمام کوڑا کرکٹ گوبر وغیرہ ڈال دیا جائے۔ ان تدابیر سے مچھروں کی پرورش نہ ہوسکے گی اور موسمی بخار بھی نہ پھیل سکے گا۔ بخار کی فصل میں مچھر دانی استعمال کی جائے۔ پنجاب کے محکمہ اصلاح دیہات نے

انجمنہائے امداد باہمی کی صنعتی انجمنوں سے دیہاتیوں اور غریبوں کے لئے ایک خاص قسم کی سستی مچھردانیاں صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ کی تیار کرائی ہیں تاکہ غریب لوگ بھی انھیں آسانی سے خرید سکیں اور گورنمنٹ نے بھی ان مچھردانیوں پر محصول معاف کر دیا ہے۔ اس قسم کی مچھردانیاں آرڈر دینے پر صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار صنعتی انجمنہائے امداد باہمی پنجاب لاہور سے منگائی جا سکتی ہیں۔ جن لوگوں میں مچھردانی خریدنے کی استطاعت نہ ہو وہ سوتے وقت ہاتھ پاؤں منہ اور دوسرے کھلے رہنے والے اعضا پر تیل کی مالش کر لیا کریں تو مچھر کا حملہ کارگر نہیں ہو سکتا۔

ملیریا کے دنوں میں کونین کا استعمال بھی نہایت ضروری ہے کونین ہر گھر میں ہمیشہ مرچ مسالہ کی طرح موجود رہنا چاہیئے۔ کمشنر صاحب اصلاح دیہات پنجاب نے نہایت اعلیٰ قسم کی کونین کی ٹکیاں تیار کرائی ہیں جو سستے داموں پر بکتی ہیں اور پنجاب میں "تپ توڑ" کے نام سے مشہور ہیں۔ بہرحال ہمارے تمام زمیندار بھائیوں کو موسمی بخار کے دنوں میں کونین کی ٹکیوں کو کاشتکاروں میں تقسیم کرنا چاہیئے

سطحی نگاہ سے ہمارے ملک میں موسمی بخار معمولی بخار سمجھا جاتا ہے جس کا اثر ملک کی اقتصادی حالت پر اس قدر بُرا پڑتا ہے کہ الامان والحفیظ۔ ملک کی مالی حالت کا انحصار پیداوار پر ہے اور فصل کے دنوں میں کاشتکاروں یا زمینداروں کا بیمار ہو جانا نہایت نقصان رسان ہے۔ اسی طرح شہروں میں موسمی بخار پھیل جائے تو کارخانوں میں مزدور کس طرح کام کر سکیں گے، اور جب بچارے مزدور کام نہ کریں گے تو اُن کے پاس نہ کھانے کو ہوگا اور نہ علاج کا کوئی بندوبست۔ لہٰذا موسمی بخار کی روک تھام کے لئے ہمیشہ وقت سے پہلے حفاظتی تدابیر اختیار کرنا چاہیئے۔

اسی طرح چیچک نہایت موذی مرض ہے۔ گذشتہ ایام میں صوبہ پنجاب میں چیچک نے جو اُدھم مچایا تھا وہ ہر کس و ناکس پر ظاہر ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس سے بچنے کے لئے ہم اپنے بچوں کو چیچک کا ٹیکہ لگوا دیا کریں۔

اِن باتوں پر عمل کرنے اور ہمیشہ صفائی کے ساتھ رہنے سے ہماری صحت بہتر بن سکتی ہے اور جب صحت اچھی ہوگی تو ہم طاقتور ہونگے، اور جب بدن میں طاقت ہوگی تو تمام کام اچھی طرح سے انجام دے سکیں گے وزراعت کا کام اچھی طرح ہوگا، صنعت وحرفت کا کام ذوق وشوق سے کیا جائیگا تعلیم میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا جائیگا اور جس وقت یہ تمام کام پوری تندہی اور سرگرمی سے کئے جائیں گے تو ہمارا ملک خوشحال ہوگا اور ہم مہذب و متمدن کہلائیں گے اور اصلاح دیہات کا کام خود بخود پایۂ تکمیل تک پہونچ جائیگا۔

رُودادِ بسنت

(از مسٹر جگی لال صاحب عنابی۔ اے ضیائی)

(۱)

جیسے ہم ڈھونڈھتے تھے، دل کی خلوتگاہ کے اندر
وہ جلوہ پھول بنکر ہو گیا محوِ خود آرائی
کوئی رنگین مزاج آیا ہے دادِ حسن دینے کو
جوانانِ چمن کرنے لگے سامانِ رعنائی
کہیں ہیں بربطِ آبِ رواں کے دلربا نغمے
کہیں ہیں شبنمی پھولوں کے ساغر ہائے صہبائی
دعا بنکر اُٹھی ہے موج رنگ و بو گلستاں سے
گھٹا بنکر فلک پر رحمتِ پروردگار آئی
ہوائیں مست ہو کر رقص کرتی ہیں فضاؤں میں
بسنتی پیرہن میں مسکراتے ہیں تماشائی
صنوبر ہے کہ آزادی نے گلشن میں ہوا باندھی
گلِ تر ہے کہ بزمِ عیش میں رنگین شہنائی
کہیں اپنی حقیقت ہی نظر آئی نہ ہو ہمدم
لبِ دریا ہے شاخِ پُر ثمر محوِ جبیں سائی
بہارِ روح پرور نے یہ کیا افسونِ نو پھونکا
کہیں لالہ تمنائی کہیں نرگس تماشائی
نگاہیں جس طرف اُٹھیں گل و سبزہ نظر آیا
کوئی فردوس سے رنگینیاں لیکر اُتر آیا

(۲)

بہارِ دلنشیں کے ہیں یہ معنی بزم دنیا میں
تجلی کا غبارِ رنگ و بو بنکر بکھر جانا
مگر گلزارِ قومی میں نئے معنی نکلتے ہیں
بہارِ دلنشیں ہے رنگِ عاشق کا نکھر جانا
گلاب و یاسمیں کو سینچنا خونِ تمنا سے
گل و غنچہ کو اپنی جان دے کر زندہ کر جانا
حقیقت رائے دھرمی کے حقیقت آشنا دل تے
اسی رمزِ محبت سے جہاں کو بے خبر جانا
بہارِ قوم کا آغاز اسی کا کارنامہ ہے
اسی کے دل کو دُنیا نے محبت کا ثمر جانا
وہ اُس کا دھرم پر قربان کرنا زندگی اپنی
وہ اُس کا اک دلیلِ زندگانی پیش کر جانا
وہ اس کا مرگِ ظالم کو سمجھنا کھیل بچوں کا
وہ اس کا کھیلتے ہی کھیلتے جی سے گزر جانا
وہ اس کا کھول دینا زندگانی کے معنے کو
وہ اُس کا اپنے لفظوں میں نئی تفسیر کر جانا

اگر انسان کے دل میں تمنائے شہادت ہو
یہ دنیا ایک جنت ہو یہ ہستی ایک نعمت ہو

(۳)

اگر اے ننگِ ہستی کچھ مذاقِ زندگانی ہے
شرارِ آرزو سے مردہ دل میں جان پیدا کر
بدل دے رنگِ نو سے زندگی کے نقشِ کہنہ کو
نئی دنیا نئی محفل نیا سامان پیدا کر
تری شمشیر کا جوہر جہاں کھل کر چمک اُٹھے
تو اپنی ہمتوں سے آپ وہ میدان پیدا کر
کہیں سیّاح بنکر وادیِ شمس و قمر میں جا
کہیں سیّار بنکر زندگی کی شان پیدا کر
کہیں ابرِ کرم بنکر گل و ریحاں میں ظاہر ہو
کہیں مہتاب بنکر بحر میں طوفان پیدا کر
زمانے کی طبیعت کا تقاضا ہے بدل جانا
بدل جس کا نہیں ممکن تو وہ ایمان پیدا کر
جو افسانہ لکھا جائے شہادت کا مزا آئے
تو اپنے خون کی سُرخی سے وہ عنوان پیدا کر

عمل سے ہی بہارِ گلشنِ دنیائے فانی ہے
عمل ہی زندگانی ہے عمل ہی زندگانی ہے

رُباعیاتِ جوشؔ

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

دریا کے عمق میں جا۔ حبابوں کو نہ دیکھ
اوراقِ چمن الٹ۔ کتابوں کو نہ دیکھ
بکھرے ہوئے اِک ذرۂ خاکی کے حضور
ڈوبے ہوئے لاکھ آفتابوں کو نہ دیکھ

انساں پہ ہے کس درجہ خرافات کا بار
دن کا ہے کبھی وزن۔ کبھی رات کا بار
پیدا ہو بشر میں کیا حکیمانہ مزاج
عقلوں پہ ہے صدیوں کے روایات کا بار

ہاں خود پہ نہ کھول حُسن کا باب اے دل
شعلہ کی ہے زندگی تب و تاب اے دل
افسردہ نہ بن کہ لوگ پہچانتے ہیں
چہرے نہیں چہروں کی فقط آب اے دل

رُباعیاتِ رشید

(از مسٹر محمد محسن ایم۔ اے)

زبان اُردو میں قریب قریب تمام اصنافِ سخن پر ابتدا ہی میں طبع آزمائی کی گئی ہے اور جس طرح دیگر اصنافِ شاعری کا آغاز دکن میں ہوا رُباعی نے بھی وہیں جنم لیا۔ قطب شاہی خاندان کے پانچویں بادشاہ سلطان محمد قلی کے دیوان ریختہ میں ہمیں تاریخ کے اعتبار سے دیگر شعرا سے پہلے کی رُباعیاں ملتی ہیں۔ وجدی کی تصنیف "مثنوی قطب مشتری" میں بھی چند رُباعیاں شامل ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے جس سے اُس وقت کی رُباعیوں کا کسی قدر اندازہ ہوگا:۔

تج یاد بنا ہور مجھے کام نہیں　　نس جاگتے جاتی ہے دن آرام نہیں
میں تو تجے منگتی او کہ جیو دئے　　تو کیوں مجے منگتا ہے سو کچ نام نہیں

یہاں پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اُردو شعرا نے اس صنف کے ساتھ بے انتہا تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرؔ و سوداؔ کے عہد تک اس میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی اور رُباعی اپنی ابتدائی حالت میں پڑی رہی، چنانچہ میرؔ و سوداؔ کی رباعیوں میں کسی قدر زبان کی صفائی اور بیان کا زور ضرور پایا جاتا ہے، مگر دردؔ۔ مومنؔ۔ ذوقؔ۔ غالبؔ کی رُباعیاں کوئی خاص جوہر نہیں رکھتیں، لیکن میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ نے اس صنف کو چار چاند لگا دیے۔ اُن کے زمانہ سے رُباعی کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے جس نے اس صنفِ کلام میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ رُباعی کو وہ موضوع ہاتھ آگئے جن کی اُسے تلاش تھی۔ تصوف۔ معرفت۔ حقیقت۔ حمد۔ نعت۔ حکیمانہ مضامین۔ مسائل اخلاق۔ تمدن و معاشرت اور دیگر مکارمِ اخلاق پر کثرت کے ساتھ رُباعیاں کہی گئیں اور مقبول ہوئیں، گو اس وقت تک ہماری زبان میں کوئی ایسا شاعر نہیں گذرا جس نے رباعی میں عمر خیام کے طرز کو اپنا مستقل موضوع شاعری قرار دیا ہو، لیکن مرثیہ گو شعرا نے کثرت سے رباعیاں لکھکر اور کافی نام و نمود بہم پہونچا کر اُردو شاعری کی ایک بہت بڑی کمی پوری کر دی۔

رُباعیات انیسؔ و دبیرؔ کے بعد توجہ کی مستحق رشیدؔ کی رُباعیاں ہیں، اور خصوصاً وہ جن میں شباب

کی باتوں اور پیری کی کارگذاریوں کا بیان ہے۔ رشید کو رباعی لکھنے کے فن سے پوری واقفیت تھی حشو وزوائد کا کیا ذکر وہ ہمیشہ کم سے کم الفاظ میں اپنے مطالب ادا کرتے تھے اور یہی رباعی کی شرطِ اول ہے۔ کیونکہ صرف چار مصرعوں میں کسی خیال کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کے واسطے شاعر کے لئے غیر ضروری الفاظ کا ترک کرنا لازمی امر ہے۔ رشید کی رباعیوں میں چوتھا مصرعہ ہمیشہ بہت چست اور زوردار گویا سابق کے تینوں مصرعوں کی جان ہوتا ہے۔ اسی وصف پر پوری رباعی کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ رشید نے رباعیوں میں عشقیہ مضامین بھی نظم کئے ہیں لیکن وہ عشق حقیقی سے تعلق رکھتے ہیں شاہد پرستی یا بوالہوسی سے انھیں دور کی بھی نسبت نہیں۔ مشہور ہے کہ مصیبت کے ایام کاٹے نہیں کٹتے لیکن عیش کے دن گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں، چنانچہ زندگی کی بہار کے زمانہ یعنی عہد شباب کے چشم زدن میں گذر جانے کو کس حسن سے بیان کرتے ہیں۔ رباعی

ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا ۔۔۔ کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا

کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری ۔۔۔ پیری کہتی ہے خواب دیکھا ہوگا

میر انیس اسی مضمون کو سلام کے ایک شعر میں کس خوبی سے نظم کرتے ہیں:-

"نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک ۔۔۔ ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا"

زباں زدِ خلائق ہے کہ انسان نعمت کی قدر وقت پر کم کرتا ہے لیکن جب وہ اُس سے سلب ہو جاتی ہے تو کفِ افسوس ملتا اور اُس کی ایک ایک بات کو حسرت سے یاد کرتا ہے۔ اسی مضمون کو رشید ایک رباعی میں کس شاعرانہ لطافت کے ساتھ نظم کرتے ہیں:-

وہ تیز زباں وہ خوش بیانی نہ رہی ۔۔۔ کیفیتِ باغ زندگانی نہ رہی

دیکھا بھی نہ ہم نے خوابِ غفلت میں تھے ۔۔۔ اب آنکھ کھلی کہ جب جوانی نہ رہی

روکھی پھیکی نصیحت سے بیزار ہو جانا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ رعونت سدِّ راہ ہو کر وعظ ونصیحت کو دل پر مطلق اثر نہیں کرنے دیتی لیکن جب اُس کا اظہار دَر پردہ اور نرم و شیریں الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے تو اُس کے نقوش دل پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ شعرا نے بھی یہی رویّہ اختیار کیا ہے کہ مسئلہ اخلاق کو روکھے پھیکے الفاظ میں ادا کرنے کے بجائے شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کی طبیعت منغّص نہ ہو اور نصیحت کارگر ہو جائے۔ موت سے انسان کی بیخبری کو کس شاعرانہ لطافت سے بیان کیا ہے:-

رکھتے نہ تھے خوف تھا جو چار اسپہ کو ۔۔۔ قوّت کا قوی کی تھا سہارا ہم کو

تنہا موت آ کے کیا بنا لیتی رشید پیری نے شریک ہو کے مارا ہم کو

رشید نے پیری کے متعلق متعدد رباعیاں کہی ہیں اور انھیں میں ان کے خاص جوہر بھی کھلتے ہیں۔ ضعیفی میں وہ پوچھنے والے سے اپنی حالت اپنی زبان سے نہیں بیان کرتے ہیں بلکہ جواب دیتے ہیں کہ:۔

ہر چند بہت ملول و دلگیر ہوں میں کیا فائدہ کیوں بیاں کروں، پیر ہوں میں
دیکھو مجھے پوچھنے سے کیا حاصل ہے پیری وہ ہے کہ جس کی تصویر ہوں میں

پیری کا ایک اور نظارہ ملاحظہ ہو:۔

دنیا کے نہ درد و رنج و غم کو دیکھو کس حال میں ہیں اہلِ عدم کو دیکھو
پیری کا نظارا ہے اگر مدِ نظر یارانِ شباب آؤ ہم کو دیکھو

پیری کی شکایت کے ساتھ زبان کی خوبی اور شاعرانہ اندازِ بیان کے لحاظ سے یہ رباعی بے مثل ہے۔

پیری وہ ہے کہ حسن کا مارا ہوں میں اے بھائیو مہمان تھارا ہوں میں
چھپ جاؤں نظر سے وہ ہے ہنگام قریب وقت اور ہے اب صبح کا تارا ہوں میں

پیری میں خمیدگیِ قد کی تعلیل کس حسن سے کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

بیتاب ہے یہ قلبِ حزیں اپنی طرف اور روح کو آرام نہیں اپنی طرف
پیری میں جھکے جانے کا باعث یہ ہے اب کھینچتی ہے ہم کو زمیں اپنی طرف

اسی مضمون کو ایک غزل گو کس خوبی سے نظم کرتا ہے:۔

کمر خمیدہ نہیں بے سبب ضعیفی میں زمین ڈھونڈھ رہے ہیں مزار کے قابل

مرزا دبیر نے بھی ایک رباعی میں اسی سے ملتے جلتے مضمون کو نظم کیا ہے، انھوں نے بھی دالِ قد میں خم ہونے سے یہ مطلب نکالا ہے کہ ملک عدم کی سیر کا وقت اور قریب آگیا۔

پیری سے جو دالِ قد میں خم اور ہوا دم تیز روِ ملکِ عدم اور ہوا
سمجھو نہ عصا سوئے عدم جانے کو دو پاؤں تو تھے ایک قدم اور ہوا

انیس کہتے ہیں:۔

ہوشیار کہ وقت سازِ برگ آیا ہے ہنگام یخ و برگ و تگرگ آیا ہے
محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا چلئے اب چوبدارِ مرگ آیا ہے

انیس و دبیر نے پیری کی ظاہری شکل یعنی کمر کی خمیدگی اور محتاج عصا ہونے کا اظہار کیا ہے، لیکن رشید نے ان کے ساتھ ساتھ روحانی تکالیف کا بھی بیان کیا ہے اور ایک وسیع تر مضمون نظم کرنے کے باعث انھیں ترجیح حاصل ہے۔

رشید نے خمیدگی کی تعلیل مختلف عنوانات سے کی ہے اور سب میں لطف پایا جاتا ہے' اس قسم کی دو رباعیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:۔

پیری نے جھکایا ہے سفر کرتا ہوں ۔۔۔ سب اہل زمیں کو یہ خبر کرتا ہوں
عالم کو جو خوب دیکھنا ہے منظور ۔۔۔ ذرے ذرے پہ میں نظر کرتا ہوں

اندوہ شباب ٹالنے کو خم ہوں ۔۔۔ یں قلب و جگر سنبھالنے کو خم ہوں
دونوں مرے پاؤں ہو گئے ہیں بیکار ۔۔۔ خار پیری نکالنے کو خم ہوں

شوخی اور زبان کی خوبی کے لحاظ سے ذیل کی رباعی اپنی آپ مثال ہے:۔

کچھ دن ابھی دنیا کی ہوا کھاؤنگا ۔۔۔ دونگا میں دعا چین اگر پاؤں گا
اتنا نہ جھکا کہ گر پڑوں اے پیری ۔۔۔ اب چھوڑ مجھے خاک میں مل جاؤنگا

میر انیس نے بھی چند رباعیوں میں پیری کی حالت نظم کی ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قوت تخئیل پر زیادہ زور نہیں دیا کیونکہ انھوں نے صرف معمولی و بدیہی باتوں کو بیان کیا ہے، مثلاً بالوں کی سفیدی، بدن کی لاغری وغیرہ جو عام باتیں ہیں، انھیں کو انیس نے شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ رباعی میں نظم کرنے پر اکتفا کی ہے۔ ذیل کی رباعیوں سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے:۔

پیری آئی غدار بے نور ہوئے ۔۔۔ یاران شباب پاس سے دور ہوئے
لازم ہے کفن کی یاد ہر وقت انیس ۔۔۔ جو مشک سے بال تھے وہ کافور ہوئے

پیری سے بدن زار ہوا زاری کر ۔۔۔ دنیا سے انیس اب تو بیزاری کر
کہتے ہیں زبان حال سے موئے سپید ۔۔۔ ہے صبح ازل کوچ کی تیاری کر

ان رباعیوں کا وصف ان کا شاعرانہ انداز بیان ہے، مثلاً اگر سیاہ بالوں کے سفید ہونے کو یوں ہی کہہ دیتے کہ بال سفید ہوگئے تو ایک معمولی بات ہوتی لیکن وہ شاعرانہ پیرایہ میں کہتے ہیں کہ مشک سے بال کافور ہوگئے۔ اس سے کلام میں بلندی آگئی۔ اس کے علاوہ ان رباعیوں میں

اور کوئی خاص وصف نہیں، لیکن رشید کی قوتِ تخیل نے اس معاملہ میں زیادہ غور و خوض سے کام لیا۔ اُنھوں نے عام اور بدیہی باتوں کو نظر انداز کر دیا اور جہاں پیری میں کسی خداداد نعمت کے سلب ہونے کا حال بیان کیا اس کے ساتھ ساتھ ایک شاعرانہ استدلال بھی پیش کر دیا جو بہت پُر لطف ہے۔ اس رباعی سے اس کا اندازہ ہوگا۔

آنکھیں گئیں حال اپنا دکھایا نہ گیا رخصت ہوا زور غم جو کھایا نہ گیا
پیری سے نہیں جھکے جوانی جو گئی خم ہو گئے بار جب اُٹھایا نہ گیا

اگر رشید بھی انیس کی طرح صرف یہی کہنے پر اکتفا کرتے کہ پیری میں آنکھیں جاتی رہیں تو بالکل غیر دلچسپ اور ایک بے اثر بات ہوتی لیکن وہ آنکھیں جانے کی علت اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ کلام مؤثر اور دلچسپ بن جاتا ہے:۔

امیر مینائی ایک شعر میں پیری کی تصویر کھینچتے ہیں، لیکن وہ انیس کی طرح نہال سفید ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور نہ رشید کی طرح خمیدگی قد کا بیان کرتے ہیں، دیکھئے اُن کی نظر انتخاب نے کن باتوں کو چن لیا ہے اور کس قدر کم الفاظ میں کیسی سچی و مؤثر تصویر پیش کرتے ہیں

"قدم کو لغزش۔ زباں کو لکنت ہے رعشہ ہاتھوں کو، سر میں جنبش
کہاں گئی ہائے نوجوانی، اِن آفتوں میں سپنا کر"

رشید ایک رباعی میں شباب و ضعیفی کا مقابلہ و موازنہ کرتے ہیں اور جوانی کو پیری پر ترجیح دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ گو جوانی گراں قدر تھی لیکن اِس زمانہ میں عناصر میں اعتدال قائم رہا تو پھر پیری میں جو اس سے کسی طرح گراں قدر نہیں، کیوں قوی مضمحل ہو گئے۔ ہاتھ پیروں میں لرزہ پیدا ہو گیا اور کمر جھک گئی؟

کیا بات ہے کس خوف سے تھرّاتا ہوں کچھ قوت و طاقت میں کمی پاتا ہوں
پیری تو جوانی سے گراں قدر نہیں کیا بوجھ پڑا ہے کہ جھکا جاتا ہوں؟

رشید نے اس رباعی میں جوانی کو پیری سے قوی تر نظم کرنے میں صرف اصلیت و حقیقت کی مطابقت کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ شاعری کی چاشنی بھی پیدا کر دی ہے، لیکن اُن کی قوتِ تخیل کی انتہا ہو گئی کہ اس مضمون کے بالکل برعکس یعنی پیری کو جوانی سے قوی تر ثابت کرتے ہیں اور کس خوش اسلوبی سے، ملاحظہ ہو:۔

کب کوئی بلا ناگہانی سے رُکی اک لحظہ نہ موت زندگانی سے رُکی

پیری کا نام گو ضعیفی ہے رشید　　　پر ایسی قوی ہے نہ جوانی سے زن

یہاں پہونچکر ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ رشید کے قلم نے پیری کے میدان میں جو جولانگاہی کی ہے اُس کی مثال اُردو ادب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اس میدان میں انیس کا قلم بھی پیچھے ہے۔ مگر رشید کی قوتِ تخیل بہت بلند ہے۔

ہر شاعر کے کلام میں زمانہ کے اعتبار سے فرق ضرور نظر آتا ہے بعض کلام مشق کے ابتدائی زمانہ کا بعض درمیانی اور بعض آخر عمر کا ہوتا ہے مؤخر الذکر زمانہ میں کلام بہت منجھا ہوا ہوتا ہے کیونکہ جس قدر عمر اور تجربہ کے ساتھ مشق سخن بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر کلام کا رُتبہ بھی درجہ بدرجہ وقیع ہوتا جاتا ہے اور زبان کی صفائی میں ترقی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ذیل کی رُباعیات رشید کی آخری عمر کی ہیں جن میں پختگی اور زبان کی صفائی حدِ کمال پر پہونچی ہوئی ہے۔

طفلی نہ رہی کہ تھی وہ جانے والی　　　کیا رہتی جوانی تھی مٹانے والی
پیری کو رشید بس غنیمت سمجھو　　　اب کوئی نہیں ہے فصل آنے والی

کر عجز کہ توصیف و ثنا غیر کرے　　　دو دن کے لئے کس سے کوئی بیر کرے
معدوم جوانی ہوئی پیری آئی　　　پیری کے بھی لالے ہیں خدا خیر کرے

آخر الذکر رُباعی پر مرحوم کو بہت ناز تھا اور یہ کوئی بے جا نہ تھا کیونکہ پوری رباعی زبان میں ڈوبی ہوئی ہے اور سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ دوسرے اور چوتھے دو مصرعوں میں تین محاورے اس قدر بے تکلفی سے نظم کر دیے ہیں کہ تصنع کا مطلق نام نہیں، مجالس عزا میں اسے بہت فخر کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور پڑھنے میں شفیق۔ مؤدب اور ناصری وغیرہ کو خاص طور پر اس قسم کے جملوں سے مخاطب کر لیا کرتے تھے کہ ناصری سنو، مؤدب کہاں ہو، شفیق سننا، وغیرہ۔ اور جب پوری رُباعی پڑھ لیتے تھے تو اس قدر محظوظ ہوتے تھے کہ لبیا اوقات زبان سے آہا ہا نکل جاتا تھا۔

رشید کے کلام میں اس قسم کے بیش بہا سیکڑوں جواہر ریزے موجود ہیں، لیکن زمانہ کی ناقدری کے ہاتھوں برباد ہوئے جاتے ہیں، اُن کا کلام صرف رونے رولانے کی مجالس تک محدود ہو کر رہ گیا ہے حالانکہ اس قابل ہے کہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر عوام الناس تک پہونچے اور اُردو ادب میں وہ بلند اور معزز جگہ حاصل کرے جس کا وہ مستحق ہے۔

گُذرا ہوا دن

(از حضرت شارق دہلوی)

ایک دن ڈوبتے سورج نے جو بیدار کیا
چند دم ٹوٹتی کرنوں نے دیا مجھکو جگا
شمعِ احساس کے یکلخت بھڑک جانے سے
جگمگانے لگا ہر عالمِ دل کا ذرّا
دفعتہً ساری فضا میں یہ صدا گونج اٹھی
"دیکھ کہتے ہیں اسے کشتۂ شمشیرِ جفا"

ایک بے گور و کفن نعش لبِ ساحل تھی
عالمِ خواب میں تھا حسنِ سراپا گویا
اُس کے چہرے سے جونہیں نور کی چادر ڈھلکی
دیکھتا کیا ہوں کہ "لاشہ ہے مرے اُس دن کا"
غسل بھر اشکِ ندامت کے لہو میں دیکر
تربتِ سینۂ شارق میں اُسے دفن کیا

چند غریب بچّوں کو دیکھکر

(از جناب اندرجیت شرما ماچھرہ ضلع میرٹھ)

معصوم بھولے بھالے سب ہیں غریب بچّے
محروم نعمتوں سے ہیں بد نصیب بچے
سنسار کی نظر میں چاہے حقیر ہیں یہ
میں جانتا ہوں لیکن روشن ضمیر ہیں یہ
جلوہ وہی خدا کا ہے ان کی زندگی میں
ہوتا ہے جو نمایاں تاروں کی روشنی میں
دل کو لبھا رہے ہیں رنگیں جمال بچے
تتلی زباں سے کرتے ہیں کیا کمال بچے
فریاد اِن کے غم پر کرتے ہیں بے زباں بھی
اِن کے دکھوں سے ڈر کر لرزاں ہے آسماں بھی
پاکیزگی کی مورت، بے لوث ہستیاں ہیں
الفت کے پیکروں میں، فطرت کی بستیاں ہیں
معصومیت پہ ان کی حیران ہیں فرشتے
سو جاں سے ہر ادا پر قربان ہیں فرشتے
دھرتی کے باسیوں کا اللہ رے مقدر
جنّت کو چھوڑ کر جو آئے ہیں یہ زمیں پر

چکبست لکھنوی

(از جناب ماسٹر باسط بسوانی)

پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے اور ۱۲۔ فروری ۱۹۲۶ء کو رائے بریلی ریلوے اسٹیشن پر انتقال فرمایا۔ آپ ایک مقدمہ کے سلسلہ میں تشریف لے گئے تھے واپسی پر ریل میں بیٹھنے کے بعد دماغ پر فالج گرا، زبان بند ہوگئی اور رائے بریلی ویٹنگ روم میں باوجود علاج معالجہ شام کو راہی ملک عدم ہوئے، رات ہی کو آپ کی لاش موٹر کے ذریعہ لکھنؤ لائی گئی۔ جناب کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی نے آپ ہی کے مصرع سے تاریخ نکالی:-

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
"موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا" (۱۳۴۴ھ)

ابتدائے سنِ شعور سے آپ کو شاعری کا ذوق تھا۔ چکبست آپ کا خاندانی لقب ہے، تخلص کوئی اختیار ہی نہیں کیا۔ آپ کے کلام میں زبان کی سلاست اور تراکیب کا حسن نمایاں ہے۔ ملکی، سیاسی، قومی خیالات کو دلچسپ اور دلپذیر نظم کا جامہ پہنانا آپ ہی کا کام تھا۔ آپ کی غزلیں اور نظمیں ایک خاص رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں پندرہ بیس برس کا زمانہ ہوا جب منشی دیانراین صاحب نگم ایڈیٹر زمانہ نے ملک کے ادیبوں اور شاعروں سے دریافت کیا تھا کہ اُنھوں نے کن کن متقدمین کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے؟ تو چکبست مرحوم نے جواب میں تحریر کیا تھا کہ وہ آتش اور انیس کے گرویدہ تھے، اور انھیں دو اساتذہ کا کلام زیادہ تر اُن کے مطالعہ میں رہا۔ اس امر کی حقیقت چکبست مرحوم کا کلام دیکھنے سے صاف واضح ہوجاتی ہے۔ آپ کی شاعری پڑھنے والوں کے قوائے عمل بیدار کردیتی ہے اور قومی جمود کو دُور کرنے میں معاون ہے۔ آپ نے ماحول اور وقت سے متاثر ہوکر نئے نئے خیالات ایسے لطیف پیرائے میں نظم کئے ہیں کہ سننے والے کے قلب پر فوراً اثر پڑے اور اس سے سبق حاصل ہو۔ یہ بات خاص طور سے قابل تعریف ہے کہ زبان کی حدوں سے بھی متجاوز نہیں ہوتے۔ کہیں کہیں اختراع کا بھی رنگ ہے مگر اس انداز سے کہ ہر صاحب ذوق کو پسند آئے۔ افسوس زمانہ نے ایسی قابل قدر

شخصیت کو ہم سے بے وقت جُدا کر دیا۔ اور اہلِ سخن آپ کی نغمہ سنجیوں سے محروم ہو گئے۔ آپ کے کلام کا کچھ اقتباس ضیافتِ طبع ناظرین کے لئے پیش کرتا ہوں۔ جہاں کہیں ضرورت سمجھونگا اپنی رائے اور توضیح سے بھی کام لونگا۔

"نذرانۂ روح" میں پنڈت بشن نراین در سے حُسنِ عقیدت کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:۔

تیرا بندہ رہے دل سے یہی پیمان رہا	طائرِ فکر ترے اوج سے حیران رہا
قدر کرنا تری سیکھیں یہی ارمان رہا	یہی مسلک یہی مذہب یہی ایمان رہا
آبرو کیا ہے، تمنائے وفا میں مرنا
دین کیا ہے، کسی کامل کی پرستش کرنا

اِس بند کی کیا تعریف کی جائے، پنڈت بشن نراین در سے حسن عقیدت کا اظہار اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے۔ نہ طائرِ فکر اُن کے اوج کو پا سکا نہ اُن کی قدر کرنا آیا۔ آبرو کا یہ معیار اور اس کی یہ تعریف ہے کہ تمنائے وفا میں مر جائے۔ کسی کامل کی پرستش کرنا عین "دین" ہے۔ سُبحان اللہ سبحان اللہ۔

آگے چلکر فرماتے ہیں:۔

مجھ سے یارانِ عدم نے یہ اگر فرمایا	حسرت آبادِ جہاں سے تجھے کیا ہاتھ آیا
مَیں کہوں گا کہ بس اک رہبر کامل پایا	زندگی کی یہی دولت ہے یہی سرمایا
لیکے دنیا سے یہی مُہرِ وفا آیا ہوں
اپنے محسن کی غلامی کی سند لایا ہوں

پنڈت بشن نراین جیسے محسن کی سندِ غلامی مُہرِ وفا سے مماثل ہے اور اُن کی محبت میں ثابت قدم رہنا ہی مقصدِ حیات و حاصلِ زندگی ہے، اور اس کے ہوتے ہوئے دوسرے عالم میں باز پرس کا کوئی کھٹکا نہیں:۔

دل یہ کہتا ہے کہ جینے کی لطافت نہیں خاک	خود بخود جان ہوئی جاتی ہے سینے میں ہلاک
یہ اگر شرطِ وفا ہے، نہ ہوں آنکھیں نمناک	چڑھ کے غیروں کی نظر پر نہوں آنسو ناپاک
جس کی دنیا کو خبر ہو یہ وہ ناسور نہیں
تیرے ماتم کی نمائش مجھے منظور نہیں

سچ ہے ایسے محسن کے انتقال کے بعد جینے میں کیا لطافت ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی جیا بھی تو کیا۔ نفظِ

"لطافت" کی کیا تعریف کی جائے۔ ع

چڑھ کے غیروں کی نظر پر نہ ہوں آنسو ناپاک

اِس خیال کی نُدرت اور پاکیزگی کا اظہار مشکل اور مصنف کے حسنِ تخیل کی داد ناممکن ہے۔ آہ ایک محسن کی یاد میں دل کے پاکیزہ جذبات آنسوؤں کی شکل میں منتقل ہو گئے، اُن کو عالم کی نظروں سے بچانا مقصود ہے، اور اپنے محسوساتِ قلبی کا اظہار اغیار پر منظور نہیں، واقعی اس سے حاصل ہی کیا چکبست اپنے دل کے ناسور کی خبر کسی کو نہیں دینا چاہتے۔ مگر ان خیالات کو ذیل کے مصرعہ کی صورت میں ظاہر کرنا ایسے ویسے کا کام نہیں۔ ع

تیرے ماتم کی نمایش مجھے منظور نہیں"

نمایش کا صرف کس جگہ ہوا ہے اور کس حسن سے

"خاکِ ہند"

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے ۔۔۔ دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے

تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے ۔۔۔ اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزوشاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُرضیا کی

کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

ہند کی حقیقی عظمت و بزرگی کا اظہار کتنے پیارے الفاظ میں کیا ہے، دراصل قدرت کے فیض سے بدرجۂ اتم بہرہ ور ہے ورنہ جنت نشان ہی کیوں کہا جاتا ع

تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے

کتنا حسین و دلکش مصرعہ ہے، ٹیپ کے شعر میں یہ مصرعہ

"کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی"

عجیب رنگ سے کہا گیا ہے، آفتاب ہمالیہ کی چوٹی پر ضیا افگن نہیں ہوتا بلکہ وہ فعل مشاطہ اس کی چوٹی کو گوندھتا ہے اور اپنی شعاعوں کے زریں تاروں کا مُوباف بناتا ہے۔ چوٹی کا لفظ کتنا معنی خیز ہے

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو ۔۔۔ سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو

اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو ۔۔۔ سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سُورِ بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں

ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈیاں ہیں

مہاتما گوتم بدھ، حضرت سرمد شہید، اکبر اعظم، رانا پرتاپ جیسی شخصیتوں کی وابستگی اور ہند نوازی ظاہر ہے، افسوس یہ ویران ہوگیا اور چاہنے والے اس خاک میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

دیوار و در سے ابتک اُن کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں ابتک اُن کا لہو رواں ہے
ابتک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوسِ گوش ابتک کیفیتِ اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ ابتک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ ابتک

ہند کے در و دیوار سے ابتک متذکرہ بالا قابل احترام شخصیتوں کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

"اپنی رگوں میں ابتک اُن کا لہو رواں ہے"

دراصل ہم اُنھیں کی اولاد میں سے ہیں، اور اس نسبت پر ہمیں بجا فخر ہے، کیوں نہ ہو وہ ہمارے ہی تو اسلاف تھے، ناقوس کی فغاں کا بھی اثر وہی ہے، یعنی ہندو دھرم اپنی جگہ پر ہے، اذان کی کیفیت بھی ابتک فردوس گوش بنی ہوئی ہے، یعنی اذان کی سامعہ نوازی میں بھی کوئی کمی نہیں، فردوس گوش کا ٹکڑا غالباً غالب کے اس مصرعہ سے لیا گیا ہے

"وہ جنتِ نگاہ یہ فردوسِ گوش ہے"

بند کے شعر سے بھی ہندوستان کے دریائے گنگ کی روانی کا نقشہ پیش نظر ہوجاتا ہے۔

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص ابتک طاؤس جنگلوں میں
ابتک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں
گل شمع انجمن ہے، گو انجمن وہی ہے
حبِ وطن نہیں ہے، خاکِ وطن وہی ہے

پہلے تین مصرعوں میں ہندوستان کے مختلف مناظر کی دلکش تصویر کھینچکر شاعر اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اِن مناظر کی دلفریبی کا تو وہی عالم ہے مگر ہمارے دل کے وہ حوصلے نہ رہے جن سے ہمارے آباد اجداد ممتاز تھے جبّ وطن کے بغیر ہمارا وطن بے شمع کی انجمن ہے۔ یہ بند اہل دل کے لئے واقعی درس عبرت ہے۔

آگے ایک بند میں یہ مصرعہ

"اِک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا"

کتنا مؤثر اور حسرت انگیز ہے۔

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک، گل کو چمن مبارک ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

سب کچھ لیکر "ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک" کہنا کتنا دلکش ہے "ہم بیکسوں کو" سے کتنے شریا الفاظ میں حسرت و حقیقت ظاہر ہوتی ہے ع

اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہند کی خاک سے پیدا ہوئے ہیں اور مر کر اسی کی خاک میں مل جانا پسند کریں گے۔

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

ع "تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا" اسی کے ساتھ ع "مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو" کتنے دلپذیر مصرعے ہیں جو شاعر کی محبت اور وطن پرستی کا انتہائی ثبوت ہیں۔

"وطن کا راگ"

کئی بند کہنے کے بعد شاعر کہتا ہے اور کس جوش سے کہتا ہے:۔

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے یہ راگ گا کے اُنھیں نیند سے جگائیں گے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

بیڑیاں پہنکر گوشۂ زنداں کو خوشی سے آباد کرنا اہلِ دل ہی کا کام ہے، اپنی اسیری اس قدر محبوب ہے، کہ سنتری سو جانے پر بیدار کئے جاتے ہیں مگر کس والہانہ انداز سے، کس دلپذیر نغمہ سے۔

"طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے"

ہوم رول کے مقابلہ میں بہشت کو کانٹا سمجھنا کیا شانِ حب الوطنی ہے۔

زباں کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ہے ناز　　ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز　　چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

زباں بندی کی طرف کیا لطیف اشارہ ہے، جوش خوں کی کیفیت کو اس مصرعہ سے ظاہر کرنا لطیف طنز ہے ع　　ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز

اگر ہم کو جذبات دل کے اظہار کی اجازت نہیں ہے نہ سہی مگر رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے اور جوش مار رہا ہے اس کو کون روک سکتا ہے۔ جب تک جان میں جان ہے وطن کی محبت دل میں رہے گی ہاں، ہاں،　　چتا سے آئیگی مرنے کے بعد یہ آواز

اس مصرعہ کا کیا کہنا، یہ چکبست ہی کے قلم سے نکل سکتا تھا۔

آخری بند کیا خوب ہے۔

بسے ہوئے ہیں محبت سے جنکی قوم کے گھر　　وطن کا پاس ہے اُن کو سہاگ سے بڑھکر
جو شیر خوار ہیں ہندوستاں کے لختِ جگر　　یہ ماں کے دودھ سے لکھا ہے اُنکے سینے پر

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

العظمت للہ، کیا تعریف کی جائے ع

یہ ماں کے دودھ سے لکھا ہے اُنکے سینے پر

سبحان اللہ سبحان اللہ تخیل کی بلندی اور نفاست تعریف سے مستغنی ہے۔

کلام اثر

(از نتائج طبع جناب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی)

کیا فقط ایک دل گنوا بیٹھے　　دل کو بھی روگ سا لگا بیٹھے
لاکھ روکا، نکل پڑے آنسو　　وہ کڑی چوٹ دل پہ کھا بیٹھے
آ، جو آنا ہے، دردمند ترے　　ہاتھ جینے سے بھی اُٹھا بیٹھے
نہ سنانا تھا جس کو، آج اُس کو　　ماجرائے الم سنا بیٹھے
حاصل زیست ہے کہ حاصل زیست　　دوست کی راہ میں لُٹا بیٹھے
دھیان کس سے لگا ہوا ہے اثر　　سوچتے رہتے ہو یہ کیا بیٹھے

جذباتِ اثرؔ

(از جناب جعفر علی خانصاحب اثرؔ لکھنوی)

جیبِ کنارِ دامن پھولوں سے چھا رہے ہیں
پردے میں آنسوؤں کے وہ مُسکرا رہے ہیں

س شان سے مسافر منزل کو جا رہے ہیں
چھالے قدم قدم پر آنکھیں بچھا رہے ہیں

جیسے وہ سُن رہے ہیں بیٹھے ہوئے مقابل
اور دردِ دل ہم اپنا اُن کو سُنا رہے ہیں

اُئے نہ آئے نامہ، دل سے ہے راہ دل کو
پیغام آ رہے ہیں، پیغام جا رہے ہیں

پھر ہم کہاں، کہاں تم، جی بھر کے دیکھنے دو
اللہ کتنی مدت تم سے جُدا رہے ہیں

ے یاس تو ہی بڑھ کر ان کو گلے لگا لے
جو اپنی بیکسی پر آنسو بہا رہے ہیں

پنی زباں سے کہہ دو، یا ان کو منع کر دو
دیکھو تمھارے در سے ہم کو اٹھا رہے ہیں

س نازکی کے صدقے، اس بانکپن کے قربا
اُٹھتا نہیں ہے خنجر، لیکن ڈرا رہے ہیں

یوں چاندنی میں نکلو جو شوخ چشم تارے
رخ کی بلائیں لے کر آنکھیں لڑا رہے ہیں

بادہ ہے اور نہ منزل جوشِ طلب میں پھر بھی
جانیں کھپانے والے جانیں کھپا رہے ہیں

وخیِ ناز دیکھو، یہ بھی کھُلا نہ اب تک
ہم آپ مٹ رہے ہیں یا وہ مٹا رہے ہیں

بنامہ کوئی ہوگا کہدے کوئی اثرؔ سے
کیا اپنے دل سے بیٹھے باتیں بنا رہے ہیں

دیگر

اِک تبسّم، لبِ گلاب فروش
اِک نگہ، نرگسِ شراب فروش

ذرہ ذرہ ہے جلوہ زارِ جمال
نقطہ نقطہ ہے انتخاب فروش

اللہ اللہ فروغِ بادۂ ناب
قطرہ قطرہ ہے آفتاب فروش

آج رہ رہ کے یاد آتا ہے
دلِ خوں گشتہ، اضطراب فروش

بحر سے ہمکنار ہونا تھا
اے تنک ظرفیِ حباب فروش

دیکھنا ہے مجھے ترا پردہ
کاش یہ دل نہ ہو حجاب فروش

شوخیِ ناز دیکھتے ہو اثرؔ
خود نما ہو کے ہے نقاب فروش

حکومت ہند کا جدید مسودۂ قانون

(از پنڈت کشن پرشاد کول بی۔اے، ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی، لکھنؤ)

پرانے زمانہ میں بھی ایسے ماہرانِ فن گذرے ہیں جنھوں نے مصوری۔ نقاشی اور سنگتراشی میں ایسے ایسے کمال دکھائے کہ دنیا اُن پر آج تک عش عش کرتی ہے۔ ایسی ایسی صورتیں بنائیں اور وہ مورتیں لاکر سامنے کھڑی کیں کہ نقل سے اصل کا دھوکا ہوتا تھا۔ سامنے کھڑے ہوکر دیکھئے تو شبہ ہوتا ہے کہ یہ کاغذی پیرہن والی صورت آپ ہی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔ کہنے کو پتھر کی مورت ہے لیکن ہونٹھ باتیں کرنے کے لئے جنبش کیا چاہتے ہیں۔ اس ابتر و ردی حالت میں بھی آج ہندوستان کے بازاروں میں مٹی اور کاغذ کے ایسے پھل پھول اور بوٹے دکھائی دیتے ہیں جو اصل کو مات کرتے ہیں۔ یہ تو پُرانی تہذیب کا معجزہ اور طلسم فریب تھا۔ مغربی تہذیب کے نئے دور میں سائینس کے کرشموں نے اس پر چار چاند لگادیے۔ اور وہ وہ باتیں کرکے دکھائیں جو کبھی سننے میں نہ آئی تھیں۔ روزانہ شام کو آپ سینما جاتے ہیں جہاں روزمرہ زندگی کے واقعات آپ کے سامنے پیش ہوتے ہیں جیتی جاگتی ہنستی بولتی صورتیں اپنے ناچ گانے اور کھیل تماشوں سے آپ کو لبھاتی ہیں۔ لوگ اسی طرح چلتے پھرتے، کام کرتے اور لڑتے جھگڑتے معلوم ہوتے ہیں جیسے گھروں یا بازاروں میں۔ تھوڑی دیر کے لئے آپ کو اس کا خیال نہیں رہتا کہ آپ اصلیت سے دور کسی تصویرخانہ میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ لیکن جب آپ باہر نکلتے ہیں تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک کاغذی ریل[1] اور بجلی کی مشین کا کرشمہ تھا اور نہ حقیقت کچھ بھی نہ تھی۔ سائینس کا طلسم فریب ہے۔ مغربی تہذیب نے سائینس کی مدد سے نہ صرف صنعت و حرفت میں عجیب و غریب معجزہ کاری دکھائی ہے بلکہ تقریباً تمام علوم و فنون میں وہ کمالات پیدا کئے ہیں کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ فن سیاست بھی اس سے مستثنےٰ نہیں رہا۔ پُرانے زمانے میں ملک گیری و ملک داری قوت بازو اور زور شمشیر کا کھیل اور شخصی رعب و داب کا کرشمہ تھا لیکن مغربی تہذیب نے فنِ سیاست میں بھی وہ وہ باریکیاں اور صناعیاں پیدا کی ہیں کہ اسکو بھی اچھا خاصہ طلسمِ فریب

---

[1] Reel

بنادیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مجلس[۱] اقوام اسکا بہترین نمونہ ہے۔ فن سیاست میں دولت برطانیہ اپنے معصروں پر فوقیت حاصل ہے، چنانچہ مسودۂ قانون حکومت ہند جو اس وقت برطانوی کے روبرو پیش ہے، برطانوی مدبروں کی سیاسی دانشمندی کی درخشاں مثال ہے اس سیاسی تصویرخانہ میں سب ہی مناظر دیدہ زیب اور سب ہی صورتیں نظر فریب ہیں۔ ہر ایک کو دستوری آئینی حکومت کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ اور جمہوریت کے تمام لوازم جمع کر دیئے گئے ہیں متحدہ[۲] ہند، صوبہ[۳] وار خود مختاری، دیوان[۴] خاص و دیوان عام، منتخب[۵] ممبروں کی اکثریت، ذمہ دار[۶] وغیرہ وغیرہ سب ہی اس میں اپنا اپنا کام انجام دینے کے لئے موجود ہیں، ایسی باریکیاں اور صناعیاں دکھلائی گئی ہیں کہ نقل سے اصل کا دھوکا ہوتا ہے ورنہ دراصل یہ سب کٹھ پتلیاں ایک ہی بازیگر کے اشارہ پر کام کرنے والی ہیں جس کا نام صوبوں کی حکومت میں گورنر اور حکومت میں گورنر جنرل ہوگا، جرمنی اور امریکہ کے صاحب کمال سائنس دانوں نے سینما یہ معجزہ دکھایا کہ بقول شاعر ع

بیجاں بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

لیکن یہ سحر کاری اور معجزہ گری قسام ازل نے مدبرین برطانیہ ہی کے لئے مخصوص کی تھی۔ قانون حکومت ہند کے سیاسی تصویرخانہ میں جاندار، ذی ہوش، ذی علم و ذی عقل انسان قوت ارادی کھو کر وہی کہیں اور وہی کریں گے جو گورنر یا گورنر جنرل ان سے کہلوانا یا کرانا چاہے۔

وہ داستان جس پر اس ڈرامے کی بنا ڈالی گئی ہے کسی قدر طویل ہے لیکن یہاں سے بیان کی جائیگی۔ اُنیسویں صدی کے آخری عہد میں ایک یہودی انگلستان کی سرزمین پیدا ہوا۔ جو عالی دماغ، بلند نظر اور منصف مزاج ہونے کے علاوہ خدا ترس بھی تھا۔ دنیا میں یہ مسٹر مانٹیگو کے نام سے مشہور ہوا۔ دولت برطانیہ کی وزارت میں اس کو جگہ ملی ہندوستان کی حکومت کی باگ اس کے سپرد ہوگئی۔ برطانیہ کے عہد حکومت ہند کا یہ پہلا مدبر تھا جس نے ہندوستان کے دعوی خود مختاری کا اعتراف کرکے اس ملک میں اور جمہوری حکومت کی بنا ڈالی اور شہنشاہ برطانیہ و ہند کی جانب سے شہزادہ ڈیوک آف کی معرفت ہندوستان کو سوراج یا ڈومینین اسٹیٹس کا پیام بھجوایا۔ مگر انڈین نیشنل

---

[۱] League of Nations [۲] Federal Government of India, [۳] Provincial Autonomy. [۴] Bicameral Legislatures [۵] Elected Majoritees [۶] Responsible Ministers. [۷] Dominion status.

نے اُن اصلاحات کو جو ۱۹۲۰ء میں آئین حکومت ہند میں کی گئی تھیں ناکافی، ناقابل اطمینان، بلکہ مایوس کن قرار دیا اور مانٹیگو کے مصالحانہ مسلک کی قدر نہ کر کے اس کی مخالفت کی، تاہم ہندوستان کا آئندہ مورخ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ مانٹیگو کے عہد میں ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کی جانب پہلا قدم بڑھایا گیا، لیکن جیسے ہی جنگ کی مصروفیتوں سے وزراء برطانیہ کو مہلت ملی اُنھوں نے نہ صرف مانٹیگو سے اپنا پیچھا چھڑایا بلکہ اصلاحات کے عملدرآمد میں بھی اُن کے رویہ اور مسلک سے منہ موڑا۔ بہرحال ۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ ہند نے اس سے انکار کرنا شروع کیا اور اس کی تکمیل سائمن کمیشن کے تقرر کے موقع پر ہوئی۔ جب کوئی ہندوستانی بھی انگریزوں کا ہم پلہ نہ سمجھا گیا۔ ملک نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ سرکار نے دار و گیر کا رویہ اختیار کر کے ہندوستانی رعیت کو مرعوب کرنا چاہا لیکن اس سے سکون کے بجائے عوام میں ہیجان پیدا ہوگیا۔

یکم نومبر ۱۹۲۹ء کو حضور وائسرائے لارڈ ارون نے حکومت برطانیہ کی جانب سے ایک عام اعلان شائع کیا جس میں اس امر کی تصدیق کی گئی کہ برطانوی حکومت کا منشا و مقصد ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس عطا کرنے کا ہے اور اس غرض سے ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس انگلستان میں منعقد کی جائیگی جس میں ہندوستان اور برطانیہ کے نمایندے یکجا ہو کر جن تجاویز اصلاح پر متفق الرائے ہونگے وہی منظور کی جائینگی اور انھیں پر عملدرآمد ہوگا۔ یہ بات پہلے ہی سے مشہور تھی کہ لارڈ ارون جیسا نیک۔ سچا اور ایماندار کوئی دوسرا وائسرائے نہیں ہوگا غرض اس اعلان کے جادو اور وائسرائے کی شخصیت نے اپنا کام کیا اور اکثر نامی اور ممتاز لیڈران ہندوستان سے اس کانفرنس میں شریک ہوتے گئے۔ اس زمانہ میں مزدور پیشہ جماعت کی گورنمنٹ کا دور دورہ تھا جس کے لیڈر وزراء اور ممبر اپنی جادو بیانی، شیریں زبانی، حسن اخلاق میں طاق میں ان کی آؤ بھگت کا لیڈروں پر خاصہ اثر ہوا۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیراعظم برطانیہ نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں یہ ارشاد فرما کر بارہ مہینے بھی نہ گذرنے پائیں گے کہ ہندوستان کو خود مختاری اور آزادی ملجائیگی۔ اس نے کانفرنس کے اجلاس میں وہ فضا پیدا کر دی کہ اچھے اچھے کار آزمودہ ہندوستانی لیڈر جو نان کوآپریشن کے زمانہ میں مہاتما گاندھی کے ۳۱۔ دسمبر تک سوراج دلانے کے اعلان کا مضحکہ اُڑایا کرتے تھے دھوکا کھا کر باور کرنے لگے کہ اب عنقریب ہی ہماری سب مرادیں برآئیں گی۔

مہاتما گاندھی سا پختہ کار سیاست داں بھی اس منتر کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ مہاتما گاندھی جی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں شریک ہوئے اور انھوں نے کانگریس کی زبان میں ہندوستان

کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ ملک معظم نے اپنے خاص محل میں جو دعوت ہندوستانی نمایندوں کو دی اُس میں سب سے زیادہ آؤ بھگت اور قدر افزائی مہاتما جی کی ہوئی۔ اس ڈرامہ کا ایک ایکٹ یہاں پر ختم ہوتا ہے۔ پھر جب پردہ اُٹھتا ہے تو برطانیہ کی حکومت کی باگیں لیبر پارٹی کے بجائے نیشنل یا کنسرویٹو پارٹی کے ہاتھوں میں تھیں ادھر ہندوستان میں گاندھی ارون سمجھوتہ کے بعد سے سول نافرمانی کی جد وجہد کا ہنگامہ ٹھنڈا پڑنا شروع ہو گیا تھا، اور حکومت کو ہندوستانیوں کی جا و بیجا نازبرداری کی ضرورت باقی نہ تھی۔ قصیدہ خوانی اور شاعرانہ مدح سرائی کے بجائے معاملہ داری کی ضرورت تھی، لہذا کسی قدر صاف گوئی سے کام لیا گیا، مہاتما جی نے جب یہ فضا دیکھی تو پابندی وضع کے ساتھ پہلے ہی سے عازم ہندوستان ہوئے، لیکن وہ لوگ جن کو بقول مسٹر شاستری حکومت کی حمایت کا مرض لاحق ہے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے دوسرے دَور کے اختتام تک ولایت ہی میں جمے رہے۔ اس اجلاس کی گفت وشنید کے بعد تین باتیں صاف صاف نظر آنے لگیں۔ اوّل یہ کہ ہندوستان کی حکومت کی منزلِ مقصود اب ڈومینین سلف گورنمنٹ کے بجائے فیڈریشن آف انڈیا ہوگی، دوسرے یہ کہ گاندھی ارون سمجھوتہ کی رو سے وہی تحفظات واجب قرار دیے گئے تھے جو ہندوستان کی بہبودی کے لحاظ سے ضروری سمجھے جائیں۔ مگر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں برطانوی نمایندوں نے یہ قطعی طور سے ثابت کر دیا کہ باہمی مراسم اور آشتی کے تعلقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرینِ انصاف یہ ہے کہ تحفظات میں ہندوستان اور انگلستان دونوں کی بہبودی کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ تیسرے یہ کہ صوبہ وارانہ حکومت خود اختیاری سے قطع نظر کر کے مرکزی حکومت میں خود اختیاری حاصل ہونے کے لئے پہلی شرط یہ قرار دی گئی کہ دیسی ریاستیں بھی فیڈریشن میں شریک ہوں۔ اگر دیسی ریاستیں فیڈریشن میں شریک ہونا منظور نہیں کرتیں تو حکومت برطانیہ مرکزی حکومت یعنی گورنمنٹ ہند میں خود مختاری دینے یا ذمہ وارانہ حکومت رائج کرنے کی پابند نہیں۔ وزراء برطانیہ کا کمال تدبّر یہ تھا کہ اُنھوں نے ہندوستانی لیڈروں کو اِن تینوں باتوں پر رضامند کر کے اِن شرائط کا پابند کرا لیا۔ اس کے بعد حکومت برطانیہ کا راستہ صاف تھا

برطانوی وزراء کا سب سے بڑا سیاسی کمال یہ ہے کہ گو کہنے کے لئے تو حکومت ہند کو (نہ صرف صوبجات کی گورنمنٹوں بلکہ مرکزی حکومت کو بھی) خود مختاری دے دی گئی ہے لیکن گردن میں دیسی ریاستوں کی شرکت اور برطانوی اغراض کے تحفظات کے دو پھندے ایسے ڈال دیے گئے ہیں کہ اس غریب میں جان پڑنے سے پہلے ہی اس کا گلا آپس کی کشمکش میں گھٹ جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ

ہندوستانی لیڈروں نے ایسی شرائط کیوں منظور کیں؛ یہ بھی مجبور تھے، موجودہ کنسرویٹو گورنمنٹ صوبہ وارانہ خود مختاری سے زیادہ کا مطالبہ پورا نہیں کرنا چاہتی تھی، جن لوگوں کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں بلایا گیا تھا اُن میں زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی تھی جو حکومت کا ساتھ دینے والے تھے۔ ہندوستانی لیڈران یہ بیڑا اٹھا کر کانفرنس میں گئے تھے کہ ہم حکومت ہند میں یعنی مرکزی حکومت میں خود مختاری حاصل کئے بغیر نہ آئیں گے انہیں اپنی بات کی شرم رکھنی تھی، یہ تو یہ سمجھتے تھے کہ ان شرائط سے خود مختاری ادھوری رہ جائیگی، لیکن ان کو کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ ہم خالی ہاتھ ہندوستان واپس نہیں جارہے ہیں۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ یہ قالب بیجان ساتھ لے کر واپس آئے۔ ایک تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس بھی ہوئی لیکن اس میں صرف معدودے چند لوگ بلائے گئے۔ یہ اصحاب کردھر تو کچھ نہیں سکے البتہ اپنے مطالبات کی ایک یادداشت سر سیموئل ہور کو دیتے آئے جو غالبًا ردی کی ٹھوکری میں اُٹھا کر پھینکدی گئی، یہاں اس ڈرامے کا دوسرا ایکٹ ختم ہوتا ہے۔ تیسرے دور کی خصوصیت وھائٹ پیپر کی اشاعت اور جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ ہے۔

اس طولانی داستان میں ایک بات خاص طور سے نمایاں ہے۔ مزید اصلاحات کا عمل میں آنا سائمن کمیشن کی تحقیقات اور اُس کی رپورٹ پر منحصر تھا۔ جب ہندوستانیوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا اور اس کی رپورٹ سے کوئی سروکار نہ رکھا تو حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں کی تشفی لارڈ اروِن کے اعلان اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں کے ذریعہ کی۔ سائمن کمیشن میں کسی ہندوستانی کو بھی برابری کی جگہ نہیں ملی تھی۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں میں ہندوستانیوں کو برابری کے دعوے سے شرکت کا موقع ملا اور ان کی آؤبھگت بھی خوب کی گئی، حتیٰ کہ جوائنٹ سلکٹ کمیٹی کے ساتھ بھی یہ نتھی رکھے گئے، لیکن جو کچھ اُنھوں نے کہا اس کی کوئی سماعت نہیں ہوئی، اور بالآخر جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ بالعموم انھیں نتائج کی بنا پر مرتب کی گئی جو سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں پیش کئے تھے۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ہندوستانیوں نے جو کچھ کہا حکومت برطانیہ کے وزرا نے اس سب کو نہایت خندہ پیشانی سے سُنا لیکن وھائٹ پیپر میں اُنھوں نے وہی قلمبند کیا جو اُن کی سمجھ میں آیا۔ پہلی بات جو وھائٹ پیپر میں نمایاں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ڈومینین اسٹیٹس کی منزلِ مقصود کا نہ کوئی ذکر ہے نہ حوالہ۔ دوسرے ہندوستانی لیڈروں نے جو یادداشت مطالبات پیش کی تھی اس کو بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے۔ جن باتوں پر اس یادداشت میں اعتراض کیا گیا تھا وہ سب وھائٹ پیپر میں موجود ہیں لیکن جن باتوں پر رضامندی ظاہر کی گئی تھی اور جن کا مطالبہ کیا

گیا تھا اُس کا وھائٹ پیپر میں کوئی ذکر ہی نہیں۔ ہندوستانی لیڈروں پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے فرقہ وارانہ قضیوں اور جھگڑوں کی وجہ سے یہ تمام معاملہ بگاڑ دیا۔ ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی اور سکھ سب ہی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنے اپنے راگ کے مصداق ہیں۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں یہ آخری دم تک جھگڑتے رہے۔ ایسی حالت میں برٹش گورنمنٹ کیا کرتی؟ بات تو بالکل صحیح اور دلیل لاجواب ہے لیکن اس میں ایک نقص یہ ہے کہ جہانتک ڈومینین اسٹیٹس کی منزلِ مقصود کا تعلق ہے اُس پر ہندو مسلمان۔ عیسائی اور سکھ سبھی متفق الرائے ہیں۔ ہندوستانی لیڈروں کی یادداشت مطالبات میں سر آغاخاں، سر تیج بہادر سپرو وغیرہ سبھی ہندوستانی لیڈروں کے دستخط ثبت تھے، چنانچہ ان مطالبات کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہندو مسلمان۔ عیسائی سکھ متفق الرائے نہیں ہیں۔ پھر حکومت وقت نے اس کے ساتھ کیوں ایسی بے التفاتی برتی؟

آج ہندوستانی پکار پکار کر پوچھ رہے ہیں کہ سوراج یا ڈومینین اسٹیٹس کا جو پیام ملک معظم نے بھیجا تھا، ڈومینین اسٹیٹس کی منزل مقصود کا جو وعدہ لارڈ ارون وائسرائے ہند نے برطانوی حکومت کی جانب سے کیا تھا جس کا اعادہ لارڈ ریڈنگ، لارڈ پیل اور مسٹر ریمزے میکڈانلڈ اور مسٹر بالڈون نے پارلیمنٹ میں کیا تھا آج اُس سے کیوں اغماض کیا جاتا ہے؟ مجوزہ قانون حکومت ہند کا مسودہ اس سے کیوں خالی ہے؟ برٹش گورنمنٹ کے یکم نومبر ۱۹۲۹ء والے اعلان میں جو لارڈ ارون کی زبان مبارک سے ہوا تھا صاف طور سے یہ وعدہ موجود ہے کہ وہی تجاویز اصلاح منظور کیجائینگی جن پر ہندوستانی اور برطانوی نمایندے متفق الرائے ہونگے، پھر ہندوستانیوں کے مطالبات کیوں رد کردیے گئے اور وھائٹ پیپر کے ذریعہ سے یکطرفہ فیصلہ کیوں کیا گیا؟

مدبرار برطانیہ نے اب تک ان اعتراضوں کا کوئی جواب شافی نہیں دیا ہے جس سے ہندوستانی پبلک کا اطمینان ہوتا۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہے کہ مدبران برطانیہ لاجواب ہوگئے ہیں، وہ جواب بلکہ معقول جواب دے رہے ہیں۔ آرچ بشپ آف کنٹربری نے جائنٹ سیلکٹ کمیٹی میں اور سر ٹامس انسکیپ اٹارنی جنرل نے پارلیمنٹ میں فرمایا کہ ڈومینین اسٹیٹس کا معاملہ بہت ہی مبہم اور مشکوک ہے۔ اس لفظ کو مسودۂ قانون میں استعمال کیا جائے تو ایسی گتھیاں پڑ جائیں گی کہ پھر سلجھائے نہ سلجھیں گی۔ یہ جواب بھی بہت مبہم ہے مگر مسٹر چرچل کا یہ کہنا بہت پُرمعنی ہے کہ ہر ملک اور ہر زمانہ میں جشن اور درباروں کے موقعوں پر قصیدہ خوانی اور شاعری ہوا کرتی ہے اور مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر جو کچھ زبان پر آتا ہے کہدیا جاتا ہے اور بعد میں نہ کوئی لفظوں کو تولتا ہے

زبان کی کھال نکالنا ہے پھر کیا واقعی ڈومینین اسٹیٹس کا استعمال بھی اسی قسم کا مبالغہ تھا اُس کے کوئی معنی نہ تھے اور جو کوئی وعدہ تھا؟ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو بالکل وہی حالت ہوئی کہ جب کوئی بچہ کڑوی دوا پینے سے انکار کرتا اور روتا مچلتا ہے تو دوا پلانے کے لئے ہم اُسے طرح طرح کی مٹھائیوں اور کھلونوں کے وعدوں سے ترغیب دیتے ہیں لیکن ان کی اصلیت کچھ بھی نہیں ہوتی

ایسی صورت میں ہندوستانی پبلک یا ہندوستانی لیڈروں نے اس ڈومینین اسٹیٹس والے مذاق کو نہ سمجھا یا اس کی داد نہ دی تو اس میں مدبران برطانیہ کا کیا قصور ہے؟۔

جذبات جگر

(حضرت جگر مرادآبادی)

مر کے بھی کب تک نگاہِ شوق کو رسوا کریں
زندگی تجھکو کہاں پھینک آئیں آخر کیا کریں

اے میں قرباں مل گیا عرض محبت کا صلہ
ہاں اُسی انداز سے کہدو تو پھر ہم کیا کریں

دیکھیے کیا شور اُٹھتا ہے حریم ناز سے
سامنے آئینہ رکھکر خود کو اک سجدا کریں

ہائے یہ مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

عشق خود اپنی جگہ عین حقیقت ہے جگر
عشق ہی کیوں ہو جو شانِ دلبری پیدا کریں

دیگر

سوز میں بھی وہی اک نغمہ ہے جو ساز میں ہے
فرق نزدیک کی اور دُور کی آواز میں ہے

ہمہ تن محو دل اک نغمۂ بے ساز میں ہے
اب نہ مطرب میں کوئی فرق نہ آواز میں ہے

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ
سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

یہ سبب ہے کہ تڑپ پردۂ ہر ساز میں ہے
میری آواز بھی شامل تری آواز میں ہے

عاشقوں کے دلِ مجروح سے کوئی پوچھے
وہ جو اک لطف نگاہِ غلط انداز میں ہے

جو نہ صورت میں نہ معنی میں نہ آواز میں ہے
دل کی ہستی بھی اُسی سلسلۂ راز میں ہے

حسن انجام پہ کس طرح تصدق کردوں
وہ جو اک لطف ہر اک لغزشِ آغاز میں ہے

مسٹر قہقہہ

(از مسٹر سلیم جعفر)

جس کھوسٹ نے یہ کہا ہے کہ خربوزہ کو دیکھکر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اُس نے ضرور کم سے کم پان
برس تک ابلق ایام پر ران جمائے کبھی سرپٹ کبھی دُلکی کبھی پویا چلاکر کائنات کے ابعاد ثلاثہ کی سیر
کی ہے۔

عدم آباد سے عالم شہود میں قدم رکھتے ہی انسان اس مقولے کی راستی کا ثبوت دینے لگتا
چنانچہ مسٹر قہقہہ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ بچپن میں ہوش سنبھالتے ہی کہیں کانوں میں
بھنک پڑی تھی کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے اور زندہ دلی کے معنی ہیں قہقہہ، فلک شگاف قہقہہ جس
کی صدا سے زمین تھرا جائے، آسمان کانپ اُٹھے، کیونکہ لوگ انھیں زندہ دل کہتے ہیں جو ہر وقت
موقع بے موقع دانت نکالے نظر آتے ہیں۔ بس اُسی وقت سے مسٹر موصوف نے قہقہے کو اپنی حیات
مستعار کا جزو لاینفک بنالیا اور بذریعہ عمل دنیا کو حیاتِ حقیقی کا درس دینے لگے۔

ایک روز اتفاقیہ راستہ میں مٹ بھیڑ ہوگئی۔ دُور سے دیکھتے ہی ہونٹوں پر تبسم رقص کرنے
پاس آتے آتے باچھیں کھِل گئیں اور جب دس قدم کا فاصلہ رہ گیا تو فرمایا "ہہا۔ ہا۔ ہا۔ السلام
مولانا" مسٹر موصوف جب میرے قریب آکر ٹھہرے تو میں نے عرض کیا۔

"بندہ کچھ ٹوٹی پھوٹی اُردو جانتا اور انگریزی میں برائے نام ٹیں ٹاں کرلیتا ہے (مسٹر قہقہہ
ہہا۔ ہہا۔ ہہا) اس لئے مجھے لفظ مولانا سے نہ مخاطب کیا کیجئے (م۔ ق۔ ہہا۔ ہہا) اگر ایل۔ ایل۔
ہوتا تو بھی ایک حد تک یہ خطاب بجا ہوتا (م۔ ق۔ ہہا۔ ہہا) وکیل صاحب فقہ و حدیث سے ناواقف
ہوں ہوا کریں، امیر علی یا عبدالرحمٰن کا اسلامی قانون نظر سے نہ گزرا ہو نہ سہی۔ لیکن کم سے کم
مسٹر شین نے اسلامی قانون پر جو سوال و جواب لکھے ہیں انھیں تورٹ کر امتحان پاس کرتے
ہیں (م۔ ق۔ ہہا ہہا)"

مسٹر قہقہہ۔ ہہا۔ ہا۔ ہا۔ مولانا۔ معاف۔ ہہا۔ ہہا۔ کیجئے۔ غلطی ہوئی۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ مجھے آپ کی
ڈاڑھی سے ہہا۔ ہہا۔ دھوکا ہوجاتا ہے۔ ہہا۔ ہہا اگرچہ آپ ایک دفعہ پہلے بھی۔ ہہا۔ ہہا منع فرما

ہا۔ہا۔ہا۔

میں: میری ڈاڑھی تو یک مشت و دو انگشت بھی نہیں (م۔ق۔ہی۔ہی) میں تو اسی واسطے اس کو پر قینچ کر دیتا ہوں۔(م۔ق۔ہی ہی) اور نقطہ اتنی رکھتا ہوں کہ چاندنی رات (م۔ق۔ہی ہی) یا برقی لیمپ کی روشنی میں اگر راہ گلی میں جا رہا ہوں (م۔ق۔ہی۔ہی) تو چالیس قدم سے نظر آجائے۔ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں ؟

مسٹر قہقہہ: ہہا ہا۔ہہا ہا۔ میں آج ذرا ہہا۔ہا سیر کو نکل گیا تھا۔

میں۔ کدھر ؟

قہقہہ: رام نواس باغ کی طرف ہہا ہہا۔مولانا (ہہا ہا)

میں: دیکھیے۔آپ نے مجھے پھر مولانا بنا دیا۔

مسٹر قہقہہ: ہہا ہا۔خطا ہوئی، معاف کیجئے ہہا۔ہا۔ہا !

میں: خیر مضائقہ نہیں، فرمائیے کیا کہتے تھے۔

مسٹر قہقہہ: "میں شمالی دروازہ سے ہہا ہا۔ داخل ہوا تو کچھ لوگ ہہا ہا ٹینس کھیل رہے تھے اس لئے ہہا ہا۔میں نے فیلڈ میں سے گزرنا مناسب نہ سمجھا۔ہہا۔ہا۔مغربی جانب کی سڑک پر ہوتا ہوا کرکٹ فیلڈ پر پہنچا۔ہہا۔ہہا۔کرکٹ ہو رہا تھا۔میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ہہا۔ہہا تھوڑی سی دیر میں ایک شخص نے ہٹ لگائی اور گیند ہہا ہہا بڑی تیزی سے میرے پاس سے لڑھکتی ہوئی نکل گئی۔ہہا ہہا۔میں سہم سا گیا اور وہاں سے سرک کر کچھ فاصلہ پر جا کھڑا ہوا ہہا۔ہہا۔دو چار منٹ بھی نہ گزرے ہونگے کہ گیند میرے سر سے کوئی گز بھر اونچی ہوا میں شائیں شائیں کرتی نکل گئی ہہا ہہا میں وہاں سے بھی سرک کر کچھ دور جا کھڑا ہوا (ہہا ہہا) میرا وہاں سے ہٹنا تھا کہ میرے پاس ہی ہہا۔ہا۔جو آدمی اس جگہ کھڑا تھا اس کے گال پر ایک گیند آ چپکی (ہہا ہا۔ہا) وہ غش کھا کر گر پڑا ہہا ہا۔ہا۔کرکٹ ورکٹ تو غائب غلہ ہوا۔ہہا ہا سب اُسے سنبھالنے دوڑے ہہی۔ہہی۔لوگوں نے اُسے لے جا کر دوب پر لٹا دیا۔ہہی۔ہہی۔دو ایک آدمی اُسے ہوش میں لانے کو۔ہہا۔ہا۔اپنے رومالوں اور قمیصوں کے دامن سے ہہا ہا پنکھا جھلنے لگے۔ایک نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لپکا اور ہہا ہا اپنی ٹوپی میں پانی بھر لایا، اور اُس کے منہ اور سر پر ڈال دیا۔ہہا ہا پانی پڑتے ہی ہہا ہا بے ہوش نے آنکھیں کھول دیں۔خدا نے خیر کی۔ہہا ہا۔چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ہہا۔ہا۔

اُس حادثہ سے کھیل تو ہہا۔ ہا بند ہی ہو گیا۔ تبسّم جو کھیل رہے تھے بولے چلو چڑیا گھر کی طرف سے۔ ہی ہی ہی۔ گھر چلیں۔ میں ساتھ ہو لیا۔ ہی ہی ہی۔"

البرٹ میوزیم کے سامنے پہنچے۔ ہہا۔ ہہا تو ایک موٹر پاس سے گذرا۔ سامنے سے ہہا۔ ہہا۔ ایک صاحب گھوڑے پر سوار آ رہے تھے۔ ہی ہی جیسے ہی موٹر ڈرائیور نے بگل بجایا گھوڑا جمکا۔ ہہا ہہا اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ ہہا۔ ہا۔ ہا۔ لیکن سوار اچھا تھا۔ دو کوڑے زور زور سے جھٹکار گھوڑا ہہا ہا۔ سیدھا ہو گیا۔ لیکن انھیں لیکر ہا۔ ہا۔ ہا سرپٹ بھاگا۔ اور ان کی پگڑی ہا۔ ہا۔ ہا زمین پر آ رہی۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ کوئی آدھ میل کے فاصلہ پر رُکا۔ ہہا ہا۔ اُسے موڑ کر لائے۔ ہی ہی اور پگڑی لے کر روانہ ہوئے۔ ہہا۔ ہہا۔ ہہا۔

"ہم باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھے اور چڑیا گھر پہنچے۔ ہی ہی۔ وہاں ایک گورخر جو ایک تار کے باڑے میں بند تھا دوڑ لگا اور دولتیاں پھینک رہا تھا۔ ہہا۔ ہہا۔ اس باڑہ میں سیمرغ بھی تھے گورخر بھاگتے بھاگتے ایک سیمرغ کے پاس پہنچا اور ہا۔ ہا اس ناکردہ گناہ کے۔ ہا ہا ہا ایک دولتی جھاڑ ہی ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔ سیمرغ نے فریاد و فغاں سے ہہا ہا۔ ہا آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اور گورخر ہے کہ ہہا ہہا چوطرف سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔

یہ تماشا دیکھتے ہوئے ہم آگے بڑھے۔ ہی ہی۔ باغ سے باہر نکلے ہی تھے کہ تبسّم کو ایک کام یاد آ گیا۔ ہی ہی۔ اور معذرت کرکے ایک دوست سے ملنے چلے گئے۔ میں ان سے الگ ہو کر دو چار قدم ہی چلا تھا کہ ہی ہی۔ سامنے سے ایک بارات آتی دکھائی دی۔ میاں نوشہ خاصے ٹیسو۔ ہہا بنے گھوڑے پر سوار۔ ہہا ہا ہا جا رہے تھے۔ پیچھے پیچھے مرد تھے اور اُن کے پیچھے عورتیں گاتی ہوئی ہہا ہا۔ ہا۔ چل رہی تھیں۔ ان کا گانا عجب لطف انگیز تھا۔ ہہا ہا۔ آپ نے برسات میں مینڈکوں کو ہا ہا۔ ٹرّاتے سُنا ہوگا۔ واللہ۔ ہہا ہا۔ ہا وہی سماں پیشِ نظر تھا۔ ہا ہا ہا۔

میں اِس فکر میں تھا کہ کسی طرح حضرت سے نجات ملے کہ اتنے میں جناب خنداں "آ گئے۔ اُنھیں دیکھتے ہی مسٹر قہقہہ نے پھر ایک فلک شگاف ہا ہا سے کام لیا۔ اور السلام علیکم کہہ کر ان سے مخاطب ہوئے۔ میں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور اُنھیں جناب خنداں کے حوالہ کرکے چلدیا۔ لیکن دیر تک سڑک کی فضا قہقہوں سے گونجتی رہی حتیٰ کہ فاصلہ نے ہم دونوں کے درمیان حائل ہو کر مجھے یقین دلا دیا کہ اب سامعہ خراش صدائیں میرے کانوں کے پردوں کو صدمہ نہیں پہنچا سکتیں +

بسنت اور دل کی آرزو

(از منشی گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری، بی۔ اے، ایل ایل بی)

بسنت آیا ہے ہر اک گل میں نہاں اک گلستاں ہے
بہارِ بوستاں رنگِ چمن پر آج نازاں ہے

کہیں ہے گوہرِ غلطاں، کہیں لعلِ بدخشاں ہے
چمن میں تختۂ گل ہے کہ اورنگِ سلیماں ہے

بہار آئی چمن میں جوششِ کیفِ مے پرستاں ہے
جدھر دیکھو خوشی کا دور ہے عشرت کا ساماں ہے

پئے ذوقِ نظر یوں بیخودی نظارہ ساماں ہے
کہ ذرہ ذرہ کوہِ طور کا اک برقِ خنداں ہے

چمن میں گل ہے یا فطرت کا کوئی نقشِ عریاں ہے
کہ جیسے ایک برگِ حسن پرور میں گلستاں ہے

بہار آئی چمن میں پھر تمنا گل بداماں ہے
کہ ہر غنچہ جہانِ رنگ و بو کا اک گلستاں ہے

ہر اک شے عالمِ کثرت کی خود وحدت بداماں ہے
ہر اک ذرہ بیاباں ہو ہر اک غنچہ گلستاں ہے

مرا دل ہے کہ شامِ ہجر اک شمعِ شبستاں ہے
اُمیدیں گل بداماں ہیں، تمنا برق ساماں ہے

تمہارے عشق میں گو زندگی کا راز پنہاں ہے
تمہاری ہی محبت نغمۂ تارِ رگِ جاں ہے

تمہارے سوزِ الفت سے، تمہارے داغِ فرقت سے
شفق بنکر مری رگ رگ میں خونِ گرم جولاں ہے

تمہارے ہی خمار آلودہ نغموں سے مری ہستی
ترنم زارِ خلد و غیرتِ گلزارِ رضواں ہے

تمہاری کیف آگیں انکھڑیوں سے دلکو مدہوشی
تمہاری لغزشِ مستانہ عینِ ہوشِ انساں ہے

تمہاری جنبشِ ابرو سے دھڑکن دل کی قائم ہے
تمہاری چشمِ فتنہ زا میں سرِ زیست پنہاں ہے

تمہارے عشوۂ مخمور سے ہنگامۂ ہستی
تمہارے غمزۂ مانوس سے جینے کا ساماں ہے

تمہاری ہر ادائے روح پرور، جانِ فرحت ہے
تمہاری ہر نوائے کفر ایما، عینِ ایماں ہے

تمہارے ہر قدم سے فتنہ ہائے رنگ و بو پیدا
تمہاری ہر نظر میں اک پیامِ شوق پنہاں ہے

تمہارے گیسوئے عنبر فشاں سے کیفِ وجدانی
تمہارے جلوۂ رنگیں سے قائم بزمِ امکاں ہے

تمہارا ہی تصور گو مری راحت کا ساماں ہے
تمہاری یاد ہی مانا چراغِ محفلِ جاں ہے

مگر اتنے ہی سے سیری نہیں ہوتی نہیں ہوتی کہ اس منزل سے بھی آگے تمناؤں کا ایواں ہے
بہارِ باغِ ہستی! سچ بتا! پوشیدہ کس جا ہے کہ بے تیرے مرا صحنِ گلستاں بھی بیاباں ہے
بسنت آیا ہو دنیا میں، بسنت آئے مرے گھر بھی یہی میری تمنا ہے یہی اب دل کا ارماں ہے
مری نظروں میں آجاؤ، مرے دل میں سما جاؤ سرورِ شوق بنکر تم مری ہستی پہ چھا جاؤ
تمہاری یاد کیا معنی تمہیں مجھکو میسّر ہو
میں جس ذرّے میں ڈھونڈھوں تم وہیں مجھکو میسّر ہو

کلامِ ناطق

(از حکیم ابو العلا ناطق صاحب لکھنوی)

دیر و حرم میں بحث رہی دل کہاں رہے آخر کو طے ہوا کہ یہ بے خانماں رہے
کیونکر محیطِ حسن میں دل کا نشاں رہے جب ہر جگہ خدا ہو تو بندہ کہاں رہے
اشکوں کا سلسلہ نہ بڑھا اے دلِ حزیں شاید کہ اُن لبوں پہ تبسم گراں رہے
صیاد اپنے دلمیں جگہ دے اگر ہمیں ہم وہ ہیں جب بھی ہم کو غمِ آشیاں رہے
داغِ سجود تیری جبیں پر رہا تو کیا وہ سجدہ کر کہ روئے زمیں پر نشاں رہے
رکتی ہے گر زبان نگہہِ واپسیں سہی موقوف کیوں یہ سلسلۂ داستاں رہے
اب دل میں امتیازِ بہار و خزاں نہیں صحرا ہو یا چمن ہو کہیں آشیاں رہے
گردوں بقدرِ پستیِ ہمت بلند ہے پرواز ہو بلند تو کیوں آسماں رہے
ناطق کلام تجھ سے کن الفاظ میں کرے
جب تیرے دل پہ معنیِ نازک گراں رہے

مشاہیر زمانہ

سر عبدالرحیم

موجودہ لیجسلیٹو اسمبلی کے صدر سر عبدالرحیم بنگال کے ضلع مدناپور کے ایک مشہور و متمول خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے دادا ایک بڑے زمیندار اور ڈپٹی کلکٹر تھے، والد کا نام مولوی عبدالرب تھا، جو علم و فضل اور تہذیب و اخلاق کے لحاظ سے اپنے وقت میں قابل تقلید بزرگ سمجھے جاتے تھے۔ سر عبدالرحیم ماہ ستمبر ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول مدناپور میں ہوئی جہاں سے میٹرکولیشن پاس کر کے آپ پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں داخل ہوئے اور فطری ذہانت اور شوق مطالعہ کے باعث تین سال ہی میں اول درجے میں بی۔اے آنرز پاس ہوئے۔ اس کے بعد ایم۔اے کے امتحان میں آپ یونیورسٹی میں اول آئے جس کے بعد آپ انگلستان تشریف لے گئے جہاں ۱۸۹۰ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کی۔

انگلستان سے واپسی پر آپ نے ۱۸۹۱ء میں کلکتہ میں بیرسٹری شروع کر دی، اور اپنے ذہن رسا اور قابلیت کی بدولت چند ہی سال کے عرصہ میں آپ کی پریکٹس چمکنے لگی۔ سرکاری حلقوں میں آپ عزت اور وقعت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ جب صوبۂ بنگال میں ڈپٹی لیگل ریممبرینسر کا عہدہ خالی ہوا تو گورنمنٹ کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی اور آپ اس عہدہ پر فائز ہو گئے۔ اس عہدے کے فرائض آپ نے اس قدر مستعدی اور دیانتداری سے انجام دیے کہ آپ شمالی کلکتہ کے چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ مقرر ہو گئے اور عرصۂ دراز تک اس عہدۂ جلیلہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔

لیکن ۱۹۰۳ء میں آپ نے چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹی سے استعفےٰ دیکر پھر بیرسٹری شروع کر دی اور شرع محمدی کا اس قدر وسیع اور عمیق مطالعہ کیا کہ ۱۹۰۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے آپ کو ٹیگور لا لکچرار مقرر کر دیا۔ جہاں آپ محمڈن لا کی تعلیم دینے لگے۔ پانچ سال بعد جب مدراس ہائیکورٹ کو ایک مسلمان جج کی ضرورت محسوس ہوئی تو گورنمنٹ نے آپ ہی کو انتخاب کر کے مدراس بھیجا چنانچہ ہائیکورٹ میں بھی آپ نے اپنے فرائض نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیئے۔

۱۹۱۳ء میں انڈین پبلک سروس کمیشن میں جس کے ممبروں میں برطانیہ کے موجودہ وزیر اعظم

مسٹر زا مسے میکڈانلڈ اور مسٹر گوکھلے مرحوم بھی تھے آپ بھی ممبر مقرر ہوئے۔ تحقیقات کے بعد جب اس کمیشن کی رپورٹ مرتب ہونے کی نوبت آئی تو آپ نے اپنے کثیر التعداد ہم جلیسوں کے برخلاف اپنا مشہور زمانہ اختلافی نوٹ لکھا جو آپ کی آزادی خیال کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ سیاسیات ہند میں اب اس رپورٹ کی حیثیت بہت اہم اور تاریخی ہو گئی ہے، کیونکہ اس میں آپ نے اس امر کو نہایت جرأت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ اوسط درجہ کے "سول سرونٹ" محدود قابلیت کے تنگ نظر اور خود غرض لوگ ہوتے ہیں جنھیں ہندوستان کی خدمت کرنے کا چنداں خیال نہیں ہوتا بلکہ ہر وقت ذاتی نفع کی کوشش رہتی ہے۔ یہ لوگ فضول خرچ اور بے مروت ہوتے ہیں اور ہندوستانیوں سے عموماً کج ادائی برتتے ہیں۔ کام اتنا کم کرتے ہیں کہ ایک آدمی کے کام پر دو آدمی رکھے جاتے ہیں، اور پنشن یاب ہونے پر بھی اپنا بار ہندوستان کی گردن پر چھوڑ جاتے ہیں۔ اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ سر عبد الرحیم کا یہ ریمارک کس قدر صحیح اور بیباکانہ ہے۔

بہرحال پبلک سروس کمیشن کی خدمت سے فارغ ہو کر آپ پھر ۱۹۱۵ء میں مدراس ہائیکورٹ کی ججی پر واپس آئے اور ۱۹۱۶ء میں اور ۱۹۱۹ء میں قائم مقام چیف جسٹس کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ نے آپ کو "سر" کے خطاب سے ممتاز کیا۔

۱۹۱۹ء میں جب آپ مدراس سے واپس آگئے تو اسی سال بنگال گورنمنٹ نے اپنی اگزیکٹو کونسل کا ممبر مقرر کر دیا۔ بعد کو آپ اگزیکٹو کونسل کے وائس پریسیڈنٹ بھی ہو گئے۔ اس حیثیت سے آپ عارضی گورنر مقرر ہونے کے حقدار تھے۔ لیکن گورنمنٹ نے آپ کا یہ حق نظرانداز کر دیا۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ بعد آپ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔

۱۹۲۰ء میں جب فرقہ وارانہ تنازعات کی وجہ سے بنگال کونسل کی حالت ایسی بگڑ گئی کہ ایک مستقل وزارت قائم ہونا دشوار ہو گیا تو گورنمنٹ نے سر عبد الرحیم کو وزارت مرتب کرنے کے لئے مدعو کیا لیکن اُس وقت کے حالات کے لحاظ سے آپ نے یہ ذمہ داری قبول نہیں کی۔

سر عبد الرحیم ہمیشہ اپنی اخلاقی جرأت اور حب الوطنی کے لئے مشہور رہے ہیں۔ گذشتہ اسمبلی میں بھی آپ انڈیپنڈنٹ پارٹی میں تھے، اور اس دقیانوسی اسمبلی میں بھی آپ نے بعض درخشاں کارنامے انجام دیے۔ آپ نے معاہدۂ "اوٹاوہ"۔ تشددانہ آرڈیننسوں اور وہائٹ پیپر کی نہایت شدومد کے ساتھ مخالفت کی، اور ہندوستانی سینڈھرسٹ کمیٹی قائم ہونے پر بہت زور دیا، چنانچہ گورنمنٹ کو یہ تجویز ترمیم شدہ صورت میں منظور کرنا پڑی۔

آپ ۲۴ جنوری ۱۹۳۵ء کو اسمبلی کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے تھے لیکن اس قلیل عرصہ میں کئی تاریخی فیصلے دیے جن پر ہم مختصراً ذیل میں روشنی ڈالتے ہیں:-

۱۔ مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق مسٹر محمد علی جناح نے جو ریزولیوشن اسمبلی میں پیش کیا تھا، اُسے چالاکی سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، ایک حصہ فرقہ دارانہ فیصلہ کی عارضی موافقت میں تھا اور دوسرا پارلیمنٹری رپورٹ کی مخالفت میں۔ حکومت ہند کے ممبر قانون سر نریندرناتھ سرکار نے بڑا زور لگایا کہ ریزولیوشن ایک ساتھ اور یکجائی پیش کیا جائے تاکہ کانگریس پارٹی مخالفت کرے لیکن سر عبدالرحیم نے بحیثیت پریسیڈنٹ جو فیصلہ یعنی رولنگ دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف فرقہ دارانہ فیصلہ کے متعلق حصہ منظور ہو گیا اور دوسری طرف پارلیمنٹری رپورٹ مسترد کر دی گئی۔

۲۔ پرانی اسمبلی کے ڈپٹی پریسیڈنٹ سر محمد یعقوب نے اجلاس اسمبلی کے التوا کا ایک ریزولیوشن اس بنا پر پیش کرنا چاہا کہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ پر بحث اور ووٹ شماری کے سلسلہ میں پریسیڈنٹ نے غلط طریقۂ عمل اختیار کیا تھا، لیکن سر عبدالرحیم نے اپنے رولنگ سے یہ ریزولیوشن نامنظور کر دیا اور پارلیمنٹ کے ضابطہ کا حوالہ دیکر سر محمد یعقوب کو بتایا کہ پریسیڈنٹ کے خلاف ملامت یا عدم اعتماد کا ووٹ پیش کیا جا سکتا ہے لیکن التوائے اجلاس کا ریزولیوشن پیش نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اسی طرح مسٹر کے۔ ایل۔ گابا نے التوائے اجلاس کی تحریک اس بنا پر پیش کرنا چاہی تھی کہ اسمبلی نے انڈو برٹش معاہدہ کے خلاف جو فیصلہ کیا ہے گورنمنٹ نے اس کا احترام نہیں کیا سر عبدالرحیم نے اپنے رولنگ سے اس تحریک کو بھی اس بنا پر نامنظور کر دیا کہ ایک تو اس مسئلہ پر اسمبلی میں کافی بحث ہو چکی ہے دوسرے اگر اسطرح گورنمنٹ کے خلاف اظہار ملامت کا سلسلہ جاری رکھا جائے تو وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا ہے۔

ان فیصلوں پر ہم کوئی رائے زنی نہیں کرنا چاہتے ہیں لیکن ان سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ سر عبدالرحیم نازک سے نازک موقعوں پر باریک سے باریک نکتوں کے متعلق اپنی قوت فیصلہ سے بخوبی کام لے سکتے ہیں ان فیصلوں کے متعلق کبھی کبھی اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن جہانتک آزاد خیالی اور بے لوثی کا تعلق ہے سر عبدالرحیم کی ذات فرقہ وارانہ اسپرٹ یا جانبدارانہ جذبات سے بالکل بالا ہے، اور یہی کسی قانون ساز کونسل کے صدر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ آپ اسمبلی کے وقار کو قائم رکھنے میں ولبھ بھائی پٹیل مرحوم کی شاندار روایات کا لحاظ رکھیں گے اور آپ کے فیصلے ہمیشہ ہمارے عزت و احترام کے مستحق ہونگے خدا کرے آپ کی صدارت کا زمانہ آئینی حیثیت سے ملک کے لئے مبارک ثابت ہو۔

تنقید کتب

پیراک

سید اکبر علی صاحب ایم۔اے۔ایل ٹی لکھنوی نے فن تیراکی پر یہ چھوٹا سا رسالہ لکھا ہے جس میں مختلف قسم کی پیرائیوں کے طریقے اور ان کے قواعد بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً مینڈک کی پیرائی چت، کروٹ کی، دیہاتی، ڈھب ڈھب کی ملاحیاں، سانپ کی پیرائی، گارے کی کھڑی، اونٹ کی پیرائی، سیدھا پھاندنا، سر کے بل پھاندنا، گٹھری کی پھاند، سر کھلی پھاند، دوڑ کی پھاند، غوطہ زنی، قلابازی آرام کرسی کی پیرائی، اکڑوں پیرائی، ڈیوٹ کی پیرائی، جوگی آسن، بھنور کلی، بط کی پیرائی، سادھو آسن جل ڈنڈا، شیر کی پیرائی، سنگھاڑہ، پالتھی، ڈولی، ارتھی، جھولی، ٹم ٹم، ریل گاڑی، تخت یا پلنگ جل بانک وغیرہ وغیرہ نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ فاضل مصنف نے ہر قسم کی پیرائیوں کو تصویروں اور نقشوں کے ذریعہ سے سمجھایا ہے اور پیرائی اور تیرائی کے اصطلاحات میں یہ لطیف فرق بتایا ہے کہ پیرنے میں ہاتھ پاؤں سے کام لینا پڑتا ہے تیرنے میں نہیں۔ بیجان چیز تیر سکتی ہے لیکن پیر نہیں سکتی۔ آجکل جبکہ بوائے اسکاؤٹس کی تحریک اس قدر ہر دلعزیز ہو رہی ہے ہر نوجوان کا فرض ہے کہ پیرنا سیکھے، یہ رسالہ ان کی رہنمائی کریگا۔ تناوری کے فن کو اس طرح عام کر کے فاضل مصنف نے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ رسالہ بہت مفید اور دلچسپ ہے لکھائی چھپائی کاغذ ادنیٰ۔ قیمت چار آنہ۔ ملنے کا پتہ: سید اکبر علی ایم۔اے۔ایل۔ٹی پاٹا نالہ۔ لکھنؤ۔

محبت کے پھول[1]

یہ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کا ایک بنگالی ڈرامہ ہے جسے سید فرید جعفری صاحب مچھلی شہری نے اردو میں ترجمہ کر کے ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔ ڈرامہ کی نسبت کچھ کہنا فضول ہے کیونکہ وہ فخر ہندوستان ملک الشعرا کا ایک شاہکار ہے، لیکن فرید صاحب کے لئے یہ قابل تعریف بات ہے کہ ان کے ترجمے میں اصلی ڈرامہ کی خوبیاں موجود ہیں اور ٹیگور کے شاعرانہ جذبات کو عام فہم اور سلیس

---

[1] قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ: بیگم صاحبہ سید فرید مچھلی شہری ۶۷/۹ پان دریبہ۔ الہ آباد۔

اُردو میں پیش کرنے میں انھیں قابل قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس کے شروع میں سر محمد عبداللہ المامون سہروردی کا مقدمہ، شوکت علی فہمی صاحب کا تعارف اور خواجہ حسن نظامی صاحب کی تقریظ بھی شامل ہیں۔ ڈرامہ جیبی سائز کے تقریباً سواسو صفحات پر معمولی لکھائی چھپائی اور کاغذ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

عرب کی موجودہ حکومتیں[1]

یہ کتاب شاہ معین الدین احمد ندوی کی مرتب کردہ ہے اور دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ جس میں عرب کا جغرافیہ ہے" ایک طالب علم مقیم مکہ" کا لکھا ہوا ہے، دوسرا حصہ جس میں نجد حجاز، عسیر، یمن، لحج، نواحی تسعہ، بحرین، کویت، عراق، شام اور فلسطین کی حکومتوں کے حالات ہیں شاہ معین الدین احمد صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے نہ صرف عرب اور اسکی مختلف سلطنتوں کے دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں بلکہ اس سے جزیرۃ العرب میں عموماً یوروپین پالیسی اور خصوصاً برطانوی حکمت عملی کا حال بھی واضح ہوجاتا ہے جس کی بدولت رفتہ رفتہ تمام سواحل عرب پر یوروپین طاقتوں کا قبضہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ لکھائی چھپائی روشن کاغذ عمدہ۔ حجم ۱۷۰ صفحے۔

نکہت دیال باغ[2]

یہ چھوٹی تقطیع کے چار جزو کا مختصر رسالہ پنڈت شیو ناتھ کول شاکر گوالیاری کی اٹھارہ مختلف نظموں کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر باوقات مختلف "پریم پرچارک" دیال باغ آگرہ میں شائع ہوچکی ہیں اس میں سات نظمیں دیال باغ اور رادھاسوامی مت سے تعلق رکھتی ہیں اور بقیہ مختلف اخلاقی، روحانی موضوعات پر ہیں، جن کے مطالعہ سے عوام بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ دو چار غزلیں تصوف میں بھی ہیں ہمیں ان تمام میں" ہندوستان کی عورت" نامی نظم بہت پسند آئی جس کا پہلا بند یہ ہے:۔

ہمدرد ہے، رفیق ہے، درد آشنا بھی ہے ہمدم ہے ہمخیال ہے اہلِ وفا بھی ہے
سنجیدہ بھی ہے، نیک بھی ہو پارسا بھی ہے صابر بھی ہے حلیم بھی ہو، باخدا بھی ہے
عورت اگر ہے خوب تو ہندوستاں کی ہے
اس کے ہی انتظام سے رونق مکاں کی ہے

---

[1] قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ: دار المصنفین اعظم گڑھ۔
[2] کمرشل اسٹور: دیال باغ آگرہ سے چار آنہ میں ملتا ہے۔

عالمِ نسواں

خوشی کی بات ہے کہ آجکل ہر شعبہ میں عورتوں کے حقوق کا لحاظ کیا جا رہا ہے، چنانچہ کارمائیکل لائبریری بنارس نے اپنے کتب خانہ میں ایک کمرہ عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے جس کا افتتاح پچھلے ماہ لیڈی سریواستو صاحبہ اہلیہ آنریبل سر جوالا پرشاد سریواستو وزیر تعلیمات کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ صوبہ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ کسی پبلک لائبریری نے خاتونوں کے لئے علحدہ انتظام کیا ہو، جہاں وہ گھر گرستی کے دھندوں سے فارغ ہو کر اپنی فرصت کے چند لمحے علمی مشاغل میں صرف کر سکیں۔ کارمائیکل لائبریری کی یہ پیشقدمی قابل داد اور لائق تقلید ہے۔ لیڈی سریواستو نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس بات پر بہت زور دیا کہ دنیا میں کوئی ملک ہندوستان جیسا ناخواندہ نہیں ہے اور صوبہ متحدہ کے لئے جو ہندوستانی تمدن و تہذیب کا گہوارہ ہے یہ بات بہت قابل افسوس ہے کہ وہ تعلیمی لحاظ سے برہما۔ کوچین۔ ٹراونکور۔ بڑودہ۔ مدراس اور بنگال سب سے پیچھے ہے۔

پچھلے مہینے میں آل انڈیا خواتین کانفرنس منعقدہ کراچی کی مختصر کارروائی مذر ناظرین کیجا چکی ہے۔ اس کانفرنس میں ان بدعتوں کے خلاف بھی احتجاج کیا گیا جو قدیم رسم و رواج کے مطابق بلوچ قوم کی عورتوں پر روا رکھی جاتی ہیں، مثلاً بجائی (جس کی رو سے متوفی مرد کی بیوی اس کے ورثا کی ملکیت بنجاتی ہے) خونبہا اگر کوئی شخص کسی کو قتل کردے تو مقتول کے عزیز قاتل کی بیٹیوں اور بہنوں پر جبراً قبضہ کرلیتے ہیں) بدلا (بچے ہنوز ماں کے پیٹ ہی میں ہوتے ہیں کہ ان کی شادیاں کر دی جاتی ہیں۔)

ہندوستان کی یونیورسٹیاں ابھی صرف چار قسم کی عورتیں پیدا کر سکی ہیں (۱) ایم۔ اے، بی۔ اے (۲) استانیاں (۳) ڈاکٹرنیاں اور (۴) وکیل۔ لیکن زندگی کے دیگر شعبوں میں ہندوستان کی عورت نے ابھی تک کوئی حصہ نہیں لیا ہے۔ اس بارہ میں جرمنی سب پر فوقیت لے گیا ہے، چنانچہ وہاں گیارہ پلکنولاجیکل یونیورسٹیاں ایسی ہیں جن میں عورت اور مرد دونوں برابر کی حیثیت سے داخل ہو سکتے ہیں آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد چار سال تک تعلیم پاکر عورتیں بھی انجینیرنگ کے شعبوں مثلاً (۱) مشین سازی، (۲) برقی قوت سے کام لینا (۳) تعمیرات (۴) عملی طبعیات اور (۵) عملی کیمسٹری وغیرہ میں ڈپلومہ حاصل کر سکتی ہیں

اس کے علاوہ جرمنی میں عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے پانچ تجارتی اور چار زراعتی یونیورسٹیاں بھی ہیں اسکولوں میں صنعت و حرفت کے علاوہ لڑکیوں کو (۱) ماماگری (۲) اناگری (۳) گھر کے کام کاج وغیرہ کی تعلیم الگ دی جاتی ہے۔

پچھلے دنوں ٹرکی کی سب سے بڑی پارلیمنٹ کا انتخاب تھا، اس میں سترہ ترک خاتونیں ممبر منتخب ہوئی ہیں۔ اس مرتبہ انتخابات میں تیئس سال سے زیادہ عمر کی ہر عورت کو امیدواری کا حق حاصل تھا۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ ترک خواتین نے اپنے حق رائے دہی سے کام لیا۔

مسز کے۔ کے۔ کول (مسٹر آر۔ این۔ کول الہ آباد یونیورسٹی کی اہلیہ محترمہ) ہندوستانی انجمن ماہرین سکہ جات کی ممبر منتخب ہوئی ہیں، آپ کو اس فن سے خاص دلچسپی ہے۔

شریمتی مہارانی دیوی جونپور میونسپل بورڈ کی پہلی خاتون ممبر مقرر ہوئی ہیں۔

آل انڈیا ہندی شاعرہ کانفرنس ۱۹۳۵ء کی صدارت کے لئے شریمتی توران دیوی شوکل المتخلص بہ لالی منتخب ہوئی ہیں۔

شریمتی سیتہ وتی دیوی صوبہ متحدہ کی انجمہائے امداد باہمی کی پہلی خاتون انسپکٹر ہیں۔ آپ کی کوشش سے اب صوبہ کے اکثر مقامات میں کوآپریٹیو سوسائیٹیاں قائم ہو رہی ہیں۔

---

۱۲ جنوری ۱۹۳۵ء کو دہلی یونیورسٹی کی لا یونین سوسائٹی کے مقابلۂ موسیقی میں گلے بازی کا اول انعام مس جمنا سانے (عمر نو سال) کو ملا۔ ہندو کالج دہلی کے آل انڈیا موسیقی مقابلہ میں بھی یہی لڑکی اول آئی اور درجہ اول کا انعام اور متعدد تمغے حاصل کئے۔

سینٹ زیویر کالج بمبئی کی مس سنتوش کھنہ نے لکھنؤ کی آل انڈیا ڈیبیٹ میں خواتین کا اول انعام حاصل کیا۔
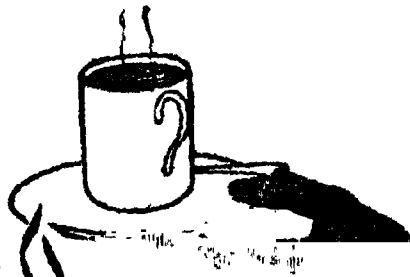
جلد کی تمام شکایتوں میں جڑی بوٹیوں کا بنا ہوا مرہم

زمبک استعمال کیجیے

ایسی بیمار جلد کو آرام دینے میں جس میں سوزش یا جلن محسوس ہوتی ہو زمبک مرہم ایک بالکل حیرت انگیز چیز ہے۔ یہ تمام خارش اور درد کو ختم کر کے جلتی ہوئی جلد کو تسکین دیتا ہے زمبک زہریلے جراثیم کو ہلاک کرتا ہے اور تمام مادۂ فاسدہ کو خارج کر دیتا ہے اور نئی تندرست کھال پیدا کرتا ہے۔ خراشوں۔ کٹے جلے ہوئے زخموں۔ پھوڑوں پھنسیوں وغیرہ کے لئے بھی یہ بے نظیر چیز ہے۔ تمام دوا فروشوں سے ایک روپیہ یا سوا دو روپیہ فی ڈبیہ ملتا ہے

تمام حیوانی چربی سے پاک

ایجنٹس

مسرز سمتھ اسٹانسٹریٹ اینڈ کمپنی لیمیٹڈ

اسٹالی۔ کلکتہ

زمبک Zam-Buk

ہندوستان کی
خاص
پینے کی شے

پیپس

PEPS
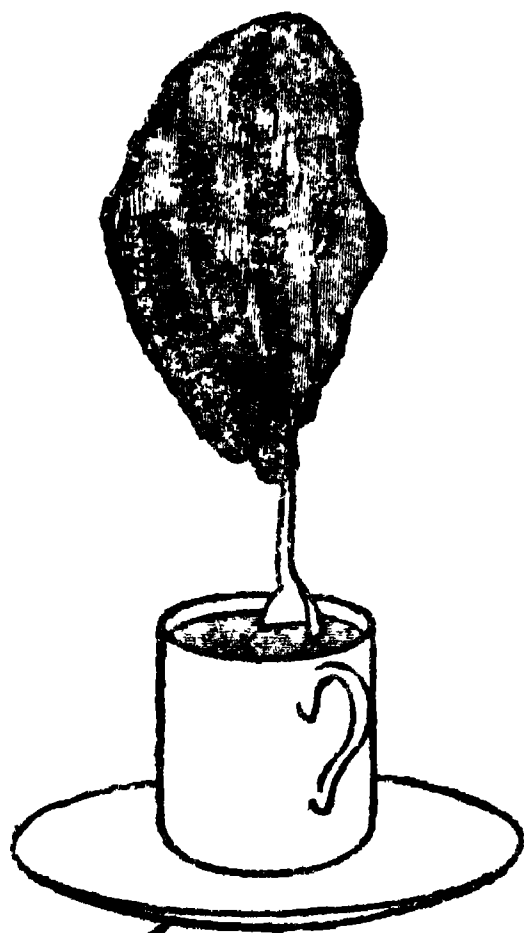
اپنے حلق اور سینہ کی خطرناک سردی کھانسی

انفلوئنزا دمہ اور سوزشِ گلو سے حفاظت کیجئے

پیپس کی جراثیم کش سانس کے ذریعہ سے شفا دینے والی ٹکیاں استعمال کیجئے

حلق اور سینہ کی تمام شکایتوں کا یقینی اور سریع الاثر علاج پیپس ہیں۔ ذائقہ میں خوشگوار ہونے کے علاوہ اس قدر طاقتور ہیں کہ دم گھونٹنے والے بلغم کو قطع کر کے حلق کی تمام دکھن اور سانس کی نالیوں کے اندر کا جماؤ دور کر دیتی ہیں۔ پیپس کی ٹکیہ چوستے وقت شفا بخش ابخرے بمقدار کثیر خارج ہوتے ہیں جو سانس کے ساتھ براہ راست پھیپھڑوں میں پہنچتے ہیں جہاں تک رقیق دواؤں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ تمام دوا فروش ایک روپیہ فی شیشی فروخت کرتے ہیں۔

PEPS for COUGHS COLDS &

پیپس کی ہر ٹکیہ پر روپہلی ورق چڑھا ہوتا ہے

روحانی مسرت

دل کی سچی خوشی کون نہیں چاہتا؟ لیکن یہ کتنوں کو نصیب ہوتی ہے؟ میرے دل و جان کے مالک سوامی بھولاناتھ جی مہاراج نے جن کو میں موجودہ زمانہ کا پریم اوتار جانتا ہوں اُنھوں نے چند کتابیں روحانیت اور سچی محبت میں ڈوبی ہوئی لکھی ہیں جن کے پڑھنے سے ہر شخص کا غم غلط ہو جاتا ہے۔

تین پیسہ کا ٹکٹ بھیجکر مفت پمفلٹ منگوا لیجئے

پتہ

رام رتن کھنہ

رجسٹرار لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

شاعری سیکھئے

مولانا خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کی معرکۃ الآرا تصنیف شاعری کا مکمل سیٹ جس سے بیشمار شاعر اسوقت تک مستفیض ہو چکے ہیں اور برابر ہو رہے ہیں جسمیں تقطیع کرنیکا آسان قاعدہ علم عروض علم قافیہ محاسن معائب شاعری تاریخگوئی کے قواعد صنائع و بدائع کا بیان اصلاح دینے کے اصول اور ابتدائی مشق کے آسان قاعدے بالتفصیل مذکور ہیں ابتک اس سے زائد آسان کتاب جسکو مبتدی پڑھکر بآسانی سمجھ سکے نہیں تھی اگر آپکو اردو زباندانی اور شاعری کا شوق ہے تو پہلے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے اور مشق کی ترکیب پر عمل کیجئے ایک سال میں آپ شاعر کامل بنجائیں گے۔ حال میں کچھ مفید اضافہ کر کے کتاب کا حجم اور زیادہ کر دیا گیا ہے۔ مکمل سیٹ کی قیمت دو روپیہ ۲ہ ہے۔ مصنف موصوف اور دیگر مشہور مصنفین کی نادر و نایاب کتابیں پتہ ذیل سے طلب کیجئے۔ فہرست مفت

منیجر عشرت بکڈپو کیننگ اسٹریٹ احاطہ خانسامہ لکھنؤ

روسی ڈاکٹر ورناف ہندوستان میں

روس کے مشہور ڈاکٹر ورناف نے جو بندر کے غدود لگا کر از سر نو جوانی کا جوش پیدا کر دیتے ہیں ہندوستان میں آکر کئی جگہ آپریشن کر کے غدود چڑھایا۔ اس طرح کرنے میں ہزاروں روپیہ کا صرف ہوا۔ بندر کا غدود چڑھانے سے خیالات میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے اس طرح کی کئی باتیں اخباروں میں پڑھی گئیں اس لئے آپ بلا وجہ اس قدر صرفہ کا بار برداشت کر کے اپنے خیالات پراگندہ نہ بنائیں۔

آپ صرف مقویات سرتاج عالم آتنگ نگرہ گولیوں کا استعمال کریں یہ گولیاں تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کے سر دجوان میں تازگی پیدا کر دیں گی۔ منی سے جسم کی رگ رگ کو بھر دیں گی اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں جوش پیدا ہو جائیگا آپ کے خیالات پاکیزہ جسم مضبوط حافظہ تیز چہرہ پر نور ہو کر لطف زندگی سے بہرہ اندوز ہو جائیں گے۔ قیمت بھی معمولی جس کو دیکھکر شاید آپ ہنس پڑیں یعنی فی ڈبیہ ۳۲ گولی صرف ایک روپیہ پانچ ڈبیہ صرف چار روپیہ۔ اگر کوئی پوشیدہ شکایت ہو تو ایک شیشی طلا واجی کرن استعمال کیجئے قیمت فی شیشی پانچ روپیہ ۵ہ دیگر رموز زندگی معلوم کرنے کے لئے ایک عدد کتاب کام شاستر بالکل مفت منگوا لیں۔

وید شاستری منی شنکر گووند جی جام نگر (کاٹھیاواڑ)

The Pioneer
پائنیر
ہندوستان کا
سب سے با اثر روزنامہ
قیمت ار
صوبجات متحدہ کے
تمام بڑے اسٹیشنوں پر ملتا ہے

جملہ حقوق محفوظ ہیں — رجسٹرڈ نمبر ۲۱۰

مرتبہ: دیانرائن نگم، بی اے

جلد ۶۴	اپریل سنہ ۱۹۳۵ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

تصویر۔ ہندو فن رقص کے نمونے۔

قیمت فی پرچہ ۴

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ ... ہندوستان کے لئے ... تین روپیہ

ہندی فن رقص کا نمونہ

زمانہ

جلد ۶۴ — اپریل سنہ ۱۹۳۵ء — نمبر ۴

ہندی فنِ رقص

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی۔اے۔ ایل ایل۔بی)

جس طرح والمیک، کالیداس اور شودرک وغیرہ کو ہندِ قدیم کا ناخدائے سخن تسلیم کیا جاتا ہے اسی طرح بھرت منی اور نندی کیشور ہندی فن رقص کے ماہر و نقاد مانے جاتے ہیں۔ جب یہ رنگین فن انتہائے کمال کو پہونچ گیا تو وہ دن بھی آیا کہ زوال و ادبار کی عالمگیر تباہ کاریوں نے اسے متروک و معیوب قرار دیکر اس کا وجود نقشِ باطل کی طرح مٹا دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ چنانچہ اب یہ عالم ہے کہ شاذ و نادر ہی کہیں کوئی صاحبِ فن ایسا نظر آجاتا ہے جسے ان باریکیوں کے پرکھنے کی نظر ہو۔ لیکن سنسکرت ادب کے صرف چند ہی ایسے جواہر ریزے ابتک تخریب زمانہ سے محفوظ و مامون رہ گئے ہیں جو فنِ رقص کے نکات کی توضیح و تشریح کے لئے وقف ہوں۔ ان میں سے بعض مشہور تصانیف یہ ہیں:-

(۱) ناٹیہ شاستر (नाट्य शास्त्र)

(۲) شلپ آدی کرم (शिल्पादि कर्म) اور

(۳) ابھینے درپن (अभिनय दर्पण)

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ متذکرہ بالا کتابوں کے علاوہ اس موضوع پر اور بھی بہت سی اہم تصانیف لکھی گئی ہونگی جو اب اہل ہند کی ناقدری سے تلف ہو گئی ہیں۔ بھرت کا ناٹیہ شاستر ملک کی بعض ادبی

زبانوں میں وقتاً فوقتاً تراجم بھی ہوئے اور اس پر معرکہ آرا تنقیدیں بھی لکھی گئیں۔ چنانچہ ادیار کلکشر نے تامل زبان میں شاپ آدی کرم پر ایک پُرمغز او بسیر حاصل تبصرہ سپرد قلم کیا تھا جواب بھی نا پید نہیں ہے اور اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ بھرت ناٹیہ شاستر کے ادق مضامین کو عام فہم بنانے کی ملک میں کوششیں ہو چکی ہیں۔

مدراس کے قدیم مشرقی مسوّدات کے سرکاری کتب خانہ میں ایک غیر مطبوعہ کتاب (Natankusa) "ناٹن کسا" موجود ہے جس کے مصنف نے ناٹیہ شاستر کے مقررہ اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اپنے عہد کے مختلف مروجہ ناچ کے محاسن و معائب تبصرہ کیا ہے۔ اس کتاب میں مشہور سنسکرت ناٹک ... چوڑا (आश्चर्य चूड़ामणि) اور ناگ نندا (नाग नन्द) کا اکثر جگہ حوالہ دیا گیا ہے جس سے ان ناٹکوں کے بعد تصنیف ہونا ثابت ہوتا ہے۔ غرض ایسی کتنی ہی تصانیف ہونگی جو اب نیست و نابود ہو چکی ہیں۔

ہندی فن رقص کی قدامت کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن نفسیات اور فطرت انسانی کے رو سے تمام فنون لطیفہ میں اوّلیت کا سہرا رقص ہی کے سر ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ناٹیہ شاستر کی تصنیف پانِنی کے عہد میں ہوئی ہے۔ پانِنی نے اپنی ویاکرن میں شلالن اور کرشاشو (शिलालिन और कृशाश्व) کو ناٹک کا آچاریہ یا اُستاد مانا ہے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ ہندوستان میں پانِنی (पाणिनि) سے ہزارہا سال پہلے سنسکرت ناٹک مروّج تھے۔ بہرحال کسی فن لطیف کے اس درجہ مکمل قواعد و ضوابط اس کے معراج کمال کو پہونچنے سے پیشتر مرتب نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ایسی جامع تصانیف اس سے قبل ضبطِ تحریر میں آسکتی تھیں جن سے بھرت نے ناٹیہ شاستر لکھنے میں استفادہ کیا ہو۔ پھر اس فن کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا کوئی ایک دن کا کام نہیں ہو سکتا، اس کے لئے کتنی مدت درکار ہے اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔

بھرت ناٹیہ کا سنگ بنیاد بشری کیفیت مزاج پر رکھا گیا ہے، جیسا کہ بھرت نے لکھا ہے:۔

अवस्थान कृर्ति : नाट्यम् ।

اس قسم کی نمائش میں بھاؤ (भाव) یا ادا، راگ، تال، لے اور جذبات و محسوسات کا شامل ہونا ضروری ہے۔ ناٹیہ کی روپک اور اُپ روپک یہ دو قسمیں ہیں۔ پہلی سے واکیہ ارتھا بھینے (वाक्यार्थाभिनय) یعنی کسی بات کے مطالب کو تمثیل کی خاموش زبان میں ادا کرنا یا رَس ابھینے (रस अभिनय) یعنی نو رسوں میں سے کسی ایک رَس یا کیفیت کو خود پر طاری کر کے دکھانا اور دوسری سے پدارتھا بھینے (पदार्थाभिनय) یعنی کسی شے کی نمائش کرنا یا بھاوا بھینے (भावाभिनय) یعنی کسی

جذبہ کی تشکیل مراد ہے۔ ناٹک روپک کے ذیل میں آتا ہے، اور رقص اُپ روپک کے تحت میں۔ دراصل اِن دونوں میں بہت کم فرق ہے۔ ناٹک کی ابتدا رقص ہی سے ہوئی ہے، اور اس میں رَس یا کیفیات کی نمائش پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن رقص صرف بھاؤ یا جذبات کے تشکل کرنے ہی تک محدود رہتا ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ ایک طویل و مسلسل منظوم کہانی اور مختصر نظم میں جو باتیں مابہ الامتیاز ہو سکتی ہیں وہی ناٹک اور ناچ کا فرق نمایاں کرتی ہیں۔ ناٹک میں کیفیات کی عریانی کا سلسلہ برابر رواں دواں رہتا ہے، لیکن ناچ میں یہ کیفیت دیرپا اور استوار نہیں ہوتی۔ ناٹک نقل کی اِن چاروں اقسام پر حاوی ہے۔

(۱) واچکا (वाचिका) یا مکالمہ

(۲) ساتوکا (सात्विका) یا بتاوہ مثلاً رونا، منہ چڑانا وغیرہ

(۳) انگیکا (आङ्गिका) یا عملِ قوی اور

(۴) اہریا (आहारिया) یا بناؤ سنگار وغیرہ

ناٹک کی نقل و حرکت زیادہ تر لوک دھرم (लोक धर्म) یا فطرت و حقیقت کے عین مطابق ہوتی ہے۔ مگر انواع و اقسام کے ناچوں، نقلوں اور نامکمل ناٹکوں کا اندازِ عمل بالعموم ناٹیہ دھرم (नाट्यधर्म) یا اعلیٰ معیارِ فن کے تابع ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں ابھینے یا بتاوے کی افراط و تفریط ہونا لازم ہے۔

ناٹیہ شاستر کے نزدیک نرت (नृत्त) اور نرتیہ (नृत्य) میں بڑا فرق ہے۔ نرت صرف لَے (लय) اور تال کا پابند ہے۔ جذبات کی ترجمانی سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ محض مسرت و شادمانی کا مظہر ہے۔ دلپذیر حرکات و نظر نواز اداؤں سے عیش و نشاط کا سامان بہم پہونچانا اور ایک خوبصورت پیرائے میں لَے کا متشکل کرنا ہی اس کا مقصود ہے، لیکن نرتیہ اس سے کہیں زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ ابھینے یا بتاوہ نرتیہ کی روح رواں ہے۔ بتاوے کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز (हस्ताभिनय) ہست ابھینے ہے، جسے مصوری کی اصطلاح میں مُدرا (मुद्रा) کہتے ہیں، اس سے ہاتھوں کے وہ مختلف اشارے مراد ہیں جن سے ارتھ (अर्थ) یا تخیلات اور دیگر اشیاء کی نمود و نمائش کی جاتی ہے۔

چشم و ابرو، لب و رخسار اور چہرے مہرے سے جذبات و کیفیات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے آنکھیں درحقیقت اداکاری کی جان ہیں۔ بھرت منی کا خیال ہے کہ احساسات و جذبات سب سے پہلے چتون ہی سے مترشح ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دیگر اعضائے بدن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ علم قیافہ شناسی

کا مدار بھی اسی بنیادی اصول پر ہے۔ بھرت کے مطابق آنکھوں سے تینتیس[۳۳] (व्यभिचारी भाव) یا معمولی کیفیات اور نو (स्थायी) یا اہم کیفیات کا اظہار ہوتا ہے جن سے دیکھنے والے پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں ہندی ماہرینِ نفسیات کے حیرت انگیز تبحّرِ علمی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ناٹیہ شاستر میں اور بھی کتنی ہی حرکات کا مذکور ہے، جن میں سے ریچک (रेचक) یا گردن اور سینہ کی لطیف تحریکیں مثلاً گردن کا خم وتموج اور سینہ کا ابھار اُس کا مدوجزر نمایاں طور پر لائقِ ستائش ہوتا ہے۔ (आंगिकाभिनय) یا قوائے جسمانی کی حلیت پھرت، بھرت نے (शारीराभिनय) یعنی جسمانی عمل کی یہ تین صورتیں بتائی ہیں:۔

(۱) چہرہ کا عمل (۲) چہرہ اور ٹانگوں کو چھوڑ کر جسم کے باقی حصوں کی حرکات اور (۳) دوسری فطری نقل وحرکت مثلاً ٹانگوں کی آمد ورفت، نشست وبرخاست اور ٹہلنا وغیرہ۔ ناچ میں صرف پہلی دو صورتوں کا اجتماع ہوتا ہے اور (चेष्टा) یا تیسری صنفِ عمل اس میں یکسر مفقود نہونے پر بھی نمایاں نہیں رہتی۔

پہلی صنفِ عمل کے چھ ٹکڑے ہوتے ہیں جن کا بدن کے اِن چھ حصّوں سے لگاؤ ہے:۔

(۱) سر (۲) ہاتھ (۳) کولا یا کمر (۴) چھاتی (۵) پاؤں (۶) بغل وبازو۔ یہ تو چھ انگ ہوئے۔ ان کے علاوہ حسبِ ذیل چھ اُپ انگ بھی ہیں جو چہرے کے حرکات وسکنات سے تعلق رکھتے ہیں:۔

(۱) آنکھ (۲) ابرو وپیشانی (۳) ناک (۴) ہونٹ (۵) رخسار (۶) ٹھوڑی۔

ناٹیہ شاستر میں لکھا ہے:۔

कंठेन अलमबयेत् गीतम्
पदा भ्याम् तालम् आचरेत् ।
चक्षुर भ्याम् दर्शायत भावम्
हस्तेन अर्थम् प्रदर्शयत ॥

گلے سے راگ الاپا جاتا ہے، پاؤں سے تال بتائی جاتی ہے، آنکھ سے جذبہ اور ہاتھ سے تخیل وغیرہ کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

بعض قدیم نکتے اس تفسیر وتفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ ہندی فنِ رقص کا انحصار علم النفس[۱] کے عمیق مطالعہ پر ہے۔ چنانچہ ہر کامیاب رقاص یا اداکار کے لئے نفسیات کا ماہر ہونا شرط ہے۔ بھرت نے

---

[۱] علم النفس کے مختلف موضوعات پر راقم مضمون کے مضامین کا ایک سلسلہ ایجوکیشنل گزٹ الہ آباد میں شائع ہو رہا ہے۔

ناچوں کی بہت سی قسمیں گنائی ہیں۔ یہ تقسیم بھی علم النفس کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ناچ کی بعض مشہور اقسام یہ ہیں:۔

(۱) رادھا کرشن نرتیہ (۲) راجپوت نرتیہ (۳) گرامیہ نرتیہ (ग्राम्य) (۴) بِواہ نرتیہ (विवाह)

(۵) اَسی نرتیہ (ससि) (۶) گندھرو نرتیہ (۷) شیو نرتیہ (۸) وسنت نرتیہ (۹) میور نرتیہ (۱۰) تانڈو۔ رتیہ

(۱۱) لَسیہ (लास्य) (۱۲) سنگار اور (۱۳) کتھا کلی وغیرہ۔

تانڈو (ताण्डव) نرتیہ کے بارے میں ناٹیہ شاستر کے باب چہارم میں مرقوم ہے کہ یہ وہ ناچ ہے جو شیوجی نے تانڈو (ताण्डव) نامی اپنے ایک (गरा) کے توسط سے بھرت اور ان کے لڑکوں کو سکھایا تھا۔ یہ نہایت پُرجوش اور مردانہ ناچ ہے۔ تانڈو نرتیہ جوشیلی (उद्धात) قسم کا ناچ ہے (ओज) یا اضطراب اس کی خاصیت (गुण) ہے اور (वीभत्स रस) یا ہولناک کیفیتوں کو عُریاں کر کے جذبات کو برانگیختہ کرنا اس کا کام ہے۔

لَسیہ تانڈو کی ضد ہے۔ اس کی ابتدا اوما یا پاربتی سے منسوب ہے۔ لَسیہ دراصل سنگار نرتیہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس کی صفت (माधुर्य) یا مٹھاس ہے۔ ناچ کی تمام دیگر اقسام میں تانڈو اور لَسیہ کا کم و بیش شائبہ ضرور رہتا ہے۔ کالیداس کے معروف ناٹک مال کاگنی متر میں مال وِک نے اگنی متر کی دلبستگی و خوشنودی کے لئے لَسیہ نرتیہ کیا ہے۔ یہ ناچ صنفِ نازک کے لئے مخصوص ہے لیکن کالیداس کی معرکۃ الآرا نظم میگھ دوت یا پیک اَبر میں مہاکال کے قدیم مندر واقع اُجین میں نٹ راج (شیوجی) کے سامنے درباریوں کا بھی لَسیہ نرتیہ کرنا مرقوم ہے۔

تانڈو نرتیہ میں رقاص کبھی اوپر کو بڑھتا اور کبھی نیچے کی طرف حرکت کرتا ہے۔ لیکن لَسیہ میں بغلی جنبشوں کے ذریعہ پہلو بدلتے پڑتے ہیں۔

کتھا کلی مسٹر پشِروتی کا کہنا ہے کہ کتھا کلی یا اتک کتھا (अस्तक कथा) رقص کی ابتدا آریوں کے ہندوستان آنے سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ لیکن مسٹر نائر اس دعوی کی تردید کرتے ہیں اور صرف چار سو برس پیشتر کا زمانہ اس کے آغاز کا عہد بتاتے ہیں، لیکن بعض حقائق کی بنا پر ان کی یہ رائے ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ اب سے سیکڑوں برس پہلے رام اور کرشن ناٹک دکن میں عام طور پر دکھائے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ بنگال کی یاتراؤں کی طرح اور بھی کتنے ہی سوانگوں وغیرہ کا رواج تھا۔

کتھا (کہانی) کلی (تمثیل) جیسا کہ خود اُن کے نام سے ظاہر ہے ہمارے ناٹکوں کی ابتدائی

صورت معلوم ہوتی ہے، اور جیسا کہ آگے آئیگا، کٹھ پتلیوں کے ناچ اور چھایا ناٹکوں کے آغاز سے
قبل اس کا عرصۂ ظہور میں آنا یقینی ہے۔ مایاورم (تنجور) کے مندر میں ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جس سے
پتہ چلتا ہے کہ مندروں میں تیوہاروں کے موقع پر ناٹک دکھائے جانے کی رسم بہت قدیم ہے جے دیو
کے گیت گووند کی طرح سنسکرت کی دیگر تصانیف کو بھی ناٹک کی شکل میں تبدیل کر کے اسٹیج پر کھیلا
جاتا تھا۔ گیت گووند کی مشہور تنقید سے جو تنجور کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہ حقیقت بخوبی ثابت
ہوتی ہے کہ صرف یہی نہیں بلکہ اس میں ایک مقام پر پورا ناٹک لفظ بہ لفظ منقول ہے۔

مسٹر ہیڈوول راوی ہیں کہ چکیئر (चकयार) جو سنسکرت ناٹک دکھایا کرتے تھے، وہ سرتاسر
کتھا کلی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ کتھا کلی اُپ روپک کا اہم جزو ہے جو بھاو ابھینے یا اداؤں
کی غیر ملفوظ زبان ہے۔ چونکہ اسمیں مکالمے (واچکا) نہیں ہوتے اس لئے ہم اُسے گونگے سوانگ
سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔ اس قسم کے دوسرے کتنے ہی سوانگ قدیم ہندوستان میں رائج
تھے۔ کتھک، ترکوٹو، اٹک کتھا، کلاکشیپ (कला क्षेप) ولاسم، کیش گان، ناٹکم اور ویتھی
ناٹک (वीथी नाटक) وغیرہ کتھا کلی سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔

سنگیت سُدھا کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ کیش گان میں کیرتن کی قسم کے گانے بھی
شامل تھے، ترکوٹو اور کیش گان اس اعتبار سے دراصل ایک ہی چیز کے دو نام کہے جا سکتے ہیں۔ کتھا کلی
اور ان توام برادروں میں اتنا اختلاف ضرور ہے کہ ان میں نثر کی اسپیچ بھی شامل ہوتی ہے۔ اول الذکر
میں ایسا ہونا اُصولاً ممنوع ہے۔ کتھا کلی میں مکالمہ نہ ہونے کے باعث ابھینے یا بتاوے کی زیادتی
ہوتی ہے، اور کئی کئی اداکار بیک وقت مختلف پارٹ ادا کرتے ہیں لیکن ناچ میں صرف ایک ہی نفر
ہوتا ہے اور اس میں فنی معیار کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے، اسی لئے اس میں ابھینے کی جھلک
عود کر آتی ہے۔ کتھا کلی میں (काम्भरावद्द) کمرا بدھ اور بکا بدھ (बकावद्द) کی طرح
راکشسوں وغیرہ کے قتل و غارتگری وغیرہ کے مہیب مناظر کی نمایش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسمیں
نرت کو بھی بہت زیادہ دخل رہتا ہے (ورنہ ترکوٹو کی طرح یہ بھی نرت اور نرتیہ کا مجموعہ ہے) اس لئے
یہ انگاہار (अंगाहार) استھان (स्थान) اور کرن (करण) کے لحاظ سے تانڈو نرتیہ ہی
کا دوسرا رخ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں شرنگار رس اور حسن و عشق کی چاشنی کے ساتھ ساتھ کمل
دَل کا بھی اجتماع رہتا ہے۔ کمل دل (कमलदल) لسیہ نرتیہ کی ایک قسم ہے۔ بَس مینکا کی رائے

سلہ مزید تفصیل کے لئے صاحب مضمون ہندی ناٹک کے متعلق ایک دو علیحدہ مضمون لکھنا چاہتے ہیں۔

میں لسیہ نرتیہ صرف کتھک سوانگ ہی میں پایا جاتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ کتھک شمالی ہند کا ایک مروجہ ناچ ہے۔ یہ کتھا کلی سے قدرے مختلف لیکن دکن کے کتھا کلا کشیپ سے بالکل مشابہ ہے، کتھا کلا کشیپ میں بھی لسیہ نرتیہ کا شائبہ نظر آتا ہے، اور کتھک ہی کی طرح اس میں بھی نرت کی کثرت اور ابھینے کا قریب قریب فقدان رہتا ہے۔

کتھا کلی میں ترکوٹو کی طرح ترمانس (तृमानस)اور کلاسم (कलासम) نرت شامل رہتے ہیں۔ ترمانس اور کلاسم میں تال تو ایک ہی قائم رہتی ہے لیکن گت (गति) بدل جاتی ہے۔ کتھا کلی اور ترکوٹو کی تکمیل کے لئے نرت اور نرتیہ دونوں ہی کے اختلاط و اشتراک کی ضرورت ہے، چونکہ کتھا کلی گونگے سوانگ کے مرادف ہے اس لئے اس کا شمار ناٹیہ یا تمثیل میں نہیں بلکہ نرتیہ میں ہوتا ہے۔ اس میں کیفیات کے بجائے جذبات وتخیلات کے مظاہرہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

سنسکرت ناٹکوں میں مہیب مناظر کی نمایش قطعاً ممنوع ہے، لیکن کتھا کلی میں ان کا دکھایا جانا نہ صرف مناسب بلکہ احسن سمجھا جاتا ہے۔ ناٹیہ شاستر کے مصنف نے اس رواج کو ناٹیہ شاستر کے خلاف قرار دیکر اس کی سخت مذمت کی ہے اور اس کی مخالفت میں پُرزور صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ کیا عجب ہے کہ کتھا کلی کے مہیب مناظر کے ناخوشگوار اثرات کو دیکھکر ہی نقادوں نے اِس قسم کی نمایش کی مخالفت کی ہو، اور بعد میں سنسکرت ناٹکوں میں ان کا دکھایا جانا اصولاً ممنوع قرار دیدیا گیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا کرنے سے سنسکرت ناٹک ادھورے اور نامکمل رہ گئے ہیں۔ اس بات پر غور کرنے سے کہ سنسکرت ناٹک انسانی زندگی کا صرف ایک ہی پہلو پیش کرنے پر کیوں قناعت کرتے ہیں، عقلِ رسا ایک ہی لازمی نتیجہ پر پہنچتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے المناک وغم انگیز پہلوؤں کو ناٹک کے پیشرو سوانگوں (کتھا کلی وغیرہ) میں نمایاں کرنے سے جو عام بدمزگی کا احساس ہوا ہو ممکن ہے وہی آگے چلکر ناٹکوں میں اس قسم کی نمایش میں مانع ومزاحم ہوا۔

اس قیاس کے قرین عقل ہونے کی بنا پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ کتھا کلی کم از کم ہمارے ناٹکوں کی ابتدا سے پہلے کی چیز ہے۔ تامل ادبیات کی رو سے کتھا کلی اور (Teru Kkoottu) ترکوٹو میں اس درجہ مطابقت ہے کہ دونوں کے ہمجنس ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ جس طرح ترکوٹو کا آغاز ساز کی چھیڑ اور تودیم (नांदयम) یا حمد خدا سے ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح کتھا کلی کی شروعات بھی حمد باری سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد دونوں میں کہانی اور اس کے مصنف کے ناموں کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس اثنا میں ساز برابر بجتا رہتا ہے، باہر باجوں کا اس طرح شروع ہی سے بجتے رہنا

[illegible]

ناٹیہ شاستر کے مطابق نرگیت وادیہ (नगीतवाद्य یا اُسرو ادیہ (असुरवाद्य) کہلاتا ہے جو پوروَرنگ (पूर्वरंग) یا تمہید کے ذیل میں آتا ہے، پھر تو دَے منگل (तोदय मगल) گائے جاتے ہیں، یہ ایک قسم کے بھجن ہوتے ہیں جن میں خدائے قدیر کی تعریف و توصیف کے بعد دعائیں کیجاتی ہیں۔ اس کے بعد ناندی (नान्दी) آکر (वन्दनाश्लोक) پڑھتا ہے۔ موجودہ زمانہ نے ناٹکوں کی پرارتھنا اسی ناندی پاٹھ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اس سے فارغ ہوکر پروچن (प्ररोचन) وغیرہ کی رسمیں ادا کیجاتی ہیں، اور حاضرین سے خاموشی کے ساتھ کھیل دیکھنے کی استدعا کے بعد کھیل شروع ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں سنسکرت ناٹکوں کی پرستاونا (प्रस्तावना) یا تقریب سے ملتی جلتی ہیں۔ کتھاکلی میں متذکرہ تقریب کے اختتام پر چھوٹے چھوٹے لڑکے آکر سنگھار رتیہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد مختصر سا جلوس آتا ہے جس میں ہیرو کا پارٹ کرنے والے کو دیوتاؤں کے بھیس میں لایا جاتا ہے۔

تلاش و تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت میں سنسکرت ناٹکوں کے پوروَرنگ (تمہید) میں بعض اہم تبدیلیاں ہوئی تھیں اور استھاپک و سوتردھار کو اسمیں داخل کرلیا گیا تھا، اس سے ہندی ناٹک کی ابتدائی کیفیت بخوبی روشنی میں آجاتی ہے۔ اور سوتردھار و استھاپک کے معانی پر غور و خوض کرنے کے بعد اس حقیقت کو باور کر لینے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ کتھاکلی کے معراج کمال تک پہنچنے سے پیشتر ہی تیلیوں کا ناچ منظر عام پر آچکا تھا۔

تیلیوں کا ناچ کتھاکلی ہی کی شاخ ہونے کے باوجود بھی اُس پر براہ راست اثر انداز ہوا، ایسا مان لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، بلاشبہ کتھاکلی ناچ کہلائے جانے کے باوجود بھی ایک طرح سے ناٹک ہی ہے یا کم از کم اس میں ناٹک کے بیج تو بکثرت موجود ہیں۔

بتاوے رگ وید کے منتروں سے لیکر والمیک اور ویاس کی تصانیف تک میں ایسے ناچوں کا مذکور ہے جن میں ابھینیے یا بتاوے کی افراط ہوتی تھی۔ شلپ آدی کرم پر تبصرہ کرتے ہوئے ادیار کلتر رقمطراز ہے کہ کبھی اس قسم کے ناچوں کی ملک کے طول و عرض میں بہتات تھی۔ کیرلا میں قدیم ایام میں ناچ کی ایک خاص قسم رائج تھی۔ جسے موہنی یتم (मोहिनीयत्तम्) کہتے تھے۔ مگر اب بہت سے دیگر ناچوں کے ساتھ ساتھ اس کا بھی نام و نشان معدوم ہو چکا ہے۔

(نوٹ۔ اس مضمون کے نقل و ترجمہ کے تمام حقوق محفوظ ہیں۔)

بیکس بیمار

(شاعرِ اعظم حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

موت کے بستر پہ اک دوشیزہ ہے لیٹی ہوئی
جس نے دیکھی ہیں ابھی چودہ بہاریں عمر کی

چہرہ گلرنگ ہے اس طرح بیماری سے فق
جھٹپٹے کے آخری لمحے کی ہو جیسے شفق

ضعف کی شدت سے ہے یوں رنگِ چشمِ سُرمگیں
سرنگوں ہو سایۂ اوہام میں جیسے یقیں

چل رہی ہے نبض یوں اُٹھتی ہے جیسے رہ رہ کے ہوک
فلسفی کے قلب میں جیسے مچلتے ہیں شکوک

کمسنی کے ولولے اس طرح ہیں مجروحِ یاس
شہدِ خالص میں کوئی جس طرح حل کر دے کھٹاس

یوں بساطِ رنگ و روغن ہے اُلٹنے کے قریب
جیسے انگاروں پہ باسی دُودھ پھٹنے کے قریب

رخ کی ضَو یوں مضمحل ہے رَو میں محسوسات کی
ہلکی پھیکی چاندنی جس طرح پچھلی رات کی

وائے محرومیٔ مآلِ حُسن اور اتنا مہیب
پھیپھڑے ماؤف ہیں اور سانس رُکنے کے قریب

پائینتی افسردہ ماں بیٹھی ہوئی ہے سرنگوں
دل ہی دل میں کہہ رہی ہے ہائے اب میں کیا کروں

لیپ۔ پینے کی دوا۔ اِک گرم کمّل۔ کچھ غذا
اتنا ساماں اور مَیں مفلس حقیر و بے نوا

صرف کچھ چاندی کے سکّے سَو نہیں دس پانچ ہی
شعلہ جب ممکن نہیں تو صرف ہلکی آنچ ہی

چند سکّے تو بڑی دولت ہے ربّ العالمیں
میرے گھر تو چند پیسوں کے سوا کچھ بھی نہیں

رحم فرما خالقِ کونین مجھ نادار پر
آج کی یہ رات بھاری ہے بہت بیمار پر

ہائے اِن نبضوں پہ میں قربان میری مہ جبیں
ڈاکٹر کی انگلیوں کی مَس سے جو واقف نہیں

لو وہ گھنٹے نے بھیانک رات کے بارہ بجائے
اتنی سردی اور اِک ہلکی سی چادر ہائے ہائے

کھائے جاتے ہیں مجھے یہ سرد لمحے رات کے
چند ٹکڑے یا الٰہی چند ٹکڑے دھات کے

کیا ہوا جاتا ہے بچی کو ارے دوڑو کوئی
ہائے تکیے سے ڈھلی جاتی ہے گردن پھول سی

لو یہ ہچکی یہ گردش آنکھ کی یہ نم جبیں
اُف اندھیرا ہائے مجھ کو سوجھتا کچھ بھی نہیں

سو گئی کیا سو گئی، کیا نیند گہری آ گئی ؟
ہائے یہ کیوں تیرے سینے میں گھٹا سی چھا گئی

دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا قیامت ہو گئی
ہائے میں تو لٹ گئی۔ برباد ہو کر رہ گئی
گر پڑے سر پر مرے کاش آسماں ہی ٹوٹ کر
میں وہی ماں ہوں تری للٰلہ کچھ تو منہ سے بول
لاش کا چہرہ خدا معلوم کیا کہنے لگا

کل تری منگنی کا دن تھا آج رخصت ہو گئی
زندگی بھر کے لئے ناشاد ہو کر رہ گئی
ہائے کس جی سے میں دیکھونگی ترے گڑیوں کے گھر
اے زبیدہ، اے زبیدہ، اے زبیدہ آنکھ کھول
گر پڑی چکرا کے ماں سر سے لہو بہنے لگا

(۲)

پھوٹی اتنے میں کانپی لاش پر پہلی کرن
کھول دی کلیوں نے آنکھیں مرغ کی آواز سے
سُن رہے تھے تین دن سے جو مریضہ کی فغاں
سخت حیرت ہے کہ مرجاتے نہیں کیوں ڈوب کر
اے امیرو منہ دکھانے کے بھی تم قابل نہیں
یہ تمھاری فربہی ملتی ہوئی ہے ورم سے
تم کو کیا جیتا ہے کوئی یا تڑپ کر مر گیا
جب نہیں مائل ہو خود اپنوں کی بھی امداد پر
شرم سے گڑ جاؤ سینوں میں دلِ بے حس لئے
آدمی کب آدمی کی شکل کے تودے ہو تم

لاش تھی یا سو رہی تھی سیج پر کوئی دلھن
چونک اُٹھے زردار ہمسائے بھی خواب ناز سے
خلق کی آہیں امیروں کے لئے ہیں لوریاں
یہ بٹاری کے سڑے انگور، اہل مال و زر
تھیلیوں میں زر تو ہے سینوں میں لیکن دل نہیں
آدمیت ہے اگر تو سر جھکا لو شرم سے
دل میں خود سوچو تم آخر کس مرض کی ہو دوا
پھر اکڑ کر سچ کہو چلتے ہو کس بنیاد پر
لاش کے آگے کی صورت اینٹھتے ہو کس لئے
پشت پر مخلوق کی سرطان کے پھوڑے ہو تم

(۳)

اور ہاں اے ماورائے فہم ہستی اے خدا
کون اتنا کور ہے انکار کر سکتا ہے کون
تجھکو پانا بھی ہے حیرت خیز کھونا بھی عجیب
بے زروں کے غم سے کیا ہوتا نہیں تجھکو قلق
پوچھتا ہوں میں کہ اے آقا بایں شان علو
اُڑ رہا ہے بے خطا کتنے ہی انسانوں کا رنگ
کتنی ہی روحوں پہ دروازے جہنم کے ہیں باز
راس کیا آتے نہیں ہیں تجھکو آئین کرم؟

مجھ میں ہے انکار کی قوت نہ دم اقرار کا
کس کے منہ میں دانت ہیں انکار کر سکتا ہے کون
تیرا ہونا بھی تعجب ہے نہ ہونا بھی عجیب
تیرے زرداروں ہی کو ہے کیا فقط جینے کا حق
کھیلتا ہے کیا غریب انسان کی آہوں سے تو
کھا چکا ہے کیا ترے انصاف کے کانٹے کو زنگ
اس قدر رحمت کے دعوے اور اتنا بے نیاز
سچ بتا معبود چنگیز و ہلاکو کی قسم

اُردو ہندی ہندوستانی

(از منشی پریم چند بی۔ اے)

یہ سبھی مانتے ہیں کہ قومی استحکام کے لئے معاشرتی اتحاد لازمی ہے، اور کسی قوم کی زبان اور رسم الخط اس معاشرتی اتحاد کا ایک خاص جزو ہے۔ محترمہ خالدہ ادیب خانم نے اپنی ایک تقریر میں ترکی قوم کے اتحاد کو ترکی زبان سے منسوب کیا ہے۔ اور یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ قومی زبان کے بغیر کسی قوم کا وجود ہی ذہن میں نہیں آتا۔ جب تک ہندوستان کی کوئی قومی زبان نہیں ہے۔ وہ قومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ممکن ہو کہ زمانۂ قدیم میں ہندوستان ایک قوم رہا ہو، لیکن بودھوں کے زوال کے بعد اُس کی قومیت بھی فنا ہو گئی، اور حالانکہ معاشرتی یکرنگی موجود تھی لیکن اختلاف زبان نے اس تفریق کے عمل کو اور بھی آسان کر دیا۔ اسلامی دَور میں بھی جو کچھ ہوا وہ مختلف صوبوں کا سیاسی اجتماع تھا قومیت کا وجود نہ تھا۔ اور حق تو یہ ہے کہ قوم کا خیال مقابلۃً زمانۂ حال کی ایجاد ہے، جس کی عمر غالباً دو سَو سال سے زیادہ نہیں۔ ہندوستان میں قوم کی ابتدا انگریزی تسلط کے ساتھ شروع ہوئی۔ اور اُسی کے استحکام کے ساتھ اس کی ارتقا ہو رہی ہے۔ لیکن اس وقت تک بجز سیاسی محکومیت کے ملک کے مختلف عناصر میں کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے جو انھیں منظم کر کے ایک قوم بنا دے۔ اگر آج انگریزی حکومت اُٹھ جائے تو بہت ممکن ہے کہ ان عناصر میں جو اتحاد نظر آ رہا ہے وہ افتراق کی صورت اختیار کرے۔ اور مختلف زبانوں کی بنا پر ایک نیا دستوری نظام پیدا ہو جائے جس کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو، اور پھر وہی کشمکش شروع ہو جائے جو انگریزوں کے آنے سے پہلے تھی۔ اس لئے قوم کی بقا کے لئے لازمی ہے کہ ملک میں معاشرتی اتحاد ہو اور چونکہ زبان اس اتحاد کا ایک خاص رُکن ہے۔ ضروری ہے کہ ہندوستان کی ایک قومی زبان ہو جو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جائے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ دنوں میں قومی ادب کی تدوین بھی شروع ہو جائے گی اور ایک زمانہ وہ آئیگا جب اقوام کی ادبی مجلس میں ہندستانی زبان مساویانہ حیثیت سے شریک ہونے کے قابل ہو جائیگی لیکن اس قومی زبان کی صورت کیا ہو۔ صوبجات کی مروجہ زبانوں میں تو قومی زبان بننے

کی صلاحیت نہیں کیونکہ ان کا دائرۂ عمل محدود ہے۔ ایک ہی زبان ہے جو ملک کے بڑے حصے میں بولی اور اس سے بڑے حصے میں سمجھی جاتی ہے، اور اُسی کو قومی زبان کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ مگر اس وقت اس کی تین صورتیں ہیں۔ اردو، ہندی اور ہندوستانی۔ اور ابھی تک یہ قومی طور پر طے نہیں کیا جا سکا کہ ان میں کونسی صورت ملک میں زیادہ مقبول اور زیادہ آسانی سے مروج ہو سکتی ہے۔ تینوں ہی صورتوں کے موید موجود ہیں اور ان میں کھینچا تانی ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اس اختلاف کو سیاسی رنگ دیدیا گیا ہے اور ہم اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل اور دماغ سے غور کرنے کے ناقابل ہو گئے ہیں۔

لیکن ان رکاوٹوں کے باوجود اگر ہم ہندوستانی قومیت کی منزل کو ناقابل حصول سمجھکر ہمت نہار بیٹھیں ہمیں اس مسئلہ کو کسی نہ کسی طرح حل کرنا ہے۔

ملک میں ایسے آدمیوں کی تعداد کم نہیں ہے جو اردو اور ہندی کی انفرادی نشو و نما میں حارج نہیں ہونا چاہتے، اُنھوں نے یہ مان لیا ہے کہ ابتدا میں ان دونوں صورتوں میں جو کچھ یکسانیت رہی ہو لیکن اس وقت دونوں دونوں جس راستے پر جا رہی ہیں اُس میں اتصال ہونا غیر ممکن ہے۔ ہر ایک زبان میں ایک فطری رجحان ہوتا ہے۔ اردو کو فارسی اور عربی سے فطری مناسبت ہے۔ ہندی کو سنسکرت اور پراکرت سے۔ اس رجحان کو ہم کسی طاقت سے بھی روک نہیں سکتے، پھر ان دونوں کو باہم ملانے کی کوشش میں کیوں ان دونوں کو نقصان پہونچائیں۔

اگر اردو اور ہندی دونوں اپنے کو اپنے مولد و مسکن تک ہی محدود رکھیں تو ہمیں ان کی فطری نشو و نما سے کوئی اعتراض نہ ہو۔ بنگالی، مرہٹی، گجراتی، تامل، تلنگی، کنٹری۔ ان صوبجاتی زبانوں کے متعلق ہمیں کوئی پریشانی نہیں۔ انھیں اختیار ہے اپنے اندر جا ہے جتنی سنسکرت، عربی، یا لاطینی بھر لیں۔ ان کے اہل قلم خود اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اردو اور ہندی کی نوعیت جدا ہے۔ یہاں تو دونوں ہی ہندوستان کی قومی زبان کہلانے کی مدعی ہیں۔ مگر چونکہ اپنی انفرادی صورت میں وہ قومی ضرورتوں کی تکمیل نہ کر سکیں اس لئے اضطراری طور پر خود بخود اُنکے اتصال کا عمل شروع ہو گیا اور وہ متحدہ صورت پیدا ہو گئی جسے ہم ہندوستانی زبان کہنے میں حق بجانب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان نہ تو وہ اُردو ہو سکتی ہے جو عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ سے گرانبار ہے، اور نہ وہ ہندی جو سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے لدی ہوئی ہے۔ اگر آج

دونوں مسلکوں کے وکیل آمنے سامنے کھڑے ہوکر اپنی اپنی تحریری زبان میں باتیں کریں تو شاید ایک دوسرے کا مفہوم مطلق نہ سمجھیں۔ہماری قومی زبان تو وہی ہو سکتی ہے جس کی بنیاد عمومیت پر قائم ہو۔وہ اس کی پروا کیوں کرنے لگی کہ فلاں لفظ سے اس لئے احتراز کیا جائے کہ وہ فارسی ہے، یا عربی یا سنسکرت۔ وہ تو صرف یہ معیار اپنے سامنے رکھتی ہے کہ اس لفظ کو عوام سمجھ سکتے ہیں یا نہیں۔اور عوام میں ہندو مسلمان، پنجابی، بنگالی۔مرہٹی، گجراتی سبھی شامل ہیں۔اگر کوئی لفظ یا محاورہ یا اصطلاح مروّج عام ہے تو وہ اس کے مخرج اور مولد کی پروا نہیں کرتی۔یہی ہندوستانی ہے، اور جس طرح انگریزوں کی زبان انگریزی، جاپان کی جاپانی، ایران کی ایرانی، چین کی چینی ہے اُسی طرح ہندوستان کی قومی زبان کو اُسی وزن پر ہندوستانی کہنا مناسب ہی نہیں بلکہ لازمی ہے اگر اس ملک کو ہندوستان نہ کہکر صرف ہند کہیں تو اس کی زبان کو ہندی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کی زبان کو اُردو تو کسی اعتبار سے بھی نہیں کہا جاسکتا۔تا وقتیکہ ہم ہندوستان کو اُردستان نہ کہنے لگیں۔جواَب ممکنات سے خارج ہے۔قدما یہاں کی زبان کو ہندی ہی کہتے تھے، اور خسرو نے خالق باری تصنیف کرکے ہندوستانی کی بنیاد ڈالی، اُن کا منشا اس تصنیف سے غالبًا یہی ہوگا کہ عام ضرورت کے الفاظ دونوں صورتوں میں عوام کو سکھلا دیے جائیں تاکہ انھیں اپنے روزمرہ کے تعلقات میں سہولت ہو جائے۔"اُردو" کی تخلیق کب اور کہاں ہوئی ہے اس کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا۔بہرحال ہندوستان کی قومی زبان نہ اُردو ہے اور نہ ہندی، بلکہ ہندوستانی ہے جو سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے اور بڑے حصے میں بولی جاتی ہے لیکن لکھی کہیں نہیں جاتی، اور اگر کوئی لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اُردو اور ہندی کے ادیب اُسے ٹاٹ باہر کردیتے ہیں۔دراصل اُردو اور ہندی کی ترقی میں جو چیز سدّراہ ہے وہ اُن کی خواص پسندی ہے۔ہم اُردو لکھیں یا ہندی، عوام کے لئے نہیں لکھتے، بلکہ ایک محدود طبقہ کے لئے لکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہماری ادبی تصانیف کو حسن قبول نہیں حاصل ہوتا۔یہ بالکل درست ہے کہ کسی ملک میں بھی تحریری اور تقریری زبانیں ایک نہیں ہوتیں۔جو انگریزی ہم کتابوں اور اخباروں میں پڑھتے ہیں وہ کہیں بھی نہیں بولی جاتی۔پڑھے لکھے لوگ بھی تحریری زبان میں گفتگو نہیں کرتے اور عوام کی زبان تو بالکل الگ ہوتی ہے۔لیکن انگلینڈ کے ہر ایک پڑھے لکھے آدمی سے یہ توقع ضرور کیجاتی ہے کہ وہ تحریری زبان سمجھے اور موقع پڑنے پر اس کا استعمال بھی کرسکے۔یہی ہم ہندوستان میں بھی چاہتے ہیں۔

مگر آج کیا کیفیت ہے؟ ہمارا ہندی اسکول تُلا ہوا ہے کہ وہ غیر ہندی الفاظ کو ہندی میں

کسی طرح داخل نہ ہونے دیگا، اُسے "ماتا" سے محبت ہے مگر "آدمی" سے قطعی نفرت۔ "درخواست" مروج عام ہونے کے باوجود اُس کے یہاں ممنوع ہے۔ اس کے بجائے وہ "پرارتھنا پتر" کا قائل ہے حالانکہ عوام اس کا مفہوم بالکل نہیں سمجھتے۔ "استعفا" کو وہ کسی طرح نہیں قبول کر سکتا۔ اس کے بجائے وہ "تیاگ پتر" چاہتا ہے۔ "ہوائی جہاز" کتنا ہی عام فہم ہو لیکن اُسے "وایویان" کی سیرھی پسند ہے۔ اُردو اسکول اس سے بھی زیادہ چھوت چھات کا دلدادہ ہے۔ وہ "خدا" کا تو معتقد ہے مگر "ایشور" سے منکر۔ "قصور" تو وہ کتنے ہی کرتا ہے مگر "اپرادھ" کبھی نہیں کر سکتا۔ "خدمت" تو اُسے بہت پسند ہے مگر "سیوا" ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس طرح ہم نے اُردو اور ہندی کے دو الگ الگ کیمپ بنا لئے ہیں اور مجال نہیں کہ ایک کا کوئی فرد دوسرے کے حدود میں داخل ہو سکے۔ اس اعتبار سے اُردو مقابلۃً ہندی سے کہیں زیادہ تنگ گیر واقع ہوئی ہے۔ ہندوستانی اس چار دیواری کو توڑ کر دونوں میں ربط ضبط پیدا کرنا چاہتی ہے، تاکہ دونوں ایک دوسرے کے گھر بے تکلف آجا سکیں محض مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ گھر کے آدمی کی طرح۔ گارسن ڈی تاسی کے الفاظ میں اُردو اور ہندی کے درمیان کوئی ایسی حد فاصل نہیں کھینچی جا سکتی جہاں ایک کو مخصوص طور پر ہندی اور دوسرے کو اُردو کہا جا سکے۔ انگریزی زبان کے مختلف رنگ ہیں۔ کہیں لاطینی اور یونانی الفاظ کی کثرت ہوتی ہے کہیں اینگلو سیکسن الفاظ کی، مگر ہیں دونوں انگریزی۔ اسی طرح اُردو یا ہندی الفاظ کے اختلاف کے باعث دو مختلف زبانیں نہیں ہو سکتیں۔ جو لوگ ہندوستانی قومیت کا خواب دیکھتے ہیں، جو اس میں معاشرتی اتحاد کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں، اُن سے ہماری التجا ہے کہ وہ ہندوستانی کی دعوت قبول کریں، جو کوئی نئی زبان نہیں ہے بلکہ اُردو اور ہندی کی قومی صورت ہے۔

صوبۂ متحدہ کے اپر پرائمری اسکولوں میں درجہ چہارم تک مشترکہ زبان یعنی ہندوستانی کی ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں، صرف رسم الخط جُدا ہوتا ہے، زبان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ صیغۂ تعلیم کا منشا یہ ہوگا کہ اس طرح طلباء میں بچپن سے ہندوستانی کی بنیاد پڑ جائیگی اور وہ عام ہندی اُردو الفاظ سے مانوس ہو جائیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ایک ہی مدرس تعلیم دے سکتا تھا، اس وقت بھی یہی نصاب نافذ ہے، لیکن ہندی اور اُردو کے حامیوں کی جانب سے شکایتیں شروع ہو گئی ہیں مشترکہ زبان کی تعلیم سے طلباء کی ادبی استعداد کچھ نہیں ہونے پاتی اور وہ اپر پرائمری کے بعد بھی معمولی کتابیں تک نہیں سمجھتے چنانچہ اس شکایت کو رفع کرنے کے لئے ان عام ریڈروں کے

علاوہ ابر پرائمری ورجوں کے لئے ایک ادبی ریڈر بھی مقرر ہوئی۔ ہمارے رسالے اور اخبارات اور کتابیں خالص اُردو یا خالص ہندی میں شائع ہوتے ہیں۔ اس لئے جبتک اُردو لڑکوں کے پاس فارسی اور عربی الفاظ کا اور ہندی لڑکوں کے پاس سنسکرت الفاظ کا کافی ذخیرہ نہ موجود ہو وہ کوئی اُردو یا ہندی کی کتاب نہیں سمجھ سکتے۔ اس طرح بچپن ہی سے ہمارے یہاں اُردو ہندی کی تفریق شروع ہوجاتی ہے۔ کیا اس تفریق کو مٹانے کی کوئی ترکیب نہیں ہے؟

جو لوگ تفریق کے حامی ہیں اُن کے پاس اپنے، اپنے دعوے کی دلیلیں موجود ہیں۔ مثلاً خاص ہندی کے وکیل کہتے ہیں کہ سنسکرت کی طرف جھکنے سے ہندی زبان ہندوستان کی دوسری صوباتی زبانوں کے قریب ہوجاتی ہے۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اُسے نئے بنائے الفاظ مل جاتے ہیں، تحریر میں ادبیت آجاتی ہے وغیرہ۔ علیٰ ہذا اُردو کے علمبردار کہتے ہیں کہ فارسی عربی کی طرف جھکنے سے ایشیا کی دوسری زبانیں مثلاً فارسی، عربی اُردو کے قریب آجاتی ہیں۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اُسے عربی کا علمی خزانہ معلوم ہوجاتا ہے جس سے زیادہ علمی زبان دوسری نہیں اور طرز انشا میں متانت اور شکوہ پیدا ہوجاتا ہے وغیرہ۔ اس لئے کیوں نہ ان دونوں کو اپنے ڈھنگ پر چلنے دیا جائے اور انھیں باہم ملاکر کیوں دونوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں۔ اگر سبھی اس استدلال سے متفق ہوجائیں تو اس کے معنی یہی ہونگے کہ ہندوستان میں کبھی قومی زبان کا ارتقا نہ ہوگا۔ اس لئے ہمیں لازم ہے کہ حتی الامکان اس ذہنیت کو دُور کرکے ایسی فضا پیدا کریں جس سے ہم روز بروز قومی زبان کے قریب پہونچتے جائیں، اور ممکن ہے دس بیس سال کے بعد ہمارا خواب حقیقت میں تبدیل ہوجائے۔

ہندوستان کے ہر ایک صوبہ میں مسلمانوں کی کم وبیش تعداد موجود ہے۔ صوبۂ متحدہ کے علاوہ اور بھی شہروں میں، مسلمانوں نے ہر ایک صوبہ کی زبان اختیار کرلی ہے۔ بنگال کا مسلمان بنگلہ بولتا ہے اور لکھتا ہے، گجرات کا گجراتی، میسور کا کناری، مدراس کا تامل، پنجاب کا پنجابی وغیرہ۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے صوبہ کا رسم الخط بھی اختیار کرلیا ہے۔ اُردو خط اور زبان سے اُسے ملی عقیدت ہوسکتی ہے لیکن روزمرہ کی زندگی میں اُسے اُردو کی ضرورت بالکل نہیں پڑتی۔ اگر دیگر صوبجات کے مسلمان اُن صوبوں کی زبانیں بے تکلف سیکھ سکتے ہیں اور اُسے یہاں تک اپنی بنا سکتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں مطلق امتیاز نہیں رہتا تو صوبۂ متحدہ اور پنجاب کے مسلمان کیوں ہندی سے اس قدر متنفر ہیں؟ ہمارے صوبے کے دیہاتوں میں رہنے والے مسلمان بالعموم دیہاتیوں کی زبان ہی بولتے ہیں۔ بہت سے مسلمان جو دیہاتوں سے آکر شہروں میں آباد ہوگئے ہیں وہ بھی گھروں میں دیہاتی زبان ہی استعمال کرتے ہیں۔ بول چال

کی ہندی سمجھنے میں نہ عام مسلمانوں کو کوئی دقت ہوتی ہے نہ بول چال کی اُردو سمجھنے میں عام ہندو کو۔ بول چال کی ہندی اور اُردو قریب قریب ایکساں ہیں۔ ہندی کے اُن الفاظ کی تعداد جو عام کتابوں اور اخباروں میں مروج ہیں اور کبھی کبھی پنڈتوں کی تقریروں میں بھی آجاتے ہیں دو ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ علیٰ ہذا فارسی کے عام الفاظ بھی اس سے زیادہ نہ ہونگے۔ کیا اُردو کے موجودہ لغات میں دو ہزار ہندی الفاظ کا اضافہ۔ اور ہندی کے لغات میں دو ہزار اُردو الفاظ کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس طرح ہم ایک مشترکہ لغت کی تدوین نہیں کر سکتے؟ کیا ہمارے حافظہ پر یہ بار ناقابل برداشت ہوگا؟ ہم انگریزی کے بیشمار الفاظ یاد کر سکتے ہیں، محض ایک عارضی غرض کی تکمیل کے لئے، کیا ہم ایک دیرپا مقصد کے لئے تھوڑے سے الفاظ بھی نہیں یاد کر سکتے؟ اُردو اور ہندی زبانوں میں ابھی نہ وسعت ہے نہ پختگی، اُن کے الفاظ کی تعداد محدود ہے۔ اکثر معمولی مطالب ادا کرنے کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے، اِس اضافہ سے یہ شکایت دُور ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کی سبھی زبانیں بلاواسطہ یا بالواسطہ سنسکرت سے نکلی ہیں (گجراتی۔ مرہٹی۔ بنگالی میں تو رسم الخط بھی ہندی سے ملتا جلتا ہے) دکھن کی زبانوں میں بھی، رسم الخط کے بالکل جُدا ہوتے ہوئے، سنسکرت الفاظ کی آمیزش بہت زیادہ ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ سبھی صوبجاتی زبانوں میں کچھ نہ کچھ ملتے ہیں لیکن اتنی کثرت سے نہیں جتنے کہ ہندی میں۔ اس لئے یہ بالکل درست ہے کہ ایسی ہندی جس میں سنسکرت الفاظ زیادہ ہوں ہندوستان میں آسانی سے مقبول ہو سکتی ہے۔ دیگر صوبوں کے مسلمان بھی اس قسم کی ہندی کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ فارسی اور عربی سے گرانبار اُردو کے لئے صوبہ متحدہ اور پنجاب کے شہروں اور قصبوں اور حیدرآباد کے بڑے شہروں کے سوا اور کوئی دائرہ نہیں۔ مسلمان تعداد میں ضرور آٹھ کروڑ ہیں لیکن اُردو بولنے والے مسلمان اس کے ایک چوتھائی سے زیادہ نہ ہونگے، تو کیا اعلیٰ قومیت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اُردو میں کچھ ضروری ترمیم اور اضافہ کرکے اُسے ہندی سے متصل کرلیں۔ اور ہندی میں اسی طرح کے اضافے کرکے اُسے اُردو سے ملا دیں۔ اور اس مشترکہ زبان کو مستحکم کردیں جو سارے ہندوستان میں سمجھی اور بولی جائے، اور ہمارے مصنفین جو کچھ لکھیں وہ ایک مخصوص طبقہ کے لئے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے لئے ہو۔ سندھی زبان اس قسم کی آمیزش کی بہت اچھی مثال ہے۔ سندھی رسم الخط ہی عربی ہے حالانکہ اس میں ہندی کے سبھی اصوات شامل کر لئے گئے ہیں اور الفاظ میں بھی سنسکرت، عربی اور فارسی کچھ اس طرح غلط ملط ہو گئے ہیں کہ کہیں بھونڈا پن یا ثقالت کا احساس نہیں ہوتا۔ ہندوستانی کے لئے بھی کچھ اسی طرح

کی آمیزش کی ضرورت ہے۔

تفریق کے حامیوں کی یہ دلیل بڑی حد تک صحیح ہے کہ مشترکہ زبان میں قصے کہانیاں اور ڈرامے تو لکھے جا سکتے ہیں، لیکن علمی مضامین اس زبان میں نہیں ادا کئے جا سکتے۔ وہاں تو مجبوراً مفرس اور معرب اُردو اور سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال ضروری ہو جائیگا۔ علمی مضامین کے ادا کرنے میں سب سے بڑی ضرورت موزوں اصطلاحات کی ہوتی ہے، اور اصطلاحات کے لئے ہمیں مجبوراً عربی اور سنسکرت کے لامحدود ذخائر کے سامنے دست سوال پھیلانا پڑیگا۔ اس وقت ہر ایک صوبجاتی زبان علٰحدہ علٰحدہ اپنی اپنی اصطلاحیں مرتب کر رہی ہے۔ اُردو میں بھی علمی اصطلاحات بنائی گئی ہیں اور ابھی یہ عمل جاری ہے۔ کیا یہ کہیں بہتر نہ ہوگا کہ مختلف صوبجاتی انجمنیں مجموعی مشورے اور امداد سے اس اہم کام کو سرانجام دیں اس سے فرداً فرداً جو کاوش اور دماغ ریزی اور صرف کرنا پڑ رہا ہے اُس میں بہت کچھ بچت ہو سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں تو بجائے اس کے کہ نئے سرے سے اصطلاحات بنائے جائیں یہ کہیں بہتر ہے کہ انگریزی کی مروجّہ اصطلاحیں ضروری ترمیم کے ساتھ لے لی جائیں۔ یہ اصطلاحیں محض انگریزی میں مروج نہیں ہیں، بلکہ قریب قریب سبھی ترقی یافتہ زبانوں میں اُن سے ملتی جلتی اصطلاحیں پائی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں جاپانیوں نے یہی طرز عمل اختیار کیا ہے اور مصر میں بھی خفیف ترمیموں کے ساتھ انھیں لے لیا گیا ہے۔ اگر بٹن اور لالٹین اور بائسکل اور دیگر صدہا غیر ملکی الفاظ ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں تو اصطلاحوں کو لینے میں کون سا امر مانع ہو سکتا ہے۔ اگر ہر ایک صوبہ نے اپنی اپنی اصطلاحیں علٰحدہ بنائیں تو ہندوستان کی کوئی قومی علمی زبان نہ بن سکے گی۔ بنگلہ۔ مرہٹی، گجراتی، کناری وغیرہ زبانیں سنسکرت کی مدد سے اس مشکل کو حل کر سکتی ہیں، اُردو بھی عربی اور فارسی کی مدد سے اپنی اصطلاحی ضرورتیں پوری کر سکتی ہے لیکن ایسے الفاظ ہمارے لئے مروّجہ انگریزی اصطلاحوں سے بھی زیادہ غیر مانوس ہونگے۔ آئین اکبری نے ہندو فلسفہ اور موسیقی اور عروض کے لئے سنسکرت کی مروّجہ اصطلاحوں کو اختیار کر کے اس کی مثال قائم کر دی ہے۔ اسلامی فلسفہ اور دینیات اور عروض میں ہم موجودہ عربی اصطلاحوں کو اختیار کر سکتے ہیں۔ جو علوم مغرب سے اپنی اپنی اصطلاحیں لے کر آئے ہیں اُنھیں بھی ہم قبول کر لیں تو ہماری تاریخی روایات سے بعید نہ ہوگا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ مخلوط ہندوستانی اتنی فصیح اور لطیف نہ ہوگی، لیکن لطافت اور فصاحت کا معیار ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اچکن پر انگریزی ٹوپی کئی سال پہلے بے جوڑ اور مضحکہ انگیز معلوم ہوتی تھی، لیکن اب وہ معمولی نظارہ ہے۔ عورتوں کے لمبے گیسو حُسن کے ایک خاص رکن ہیں، لیکن اب

تراشے ہوئے بال مقبول ہو رہے ہیں۔ پھر کسی زبان کی صفت محض اُس کی فصاحت نہیں ہے بلکہ مطالب ادا کرنے کی قابلیت ہے۔ لطافت اور فصاحت کی قربانی کرکے بھی اگر ہم اپنی قومی زبان کا دائرہ وسیع کر سکیں تو ہمیں اس میں تامّل نہ ہونا چاہیئے۔ جب سیاسی دنیا میں فیڈریشن کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے تو کیوں نہ ہم ادبی دنیا میں ایک فیڈریشن قائم کریں جس میں ہر ایک پراونشل زبان کے نمائندے سال میں ایک بار ایک ہفتہ کے لئے کسی مرکزی مقام پر جمع ہو کر قومی زبان کے مسئلہ پر تبادلۂ خیالات کریں اور تجربہ کی روشنی میں سامنے آنے والی مشکلات کو حل کر سکیں جب ہماری زندگی کے ہر ایک شعبہ میں تبدیلیاں ہوتی جا رہی ہیں، اور اکثر ہماری مرضی کے خلاف، تو زبان کے معاملے میں ہم کیوں ایک سو سال قبل کے خیالات اور نظریات پر قائم رہیں۔ اب موقع ہے کہ ایک آل انڈیا ہندوستانی زبان اور ادب کی انجمن قائم کی جائے جس کا کام ہندوستانی زبان کا وہ ارتقا ہو جس سے وہ ہر ایک صوبہ میں مقبول ہو سکے اس انجمن کے فرائض اور مقاصد کیا ہونگے، اس پر یہاں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اس انجمن کا کام ہوگا کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے اپنا پروگرام مرتب کرے۔ ہماری تو یہی گذارش ہے کہ اب اس کام میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔

عالمگیر لاہور سالنامہ ۱۹۳۵ء

عالمگیر لاہور کا مشہور ادبی رسالہ ہے جو دس برس سے حافظ محمد عالم صاحب کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ اس کا سالنامہ دو سو صفحات پر شائع ہوا ہے۔ رسالہ کا ٹائیٹل رنگین چھپا ہے اندر بھی کئی رنگین و سادہ تصویریں ہیں۔ رنگین تصویروں میں ٹیپو سلطان کی تصویر بہت نفیس ہے مضامین کے لحاظ سے عالمگیر کا پایہ بلند رہتا ہے۔ مضامین نثر میں تحقیقی اور تاریخی مضامین کی تعداد زیادہ ہے۔ تاریخی مضامین میں مولانا اظہر امرتسری کا "باطنیہ" مولانا عبدالقدوس ہاشمی مرحوم کا "تاریخ شطرنج" خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کا "نواب مہابت خاں"۔ تحقیقی مضامین میں مولانا حامد حسن صاحب قادری کا مضمون "ارتقائے اردو" ماہر القادری صاحب کا "سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب" سید وقار عظیم کا "دکن کی غزلیں"۔ مولوی محمد طاہر صاحب فاروقی کا "اردو غزل پر ایک نظر" بلند پایہ مضامین ہیں۔ خشک ادبی مضامین کے پہلو بہ پہلو ادب لطیف، فسانوں اور مزاحیہ قصوں کا بھی اہتمام رکھا گیا ہے۔ مزاحیہ فسانوں میں اسلم صاحب کا "پہلا شکار"۔ جناب "کوئی" کا "خالہ صاحبہ" مشفقہ اور ناکارہ حیدرآبادی کا "جھٹکے والا" بہت دلچسپ ہیں۔ قیمت سوا روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ دفتر عالمگیر لاہور

سرِّ اجل

(از حضرت جگر بریلوی بی-اے)

یہ کہتے آئے ہیں اکثر حکیم و دانشمند — بشر کو ہونا ہے اِک روز خاک کا پیوند
گدا ہو، شاہ ہو، کوئی ہو، سب کو مرنا ہے — سرائے عالمِ فانی سے کوچ کرنا ہے
نہ کام آئی ہے ثروت نہ علم اور ادراک — مآل خاک کے پُتلے کا آخرش ہے خاک
دو روزہ زیست کو بے صرفہ پھر گنوانا کیا — فروغِ ہستیِ بے سود کا دکھانا کیا
عبث ہیں سارے یہ سامان عیش و راحت کے — عبث ہیں جتنے ہیں یہ اہتمام عظمت کے
حصار و قصر سے اورنگ و تاج سے حاصل — نمود و نام ہے اہرام و تاج[1] سے حاصل
فضول عقل و نظر کو ہے زحمتِ پرواز — پناہ موت سے دیتا نہیں ہوائی جہاز
اگر یہ سچ ہے تو انساں ہے ایک عبث فضول — مآلِ کار ہے جس کی حیات کا نہ حصول

یہ جانتا ہے مگر راز دانِ حقیقت کا — عجیب رمز ہے آئینِ مرگ فطرت کا
نمودِ ہستیِ مطلق ہے آدمی کی حیات — ہر اک تغیرِ قالب کا نام مرگ و ممات
بشر کی زیست اِک اندازِ خود پرستی ہے — اجل کہا ہے جسے وہ خمارِ مستی ہے
جب انتہا سے گزرتا ہے بارِ علم و شعور — دل و دماغ میں ہوتا ہے آشکار فتور
حواس مختل و اعضا ضعیف ہوتے ہیں — جب آدمی کے قویٰ اپنا فعل کھوتے ہیں
جو زندگی تھی عزیز اب وبال ہوتی ہے — نفس کی آمد و شد بھی محال ہوتی ہے
جو سانس آتی ہے چبھتی ہے پھانس سینے میں — اذیتیں ہیں جہنم کی ایسے جینے میں
اجل کا آٹھ پہر انتظار رہتا ہے — نکلنے کے لئے دم بے قرار رہتا ہے
پیامِ مرگ نویدِ حیات لاتا ہے — عذابِ کشمکش روح سے چھڑاتا ہے
مریضِ زیست کو راحت کی نیند آتی ہے — اجل فراغ کے آغوش میں سلاتی ہے
بگڑ کے خاک میں ملتا ہے قالبِ فانی — نیا لباس بدلتی ہے روحِ انسانی

[1] تاج محل آگرہ

نئی حیات، نئی قوتیں، نئے ارماں
دل و دماغ نئے زلیست کے نئے ساماں
شعورِ رفتہ کا روشن چراغ ہوتا ہے
شرابِ کہنہ سے تازہ دماغ ہوتا ہے
کمال و علم و ہنر پھر فروغ پاتے ہیں
جمالِ ہستیِ مستور کا دکھاتے ہیں
ازل سے تا بہ ابد سلسلہ یہ جاری ہے
اسی سے گرمیِ بازار و بزم ساری ہے

خدا نہ کردہ جو ہو مرگ کو قیام و دوام
تمام درہم و برہم ہو زندگی کا نظام
کبھی خلش نہ خیالِ اجل کی دل سے جائے
دماغ کارِ زمین و زماں میں کون لگائے
تمام عمر گذر جائے اپنے ماتم میں
بشر کی جان نکل جائے زلیست کے غم میں

اجل کی رہتی ہے ہر روز گرم بازاری
عدم کی راہ میں رہتے ہیں قافلے جاری
جو ذکرِ مرگ کو دیکھو تو بس ہے تا شمشان
حیات ہی کے شب و روز ورنہ ہیں سامان
کبھی بشر کو خیالِ فنا نہیں ہوتا
اگر ہوا بھی کبھی دیرپا نہیں ہوتا
یہ اک کرشمۂ حسنِ ثباتِ ہستی ہے
اسی سے سلسلۂ کائناتِ ہستی ہے

جو ہم سے پوچھو تو موت اک عجیب نعمت ہے
فقط اجل سے حیاتِ بشر کی عظمت ہے
اجل مٹاتی ہے تفریق درمیانِ بشر
گدا ہو شاہ ہو ملتا ہے خاک کا بستر
اجل سے جبن و بسالت کی آزمایش ہے
اجل سے جوہرِ مردانگی کی تابش ہے
اجل نہ ہو تو کبھی غم کی انتہا ہی نہ ہو
ستم رسیدوں کو مرنے کا آسرا ہی نہ ہو
بندھی ہے مرگ سے برگشتہ اختروں کی امید
اسی امید میں پنہاں ہے زلیست کی تائید
اجل نہ ہو تو محبت کا امتحان نہ ہو
اجل نہ ہو تو وفا پر نثار جان نہ ہو
اجل نہ ہو تو رہِ حق میں جان کیونکر دیں
صلیب و دار و رسن کیونکر امتحان کریں
اجل نہ ہو تو شہیدوں کا نام ہو کیونکر
اجل نہ ہو تو بقائے دوام ہو کیونکر

امیر خسرو کا پہیلی نامہ

(از سید محمد مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی، بی۔اے۔)

حال میں مجھے امیر محل لائبریری کے مخطوطات میں حیرتی کا ایک نسخہ پہیلی نامہ دیکھنے کو ملگیا جو حددرجہ بوسیدہ و کرم خوردہ ہے۔ حجم میں تقریبًا ایک جزو کا رسالہ ہے۔ شروع میں کچھ نثر کی عبارت ہے جو پڑھی نہیں جاتی لیکن خسرو کی کچھ پہیلیاں اور کچھ رباعیات بھی اِس قابل نظر آئیں کہ میں ان کو نقل کرسکوں، چنانچہ میں نے جناب ذکی احمد صاحب علوی لائبریرین امیر محل لائبریری نصیر باغ کی اجازت سے اُن پہیلیوں اور بعض رباعیوں کو نقل کرلیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ حیرتی نے اس پہیلی نامہ کو دارا شکوہ کے عہد میں مرتب کیا تھا اور اس کا ایک نسخہ شہزادہ کو بھی نذر گزرانا تھا لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حیرتی کا یہ نسخہ کہاں سے آیا ہے۔ انداز سے پتہ چلتا ہے کہ یہ متعدد کتب خانوں کی زینت رہ چکا ہے۔ یہ سوال کہ حیرتی کون ہے بالکل حل نہیں ہوسکا۔ مکرمی آسی صاحب (مولنا عبدالباری) کا خیال ہے کہ کوئی ایرانی ہوگا جو تلاش معاش ہندوستان آیا ہوگا۔ بہرحال کچھ بھی ہو مجکو یہ نسخہ غنیمت نظر آیا اس لئے ہدیۂ ناظرینِ "زمانہ" کررہا ہوں۔

میں نے یہ پہیلیاں جواہر خسروی میں بھی دیکھی ہیں اس لئے بظاہر حال یہ پہیلی نامہ خسرو ہی کا ہے، یہ اور بات ہے کہ کسی بزرگ نے پہیلیاں کہی ہوں لیکن عام مقبولیت کے لحاظ سے خسرو کے نام سے منسوب کردی ہوں جس کی وجہ سے مابعد میں یہ خسرو کی تصانیف میں شمار ہونے لگیں اس مسئلہ پر میں نے اپنی تصنیف "تذکرۂ خسرو" میں بحث کی ہے جو آجکل زیر طبع ہے۔

اب پہیلیاں ملاحظہ ہوں:۔

بُھٹّا

پیر مردے لطیف ریش سفید کردہ دندان سرخ چوں گلنار
ہفت کرتہ بدارد او بر تن بایکے کرتہ میرود در نار

چشم

بُختے ز کبوتران ابلق بستند جدا جدا معلق
پرندو چسرخ جانمایند وز خانہ خود بروں نیایند

چکی

چیست آں رنگیں نگار با صفا دور می سازند و باز آید بجا
ایں عجائب دیدم و حیراں شدم از کمر بستند او را بے گنا

چوسر

واحد ست آں درخت و شاخش چار میوہ ہر شاخ رنگ رنگ شمار
گاہ باشد کہ آں شود پختہ پختہ را خام می کند ہشیار

حقہ

یعنے چیست آں ہر یرشال آتش شوق سر زدہ بہ خیال
عاشقاں منتظر بقدم او آں بصد ناز میرسد بوصال
حرفہائے لطیف میگوید گرنہ پرسد کسے از و احوال
چوں کسے ہمدمی کند باآں غم نماند بدل کسے مہ و سال

حلق کا کوّا

پرندارد پرندہ اش خوانند سُرخ رنگ و سیاہ میدانند

حنا

آں چیست کز و حسن بت افزوں گردد اندر کف مہوشاں موزوں گردد
سبز است تنش گرنہ رسد آب باو چوں آب باو رسد ہمہ خوں گردد

خارپشت

خار بر فرق و لپشت جا سے پا سر بسر دست لیک بیں اعدا

درم

بے سر خواص آہوئے دل نشان جاں بے پا ست زیب خانہ و خود رونق جہاں

خربزہ

چہ چیزست آں کہ باشد گرد غلطاں دو نام زندہ دارد لیک بے جاں
خرے باشد کہ ایں معنی نہ فہمد ز نیمہ کمتر بود آں مرد ناداں

خشخاش

قلعۂ ہست بر سر میلے آب آں قلعہ زہر دار بود
بر سر قلعہ ہست کنگرۂ کابل آں قلعہ را شمار بود

سارنگی

زنے دیدم بسے زیباتنے دارد پُر از دنداں بہ از بلبل سخن گوید زباں دارد سہ تا پستاں

غبارہ

قلعۂ ہست آہنی بے در اندرونش ز زنگیاں لشکر
زنگیاں چوں شوند روئے زنگ می شود چادر سفید بسفر

فنگہ

یکے مُرغ دیدم نہ بال و نہ پر نہ از رحم مادر نہ پشتِ پدر
نہ بر آسماں و نہ زیر زمیں ہمیشہ خورد گوشتِ آدمی

قفل

چیست آں گنبدِ خجستہ دو در کہ درو خفتہ است یک دختر
ناگہاں اندرونِ رود پسرے کند اندر دو پائے وختہ سر

قلم

غریبے از بیاباں شد بشہرے اسیر کردند رویش سر بریدند
سوارش بر سر مرکب کردہ بیہات بمیداں از سوے سر بر کشیدند

کجلوٹا

ہست مرغے کہ در نظر چشمش دو بود چوں کشادہ دارد بال
در زند یا لہائے خویش بہم ہر دو چشمش یکے شود فی الحال

کنکوا

آں چیست کہ مانند پری ناز کند بے پر بپرد بے دہن آواز کند

پاپڑ

رنگش چو رنگِ زعفراں بریاں چو جانِ عاشقاں
پا دار دو پر ہم بداں جاناں بگو ایں چیستاں

ترازو

یکے اسپے عجب دیدم کہ شش پا و دو سر دارد عجائب ترازیں بشنو میانِ پشت دُم دارد

تربُزہ

آں چیست کہ روئے او نماید سبزگوں صد پارہ تنش و لے بیک پائے نگوں
گر دست زنی برو زاندازہ بروں ہمچوں دلِ عاشقاں ہمی ریزد خوں

تسبیح

آں چیست دہن ہزار دارد در ہر دہنے دو مار دارد
شاہ است نشستہ بر سرِ تخت آں در ہمہ در شمار دارد

تمباکو

چیست آں برگے کہ بعد از سوختن گل میشود دودِ او اندر ہوا پیچیدہ سنبل می شود

تبر

عجب یک جانور دیدم دہاں بالائے سر دارد بپا پیش کفش فولادی بروے خود سپر دارد

تیغہ

کیست او کز زباں جہاں گیرد گردنش دست خسرواں گیرد

جھاڑو

فرخ آں خادم کمر بستہ یک تن ست و ہزار سر دارد
سر خدمت بر آستاں بنہد از رخش خاک راہ بر دارد

چراغ

نہنگے دیدم اندر قعر دریا گرفتہ در دہاں یک دانہ گوہر
عجب آں ست او را خود شکم نیست ولیکن می خورد دریا سراسر

چرخی

طرفہ چیزیست کاں ہمیشہ بود از سحر تا بہ شام در نالہ
افگند از دہان بہر ساعت یک طرف برف یکطرف ژالہ

گلوری

دوش دیدم بہ مجلس احباب لگڑ و باز و تدرو و طوطی را
شد ازاں چار مرغ یک سرخاب سر گرفتیم و در قفس کردیم

گوے وچوگان

آں چیست کہ پا و سر ندارد ردمی رود و خبر ندارد
وقتے کہ زنند بر سرش چوب پرّد بہوا و پر ندارد

ماہ ومہر

چیست آں باد شاہِ ہفت اقلیم با ہزاراں سوار می گردد
ناگہاں یک سوار پیدا شد آمدہ فوج شاہ برہم زد

رباعیات

دستِ شرف و بینش از ادراک آمد سبق ادبت نعبد وایاک آمد
توقیع توکز صحیفۂ پاک آمد لولاک لما خلقت الافلاک آمد

ہر چند تو اے دل کہ بقرآں بینی در حقِ محمد ہمہ احساں بینی
در حلقۂ خاتم النبییں بنگر تا در دل او اصبع رحماں بینی

اے آنکہ شدہ طفیلت آدم پیدا گشت از سبب تو چرخِ اعظم پیدا
نور تو نگنجید چو در یک عالم بہر تو خدا کرد دو عالم پیدا

شیخے بحق نظام دیں شد مارا گنجور خداست عالم بالا را
صاحب قدمیست ہر مریدش کہ کند بر کشتی کفش بحیرہ ندریا را

از شیخ نظام چوں سلام ست مرا با حسنِ عمل عیش مدام ست مرا
امید بس مراد و کام ست مرا زیرا ہمہ کار با نظام ست مرا

تصوّر

(از مسٹر فیاض الدین احمد خاں فیاض گوالیاری)

خلقتِ انساں پہ خود قدرت بہت مسرور تھی — ہر طرح تکمیلِ خلاقی اُسے منظور تھی
پیکرِ خاکی میں روشن شمعِ بزمِ طور تھی — اِک حقیقت بے حقیقت چیز میں مستور تھی
چند جوہر حاصلِ دنیائے آب و گل بنے
عقل و احساسات کی خاطر دماغ و دل بنے

ساتھ ہی یہ فکر تھی سوائے مخلوقات کو — اِک شعوری ذوق ہی کافی نہیں ہر بات کو
چاہیئے وہ نشہ بھی اس مرکزِ آفات کو — جو ذرا شیریں بنا دے تلخ احساسات کو
باصرہ کھو دے جنھیں پیش نظر کر دے اُنھیں
بے اثر جو کوششیں ہوں با اثر کر دے اُنھیں

نیند سے کچھ بیخودی لوں کیفِ شعرِ تر سے لوں — کچھ گدازِ شعریت نورِ مہِ انور سے لوں
جذبہ سے طاقت، نمو امید کے منظر سے لوں — لمحۂ فرصت کی عشرت عقل کے جوہر سے لوں
ایسے اجزا سے ہو کچھ، تخئیل کی صورت گری
شاہکارِ عشق بن جائے تصوّر کی پری

ٹکڑے ٹکڑے جب خزاں میں ہو گریبانِ بہار — ہو چکا ہو جب جنوں کی نذر دامانِ بہار
جب نہ ہو تا عمرِ گلشن کوئی امکانِ بہار — دم کے دم میں پھر وہ نقشے ہوں وہی شانِ بہار
رنگ و بو پر پھر سے اترائے چمن بن کر چمن
آ رہے آغوشِ تصوّر میں دُلھن بن کر چمن

میکدے والوں سے جب ساقی نگاہیں پھیر لے — عشرتِ دو روزہ واپس اپنی راتیں پھیر لے
مے بھی ہو بے کیف سی مستی بھی نظریں پھیر لے — شیشہ منہ موڑے سبو روٹھے خم آنکھیں پھیر لے
دل شکستہ سا نظر آئے جو ناکامِ شراب
اپنے میکش کو تصوّر دے وہیں جامِ شراب

جب قیامت کا نمونہ ہوں شبیں مہجور کی
بے اثر ہو جائیں جب آہیں کسی مجبور کی
دل کو فانوسِ تصوّر پھر سُجھائے دُور کی
شکل نادم سی نظر آئے بتِ مغرور کی
عذر خواہِ جَور ہو، گردن میں باہیں ڈالکر
مسکرائے پھر نگاہوں میں نگاہیں ڈالکر

جلوتوں میں خلوتیں ہیں خلوتوں میں گفتگو
اے تصوّر تیرا کیا کہنا بڑی نعمت ہے تو
تیرا شہرہ سُو بہ سُو ہے تیرا چرچا کُو بہ کُو
مرہمِ زخمِ جگر ہے چاکِ دل کا ہے رفو
جسکو دل چاہے ملا دے اُس سے تو اک آن میں
تیرے دم سے ہے اُلوہیت کی بو انسان میں
گرچہ ہے مُہرِ سلیمانی، نگینہ ہوش کا
ناسزا ہے لیکن اہلِ دل کو کینہ ہوش کا
بار ہے احساسِ نازک کو خزینہ ہوش کا
ہاں ڈبو دے اپنی لہروں میں سفینہ ہوش کا
بخشدے فیاضؔ کو لمحاتِ فرصت بخشدے
کوئی دم کے واسطے دنیا میں جنت بخشدے۔

کلامِ محمود

(از جناب محمود اسرائیلی صاحب)

رازِ الفت سا ہر اک راز کہاں ہوتا ہے
جس قدر اس کو چھپاؤ یہ عیاں ہوتا ہے
زباں تک جو نہیں آتے ستم ایسے بھی ہوتے ہیں
جنھیں ہنسکر عیاں کرتے ہیں غم ایسے بھی ہوتے ہیں
مجبوریِ فطرت سے وہ معذور ہیں ورنہ
ان کے لبِ نازک کی ہر آواز فغاں ہے
میری باتوں پر خفا ہیں، چپ ہوں، اب یوں کروں
انکی ہی سنتا رہوں اور میں نہ منہ سے "ہوں" کروں
رہِ نیاز سے ہو کر گیا ہے جب وہ عشق
خودی کو چھوڑ خودی سے خدا نہیں ملتا
غم نہ ہوگا بھی تو دل چین سے کب بیٹھے گا
عیش میں لذتِ آزار کا رونا ہوگا

حضرت علی حزیںؔ

(از ڈاکٹر اندر سہائے سکسینہ اتہاس النکار)

ہندوؤں کے لئے تو کاشی بنارس دنیا جہان میں ایک ہی جائے عبادت و مغفرت ہے لیکن اہل اسلام بھی اس کاشانہ کو نظر احترام سے دیکھتے آئے ہیں۔ مشہور جہاں گشت سیاح اور اسلامی مؤرخ البیرونی اِس معبدِ عظیم کو مشرق کا مکہ لکھتا ہے۔ یہاں کی صدق و صفا آگیں زندگی سے بادشاہ شاہجہاں کے ولیعہد دارا شکوہ کی کایا پلٹ ہوگئی تھی "از شرع شریف ملت منیف مقرر چنین است کہ دیرہائے دیرینہ برانداختہ نشود و تبخانہ ہائے جدید بنا نیابد" یہ اس مشہوربت شکن بادشاہ کا فیصلہ ہے جو اُس نے بنارس کے مندر سیتارام کے باب میں دیا ہے اور جو تواریخ میں حضرت اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کے نام سے خطاب کیا گیا ہے۔ مندر آدوشیشور واقع بالش کا پھاٹک بنارس تعمیر کردہ مہاراجہ رام سنگھ والی آمیر بعہد اورنگ زیب عالمگیر دوسری شہادت ہے کہ فیصلہ مذکور الصدر پر آنحضرت کو نظر ثانی فرمانے کی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔ میر رستم علی صوبیدار نواب اودھ نے بنارس میں مندر و شوناتھ جی کے نوبت خانہ کو نہایت حسنِ عقیدت کے ساتھ بنوایا تھا۔ اور تو اور خواجہ حسن نظامی تبلیغ اسلام کے زبردست حامی بنارس میں آکر ایسے اس سرزمین پاک پر فریفتہ ہوئے کہ لیلام (نیلام) ہوگئے۔ ثبوت کے لئے سر محمد اقبال کا خط ملاحظہ ہو جو مکاتیب خواجہ میں شائع ہوا ہے۔

لیکن جس اعتقاد اعلیٰ کو لیکر اس عدیم المثال متبرک بستی میں حضرت علی حزیںؔ وارد ہوئے اور جو پناہ ممدوح کو یہاں نصیب ہوئی وہ لاجواب ہے، فرماتے ہیں ؎

از بنارس نہ روم معبدِ عام است اینجا ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

"اسی میں خیریت ہے کہ تم میرے حجر علی حزیں کو بھیجدو، ورنہ وہاں پہونچکر میں بنارس کی اینٹ سے اینٹ بجادونگا۔" اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ "آئیے، شوق سے تشریف لائیے، جناب عالی سر آنکھوں پر، اے آمدنِ تو آسایشِ جانِ ماست۔ مگر واضح رہے کہ میں اپنے یہاں کے پناہ گزین علی حزیں کو جیتے جی تو حوالہ نہ کرونگا۔"

یہ کس کے حکم کی نافرمانی ہے' اور کون کررہا ہے؟ بس نام نہ پوچھیئے، نام لیتے ہی بدن کا رُواں رُواں کانپ اُٹھتا ہے، ہر موئے جسم زبان بنکر پکار اُٹھتا ہے الاماں، یہ نادرشاہ جہاں سوز کا حکم ہے' اور حکم عدولی کرنے والے مہاراجہ بلونت سنگھ والی بنارس ہیں۔

یہ واقعہ تاریخ میں آبِ زر اور فخر کے ساتھ لکھنے کے قابل ہے کہ دنیا کے پردہ پر نادرشاہ کے حکم سے کہیں انحراف نہیں ہوا۔ ہوا تو بنارس میں اور حضرت علی حزیں کے باب میں۔

ہم یقین کر سکتے ہیں کہ اگر نادرشاہ مہاراجہ بلونت سنگھ کا جواب پاکر چپ چاپ دہلی سے ایران نہ چلا جاتا اور بنارس پر حملہ آور ہوتا تو مہاراجہ بلونت سنگھ نادر کا مقابلہ اُسی جانبازی کے ساتھ کرتے جیسے محمد شاہ کو پناہ دیکر سلطان علاءالدین خلجی کا راؤ ہمیر دیو نے کیا تھا کہ سب کچھ قربان کردیا۔ راؤ ہمیر دیو کی ہٹ مشہور ہے۔ ہمیر دیو کے مورث راؤ پتھورا عرف مہاراجہ پرتھوی راج چوہان نے بھی حسین نامی ایک مسلمان کو پناہ دیکر بادشاہ شہاب الدین غوری سے تباہ کن جنگ مول لی تھی۔

نادرشاہ نے علی حزیں کو باغی کیوں گردانا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ جناب حزیں ایران کے شرفائے کرام اور سلطنت کے ارباب حل وعقد میں سے تھے۔ جب نادر کا ایران میں دور دورہ ہوا اور ملک ایران اللہ والوں اور شرفائے اکابر کے لئے بلا خانہ بن گیا تو ایران کی دولت وثروت پر لات مارکر حزیں بھی ہندوستان چلے آئے اور دہلی میں فروکش ہوکر رفتہ رفتہ ریاضت کیشان درویشاں میں شریک ہوگئے۔ اور جب نادرشاہ دہلی میں بھی آدھمکا تو موصوف دہلی سے بنارس آگئے۔ بنارس میں علی حزیں قبلہ کا مہاراجہ بلونت سنگھ نے دل سے استقبال کیا، آپ کے لئے ہرگونہ سامان آسائش و ریاضت بہم پہونچائے۔

بنارس میں با امن اور پُرسکون ریاضت کشی سے اب حزیں کا دیدۂ دل وا ہوچکا تھا، روشن ضمیری سے حالات طبقات ارض وسما منکشف رہتے تھے۔ شجاع الدولہ نواب اودھ جس وقت انگریزوں سے لڑنے جارہے تھے تو بارگاہ حزیں میں حاضر ہوئے۔ نواب صاحب نے دریافت فرمایا "آیا وہ فتحیاب ہونگے"۔ "نہیں نواب کو پیشقدمی نہیں کرنی چاہیئے۔" سائیں کے سوسو خیال درویش حزیں کی صلاح وصوابدید نہ مانکر نواب شجاع الدولہ انگریزوں سے برسرپیکار ہوئے اور ہارے۔ منشی اعتصام الدین راقم شگرف نامہ ولایت جو اس جنگ میں شریک تھے حوالۂ قلم کرتے ہیں کہ نواب شجاع الدولہ اور مہاراجہ ملہار راؤ ہلکر اتحاد کرکے جنرل کارناک سے لڑے تھے۔ اکیلے ملہار راؤ ہلکر کے ہی ہمرکاب پچاس ہزار سوار تھے۔ یہ مقام استعجاب اور غور ہے کہ اس ٹڈی دل پر بھی نواب شجاع الدولہ مٹھی بھر انگریزوں سے شکست کھا گئے۔ خدا معلوم یہ بات کہاں تک درست ہے سنتے ہیں

کہ اس جنگ میں پیتل کی اشرفیاں برسی تھیں جن کی لوٹ میں پڑکر ہندوستانی فوج ہاری تھی۔ یہ بات منشی اعتصام الدین نے لکھی ہے اور نہ مسٹر بی۔ این متھہ سابق کلکٹر بنارس نے۔ متھہ صاحب نے حضرت علی حزیں پر ایک نایاب مضمون زیب رقم فرمایا ہے

نواب شجاع الدولہ کی شکست کا واقعہ ۱۷۶۵ء کا ہے اسی سال بنارس پر نواب اودھ کا تسلط ہوا تھا۔

بقول مسٹر متھہ جناب علی حزیں کی قبر بنارس میں فاطمہ نامی مقام پر ہے اور قبر پر جناب حزیں کا وہی شعر کندہ ہے جو ہم قبل ازیں ہدیۂ ناظرین کرام کر چکے ہیں۔ کیا حضرت سرمد کاشی نے یہ شعر حضرت حزیں پر ہی لکھا ہے ؎ آنکس کہ ترا کلاہ سلطانی داد مارا ہمہ اسباب پریشانی داد

کلام حزیں فارسی میں ہے اور نکات فلسفیانہ نیز زیور معرفت سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ اُس میں درد ہے ٹیس ہے وہ کہتا ہے اُس کی یاد میں ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے ہوئے گل میں ہم کس وادیٔ پرخار میں آئے

نوائے راز

(از جناب ابوالفاضل راز چاندپوری)

نمود و نام سے جو بے نیاز ہوتا ہے رہِ طلب میں وہی سرفراز ہوتا ہے
ہوس پرست کہیں عشق باز ہوتا ہے حریف مفت میں ہنگامہ ساز ہوتا ہے
بیک کرشمہ جو محمود ساز ہوتا ہے ایاز تو نہیں حسنِ ایاز ہوتا ہے
بنامِ حسنِ محبت، بجانِ صدقِ طلب دلیلِ راہ حقیقت مجاز ہوتا ہے
بشوق و ذوق میں جب اُس کا ذکر کرتا ہوں سکونِ قلب سے حاصل نیاز ہوتا ہے
مآلِ کارِ محبت میں یہ ہوا ظاہر کہ حسنِ دوست بڑا کارساز ہوتا ہے
تصرفاتِ کرشمائے حسن، کیا کہیے نیازِ عشق بھی ہم رنگِ ناز ہوتا ہے
پہ شکر باش گرفتارِ بے نیازیٔ دوست کہ نازِ حسن بقدرِ نیاز ہوتا ہے
رہِ طلب میں تلاشِ رفیق کیا اے راز کہ ذرہ ذرہ مسافر نواز ہوتا ہے

مئے دو آتشہ

(از جناب سید مقبول حسین صاحب بی اے۔ احمد پوری)

سرمد

(۱)

در عہدِ شباب شعر و انشا ہنر است
میلے بہ گل و ساقی و مینا ہنر است
پیری چو رسید ترکِ دنیا ہنر است
ہر لحظہ خیال و فکرِ عقبیٰ ہنر است

(۲)

دل باز گرفتارِ نگارے شدہ است
در فکر و غمِ لالہ عذارے شدہ است
من پیر و دلم ذوقِ جوانی دارد
ہنگامِ خزاں جوشِ بہارے شدہ است

(۳)

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

(۴)

ایں شہر و دیار و کوہ و صحرا ہمہ ہیچ
دیدیم تمام زشت و زیبا ہمہ ہیچ
خود را بخدا گذار و بگذر ز ہمہ

ترجمہ

(۱)

کوتا بھاکھا اور جوانی
من کی موج نشہ اور پانی
بڈھے بھئے تو جگ نہ سہائے
ایشور دھیان بنا حیرانی

(۲)

من میں آئے پھر من موہن
ہردے آن بسے سکھ نندن
بوڑھے بھئے پر یہ جی چوکھا
پت جھڑ سمے میں آیا ساون

(۳)

چھوڑ چھوڑ اب جو ہے سو ہے
نرگن دشٹ ادھرم ہے تو ہے
آس نہ توڑ ہمارے دوارا
بچا اپاؤ سے جگ میں کو ہے

(۴)

دھوکا ہیں سب بن اور بستی
اونچ اور نیچ بلندی پستی
ایشور کا ہو جا اے گیانی

کیس خواہش جملہ دین و دنیا ہمہ ہیچ ———— پھر تو ساری دنیا سستی

(۵) ———— (۵)

برمن در لطف و جود مسدود مکن ———— مجھ پاپی پر دَیا کا دَوارا
مقبول تو ہر کہ گشت مردود مکن ———— بند نہ کر میرے کرتارا
در ضعف نمی تواں گراں بار کشید ———— بھاری بوجھ کا تنت نہیں اب
پیرانہ سرم گناہ افزود مکن ———— داتا پاپ سے دے چھٹکارا

جذبات اثر

(از خانصاحب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی بی اے)

شب فراق یہ بیدادِ خستہ جانی تھی ———— کہ ہر نفس میں نہاں مرگ ناگہانی تھی
نئی نئی تھیں امنگیں، نئی جوانی تھی ———— گلابی صبح تھی اور شام ارغوانی تھی
ہمارے حال پہ اک دن تھا لطف ساقی کا ———— ہمارے جام میں صہبائے کامرانی تھی
شباب تم کو مبارک ہمیں تو یہ نہ کھلا ———— کہ خوابناک فسانہ تھا یا جوانی تھی
دل خراب جو الزام مجھ کو دیتا ہے ———— بتا تو کون مری بات تو نے مانی تھی
ہزار حیف کہ مٹنے کو ہے وہ داغ جگر ———— کسی کے دردِ محبت کی جو نشانی تھی
اُسی سے ہے دلِ ناشاد کو تعلق سا ———— وہ اک نگاہ جو تمہید سرگرانی تھی
لیا ہے جائزہ ایک ایک حسرت دل کا ———— خیال یار کو مجھ سے یہ بدگمانی تھی
وہی نگاہ کہ اب جس پہ آہ کرتے ہیں ———— یہی نگاہ کبھی وجہ زندگانی تھی
ہزار حسن تھے کافر کی سادگی میں نہاں ———— نہ عشوہ تھا نہ کرشمہ، فقط جوانی تھی

ہو جو تیشۂ فرہاد سے بھی نقش پذیر
گداز فکر اثر سے وہ طرح پانی تھی

لکھنؤ قدیم کے ہندو مسلمان

(از خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

ابھی چند سال ہوئے ہونگے کہ اودھ میں عموماً اور لکھنؤ میں خصوصاً ایسے ہندو مسلمان بستے تھے جن کا چولی دامن کا ساتھ تھا، ایک دوسرے کے شریک حال اور آپس میں مذہب کا احترام کرتے تھے۔ ایک کی انگلی دکھتی تھی تو دوسرے کو درد ہوتا تھا بعض ہندو ایسے تھے جن کو آپ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ نام سے بھی یہ بتانا مشکل تھا کہ ان کا مذہب کیا ہے پنڈت بجنا تھ کے مطبع ثمر ہند میں ایک شخص لالہ خدا بخش نامی سکسینہ کائستھ تھے اُن کے نام سے شک ہوتا تھا کہ خدا بخش نام کے ساتھ ان کو لالہ کیوں کہتے ہیں، چوپٹیوں پر مکان تھا، حالت دیکھئے تو محرم میں گلے میں ناڑہ پڑا ہوا ہے سبز ٹوپی پہنے ہوئے ہیں، سات تاریخ سے مکان پر سبیل رکھی ہے وہاں کچھ شعبدے بھی ہو رہے ہیں، فوارہ چھوٹ رہا ہے، لال کھڑکی سے نکلتے ہیں وہ لڑتے ہیں، روشنی ہو رہی ہے، ایک بڑا سا حقہ بھرا ہوا ہے۔

دوسرے رئیس ہیں جن کا نام لالہ امام بخش ہے، ان کے اخلاق اور اطوار مصلحانہ وزیر گنج میں دولت خانہ ہے، لکھنؤ کے معززین میں ان کا شمار تھا۔

تیسرے شخص تھے لالہ حسین بخش۔ ایک غریب آدمی تھے، یہ شاعر بھی تھے، یحییٰ گنج لکھنؤ میں رہتے تھے، نام کا لحاظ نہ کیجئے تو بھی ان کے اعمال نیک تھے اور ہندو ہو کر مسلمانوں سے بخلوص ملتے تھے اور اس وقت کے مسلمان بھی ایسے ہی تھے جن میں تعصب کا نام نہ تھا۔

اسی زمانے کی ایک قلمی کتاب ہم کو ملی ہے جس کا نام تاریخی چمن پر فضا ہے، نظم ہے، اس کے مصنف کا نام لالہ کالیچرن ہے۔ کتاب پر لکھا ہے کہ یہ سنہ ۱۸۸۵ء میں چھپ چکی ہے اور مصنف نے اسے مفت تقسیم کیا ہے۔ لالہ کالیچرن اپنا حال مثنوی میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

"مجھے شاعری کا شوق نہیں تھا نہ اس فن سے واقفیت نہ کبھی شعر و شاعری کا ذکر تھا، میں تنہا نشینی

[illegible]

اخلاقی اور تاریخی کتابیں ہندی اردو میں ہیں جو چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اپنے والد کے امور خیر کا کچھ ذکر کروں، مگر نظم میں لکھوں کہ نثر سے نظم دلچسپ ہوتی ہے اور اسے لوگ یاد رکھتے ہیں۔ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کیونکر نظم کروں۔ ایک دن کان میں آواز آئی کہ ہمت مرداں مدد خدا اسی کو اپنے لئے فال نیک سمجھ کر نظم کرنے لگا۔ قلمدان اٹھا کر لکھنا شروع کیا، مگر اشتغال کثیر سے مجبور ہو کر کبھی کبھی موقع نہیں ملتا تھا۔ بہرحال کتاب کو ایک مدت میں ختم کیا اور اپنے دوست کو جن کا نام مولوی حسین بخش تخلص تفید ہے، اٹاوہ کے رہنے والے منشی واجد علی وجد کے شاگرد ہیں، اور بابو للتا پرشاد کیسر تمیذ کندن لال شاطر ہیڈ کلرک پولیس ہمیرپور اور سوہن لال تخلص تحمل ماسٹر ضلع اسکول ہمیرپور اور منشی روپ چند ساکن فتحپور اور منشی بینی پرشاد وضع اور منشی واجد علی وجد ساکن بھپھوند ضلع اٹاوہ کو ایک جلسہ میں تمام مثنوی سنائی۔ سب نے بیحد تعریف کی اور پسند کیا اور اس کی تاریخیں کہیں اور چھپنے کا تقاضا کیا، آخر میں نے مثنوی چھپوا کر دوست احباب میں تقسیم کردی۔

میں تحصیل ہمیرپور کا رجسٹرار قانون گو ہوں، جمنا کے کنارے متصل سرا میرا مکان ہے، جمنا کا مہاتم مجھے روزانہ حاصل ہے۔ میں یہاں چھبیس سال سے رہتا ہوں اور تیئیس سال سے قانونگو ہوں میرے باپ اب پنشن پاتے ہیں مگر یہاں وہ بھی رہ چکے ہیں، میرا بھائی ڈاکخانہ میں ملازم ہے اور یہاں سے پانچ کوس کے فاصلہ پر ایک موضع بھٹہ ہے وہاں رہتا ہے۔ میرا وطن کوڑا پرگنہ اموٹی ضلع فتحپور ہسوا ہے میرے والد منشی منالال یہاں قانون گو رہ چکے ہیں، اب کچھ ذکر خیر اپنے والد کا کرتا ہوں۔ ایسے خوش خلق تھے کہ ہندو مسلمان سب ان سے محبت کرتے تھے ایک گاؤں بھٹہ خورد کہلاتا ہے وہاں ہمارا مکان ہے، ہمارے مورث اعلیٰ اس کے مالک تھے لیکن یہاں کوئی کنواں نہ تھا اور سب ہندو مسلمان باہر سے پانی بھر کے لاتے تھے۔ اس تکلیف کو لالہ نے محسوس کیا، فوراً ایک پختہ کنواں بنوادیا، خدا کی قدرت سے اس کا پانی بہت شیریں نکلا اب بستی والوں کو آب شیریں کی تلاش میں کہیں باہر نہیں جانا پڑتا تھا بلکہ اسی کنویں سے فیض اٹھاتے ہیں اور گاؤں سے باہر کے لوگ یہاں پانی بھرنے آتے ہیں۔ دوسرا کام نیک کہ آم کا باغ سنکلپ کردیا ہمارے بزرگوں نے شیونام سے چند درخت آم کے سنکلپ کئے تھے ہمارے والد نے اسی باغ کے پاس زمین خرید کر بہت درخت لگائے اور وہ سب سنکلپ کردیئے۔ یہ درخت وقف عام ہیں۔

بھوئیاں رانی کے نام سے ایک استھان مکان کے قریب ہے بہت مشہور ہے، اہل ہنود اپنے بچوں کی مونڈیاں یہاں کرنے آتے ہیں، زمین پر ایک چبوترہ بنا ہوا تھا، اسی پر بھوئیاں رانی کا مقام تھا مگر بدسرشت چوکان نے اسے برباد کردیا تھا۔ ہمارے والد کو خیال آیا تو وہاں ایک پختہ اونچا مکان بنوایا اس میں ایک بلند پایہ بنا کر اس پر ایک محراب بنوائی محراب میں ایک طاق بنوایا اسی طاق میں رانی بھوئیاں براجنے لگیں تمام باشندوں کو بڑی خوشی ہوئی شادیانے بجنے لگے۔ ہر سال بھوئیاں رانی کا میلہ بہت دھوم سے ہوتا ہے ہمارے والد نے ایسے بہت سے نیک کام کئے، کتابیں تصنیف کیں اور چھپوائیں اور مفت تقسیم کردیں۔ جگن ناتھ پرشاد منجھلے بھائی کا نام ہے۔ گیا پرشاد سب سے چھوٹا بھائی ہے۔

رام پرتاب میرا داماد ہے بہت نیک نام تپ محرقہ میں مبتلا ہے خدا اُسے شفا دے مجکو خدا نے پانچ بیٹے دیے ہیں بلدیو پرشاد سب سے بڑے فرزند کا نام ہے، دوسرا بیٹا رگھناتھ پرشاد ہے جو علم و فضل میں نامور ہے سب لوگ اس کی شیریں گفتاری کی تعریف کرتے ہیں تیسرا بیٹا امور مذہبی کی طرف بہت راغب ہے اس کا نام اُما پرشاد ہے چوتھا بیٹا ہر پرشاد ہے، پانچواں بیٹا منیشر پرشاد ہے۔ یہ خدا کا فضل مجھ پر اسی سبب سے ہے کہ میں کسی غیر قوم سے بغض نہیں رکھتا۔ میری نگاہ میں ہندو مسلمان برابر ہیں، میں نے کسی مسلمان کو آج تک کسی طرح کی ایذا نہیں پہنچائی میں جانتا ہوں کہ جس طرح ہندو کا محافظ ایشور ہے اسی طرح مسلمانوں کا محافظ بھی ایشور ہے۔ میری ملاقات ہندو مسلمانوں سے برابر کی ہے۔

با مسلماں اللہ اللہ با ہنوداں رام رام

میں اپنے مذہب کا پکا ہوں، پوجا پاٹ دان پُن تیرتھ سب کچھ جاری ہے، میں اعتقاد رکھتا ہوں کہ دنیا میں جو شخص عبادت زیادہ کرتا ہے وہ آواگون سے محفوظ رہتا ہے۔

قطعہ

(از جناب چندر سین سوز لیبوانی)

چھلک گیا مےِ ہستی کا آہ پیمانہ	کوئی نہ اپنا پھر آیا نظر نہ بیگانہ
اجل نے ختم کیا سوزؔ زیست کا قصہ	تمام ہو گیا دو ہچکیوں میں افسانہ

جوگی کا پیار

قصّہ

(از ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ صاحب)

(۱)

کنور موہن چندر اودھ کے رئیس اعظم تھے۔ خاندانی اعزاز کا یہ حال تھا کہ بزرگوں نے جس کے ماتھے پر دہی چندن کا ٹیکا لگا دیا وہی راجہ کہلایا۔ لیکن اس وقت وہ خزاں رسیدہ باغ کے پھول تھے اُن کے والد فیاضی میں ہرش چندر ثانی کا خطاب حاصل کر چکے تھے جس کا خمیازہ خود اُنھیں اُٹھانا پڑا تھا۔ زمانہ کی دست بُرد سے پامال گڑھی میں اب بھی اُن کی سلطنت تھی اور دس پانچ وفادار نوکر چاکر اُن کی رعایا تھے۔ اس پر بھی ہر سال ساون کے مہینہ میں اودھ کے تعلقداروں کی طرف سے ہرش چندر بھون میں کیرتن ہوا کرتا تھا جس میں گرد و نواح کے تمام رؤسا فخریہ شامل ہوا کرتے تھے۔ واپسی سے پہلے ہر شخص گڑھی کی چوکھٹ چومتا اور وہاں کی خاک اپنے سر آنکھوں میں لگاتا۔ اس کے بعد ایک مجلس عام میں کنور صاحب کو نذریں دی جاتیں۔ اس موقع پر سبھی ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے لیکن خودداری کی دولت سے مالامال کنور صاحب اس نقد و جنس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ اسی سبب سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں انکی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ غریبی میں پرورش پانے والے دُرِ یتیم کے لئے قناعت ہی وہ بے بہا دولت ہے جس کی بدولت اس کا اقتدار قائم رہتا ہے خواہ وہ خود زمانہ کی گردش سے مٹ جائیں۔

(۲)

راجپوتانہ راجاؤں کا اور اودھ تعلقداروں کا گھر ہے۔ کنور صاحب کے پڑوس میں ایک تعلقدار بابو بلنکے بہاری عرف دمڑی بابو رہتے تھے۔ خدا نے دھن دولت سب کچھ ضرورت سے زیادہ دے رکھا تھا لیکن ان کا مزاج کچھ ایسا واقع ہوا تھا کہ پھول چننے کے بجائے کانٹوں میں دامن اُلجھانا بہتر سمجھتے تھے ہنر ظاہر کرنے کی نسبت عیب بیان کرنا اُن کی عادت میں داخل ہو گیا تھا۔ روپیہ پیسہ سے اُنھیں طبعی اُنس تھا۔ سائل دروازہ پر پہونچنے بھی نہ پاتا تھا کہ وہ اسے ایک آدھ دمڑی کی کوڑیاں دلوا دیتے

اسی وجہ سے لوگ اُنھیں دمڑی بابو کہنے لگے تھے مگر اس نام سے خود انھیں بڑی چڑھ تھی چنانچہ اسی کی علت میں اُنھوں نے کتنے ہی آدمیوں کو سزا دی، ڈنڈے رسید کئے لیکن آخر کار یہ نام مشہور ہی ہو گیا۔

ان دونوں کنور موہچند ان حضرت کے ہدف ملامت تھے وہ یہ گراں قدر تحفہ اپنی مٹھی میں کرنا چاہتے تھے لیکن کنور صاحب کو یہ بات کسی طرح منظور نہ تھی۔ دونوں کے عادات و اخلاق میں زمین و آسمان کا فرق تھا، ایک صاحب گنج و گہر دوسرا کوچۂ قناعت کا دریوزہ گر، ایک کو دولت دنیاوی کا مرض، دوسرا حرص و ہوس سے مستغنی، ایک کو اپنی دولت کا خیال دوسرے کو اپنی وضعداری کا لحاظ۔

مگر دمڑی بابو کے مشورے پر کاربند نہ ہونا اپنے لئے لعن وطعن کی دعوت دینا تھا۔ اُن دنوں دولت و ثروت کے اعتبار سے وہ اودھ میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ راجہ ہریشچندر کو جب کبھی روپیہ کی ضرورت پڑتی وہ اُنھیں سے قرض لیتے، دمڑی بابو اُنھیں کے بنائے ہوئے تعلقداروں میں تھے خیر خواہی دکھلانے کے لئے ہر وقت زیادہ سے زیادہ رقم پیش کرنے کے لئے تیار رہتے تھے اسی وجہ سے اُن کو قرضہ سے سبکدوش ہونے کے لئے اپنی تمام جائداد سے ہاتھ دھونا پڑا۔

کنور صاحب اور دمڑی بابو میں رشک وحسد کے سوا اور کچھ وجہ نفاق نہ تھی، لیکن احباب میں اُن کا مضحکہ اُڑایا جانا ضروری تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے خود پسند لوگ اُن کو قدیم رسمیات کا مخالف سمجھ کر ناک بھوں چڑھاتے تھے لیکن اُن سے منحرف ہونے کا خیال نہ ہندوؤں کے دل میں آتا تھا اور نہ مسلمانوں کے۔

(۳)

رتن سنگھ خاندانی آدمی تھے، دماغ نورِ علم سے منور تھا، نوکری کی تلاش میں گھل رہے تھے بھٹکتے بھٹکتے ایک دن کنور صاحب تک گذر ہوا، سلام کہلا بھیجا، دربار میں فوراً بلائے گئے، سلام لینے کے بعد کنور صاحب کسی قدر سخت لہجہ میں بولے "کیوں جناب! یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہاں نانِ شبینہ کا ٹھکانا نہیں آپ میرے پاس صورت سوال ہو کر آئے ہیں"۔

رتن چند یہ سنکر کانپ اُٹھے، ادب و انکسار کے ساتھ عرض کیا "سرکار، دُور کا آدمی ہوں معلوم نہ تھا، پہلے بابو بانکے بہاری کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن اُنھوں نے زور دیکر یہیں بھیجا"۔

کنور صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، گھر کی آبرو گھر ہی کے لوگ برباد کرتے ہیں، اُنھیں خواب

میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب اُنھیں سائل کو جواب دینا در کنار ڈانٹ بتانا پڑے گی۔ اُنھوں نے دل میں کہا چاہے جو ہو میں اپنی خاندانی عظمت نہ مٹنے دونگا، ممکن ہے یہ میرا امتحان لینے آیا ہو۔ بانکے بہاری کی اِس حرکت کا ایسا جواب دونگا کہ باید و شاید۔ اس کے بعد وہ رتن سنگھ سے مخاطب ہوئے:۔

"اچھا بھائی صاحب میں نے آپ کے لئے ایک کام سوچا ہے"

"یہ حضور کی عنایت ہے"۔

"مگر اس کے ساتھ ہی آپ کی مستعدی بھی ضروری ہے"۔

"میں غریب کس لائق ہوں"۔

"دیکھئے جناب تکلف جانے دیجئے، مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے، اگر میری غیر حاضری میں گڑھی کا انتظام دیکھ سکو تو میں تمھیں نگراں حال بنا کر چلا جاؤں"۔

رتن سنگھ کی باچھیں کھِل گئیں، لیکن جہاں دیدہ تھے دِلی خوشی دباتے ہوئے بولے "سرکار کا حکم سر آنکھوں پر، مگر سایہ سر سے نہ اُٹھایئے"۔

"بس بس یہی مناسب ہے"۔

"جیسی مرضی" رتن سنگھ نے کہا۔

"بیچارے نوکروں کو تکلیف نہ ہونے پائے"۔ یہ کہتے ہوئے کنور صاحب اپنے خاص کمرہ میں چلے گئے۔ روزمرہ کے تفکرات انسان کو دنیا سے بیزار بنا دیتے ہیں۔ اوائل عمر ہی سے کنور صاحب کی طبیعت کا میلان سنیاس کی طرف تھا۔ وہ موقع کے منتظر تھے۔ مگر نوکروں کو اُن کے حال پر چھوڑ جانا وہ ظلم سمجھتے تھے، اُن کو ایک دیانتدار اور حق شناس آدمی کی تلاش تھی حسن اتفاق سے آج انھیں ایک معتمد علیہ شخص مل گیا۔

کنور صاحب کو شنکر گڈھ چھوڑے تیس برس ہو گئے، سارے علاقہ میں اُن کے سنیاس لینے کی افواہ پھیل گئی۔ ہریشچندر بھون میں ابھی تک اُسی طرح کیرتن ہوتا تھا۔ آوا کے راؤ صاحب کی بات کوئی ٹال نہ سکتا تھا، اُن کا قول تھا کہ جب تک دربار میں وہ چندن چوکی جس پر کنور صاحب کے والد مہاراجہ ہریشچندر بیٹھا کرتے تھے رہیگی تب تک برابر کیرتن ہو گا۔ اور اُسی چوکی کے روبرو نذریں گذاری جائیں گی۔ اس فیصلہ کے خلاف دھرمی بابو اور دیگر مخالفین نے اپنی آواز اُٹھائی لیکن اُس کا

کوئی اثر نہ ہوا۔

رتن سنگھ پر دوسرے ہی دن ریاست کا راز کھل گیا۔ کنور صاحب کی قربانی کا دل پر گہرا اثر پڑا۔ ذاتی نفع اٹھانے کا خیال پس پشت ہو گیا۔ اب انھیں ذمہ داری کا گہرا احساس ہوا جس سے کسی کو شکایت کی گنجایش نہ رہی۔

(۴)

ہریشچندر ہال میں ہلچل مچی ہوئی تھی، سنیاسی کو گرہست بننے کی کیا ضرورت؟ ہم ایسے شخص کی کوئی عزت نہیں کر سکتے جو وید شاستر کے اصولوں کو اس بیدردی سے توڑ ڈالنے کے لئے تیار ہو چاروں طرف سے یہی صدا سنائی دیتی تھی۔ اتنے میں تعلقداروں کی اگلی صف سے ایک پینتیس برس کا قوی ہیکل شخص اٹھا۔ یہ کنور موہن چند تھے، کالے کالے بال، چوڑی پیشانی، بشرے سے رعب داب مترشح ہوتا تھا۔ چہرے میں کچھ ایسی کشش تھی جس نے زبانوں کو خاموش اور دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ حاضرین سے مخاطب ہو کر انھوں نے اپنی تقریر اسطرح شروع کی:۔

"حضرات! اگر کسی دکھیا کی مدد کرنا گناہ ہے تو میں بیشک پاپی ہوں، کوئی بیوہ ہمدردی کے لئے ہماری طرف آنکھ اٹھائے اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا اگر ہمارا دھرم ہو تو میں ایک نہیں لاکھ بار دوزخ میں جانے کو تیار ہوں۔ یہ (اپنے پاس بیٹھی ہوئی ایک بتیس بائیس سال کی سفید پوش عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میری بہن، کیا کہو......"

دو ایک بابو کے دوست احباب نے کہا: "نہیں نہیں ضرور کہئے"۔

"......میں گنگا جی کے کنارے کنارے گنگا ساگر سے آ رہا تھا، پریاگ راج جانے کا ارادہ تھا۔ کل کاشی میں یہ گنگا جی میں ڈبکیاں لیتی ہوئی دکھائی دیں، باہر نکالا مگر جب ہوش آیا تو پھر پانی کی طرف لپکیں، میں نے ہاتھ پکڑ کر کہا" بہن دھیرج دھرو" اس پر آپ بیکسی سے میری طرف دیکھکر بولیں "کیا کروں خودکشی کرنا پاپ ہے لیکن اب اس کے سوائے چارہ نہیں"......

بات دلوں پر اثر کر رہی تھی، مجمع خاموش تھا، کنور صاحب کہتے گئے۔

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آپ ظالم سماج کے ہاتھوں ستائی ہوئی بیوہ ہیں، اگر آپ لوگ تھوڑی دیر اور تکلیف کریں تو شریمتی جی خود بھی کچھ عرض کریں گی"۔

شاہ پور کے ٹھاکر صاحب نے بہ آواز بلند کہا "ہاں ہاں ہم شروع سے اخیر تک سنیں گے۔

کملا دیبی نے کہنا شروع کیا: "بزرگو! ہماری مدد کرنا در کنار جو لوگ ہمارا ہاتھ پکڑنے کو تیار

ہوتے ہیں آپ انھیں ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔

(چند آنکھوں میں آنسو بھر آئے، دمڑی بابو نے منہ چھپا لیا۔)

"کنور اور مجھ میں بھائی بہن کا رشتہ ہے۔ ہماری بھلائی کا صرف یہی ایک راستہ نہیں ہے کہ ہم پھر سے سہاگن بنیں، بتلائیے تو سہی، دیس کے کن کن حصوں میں اناتھ آلیہ اور بدھوا آشرم ہیں۔ آج کا دن میرے لئے سُکھ اور سوبھاگیہ کا ہے کہ میں اودھ کے تمام تعلقہ داروں سے دانی مہاراجہ کے بھون میں ایک بدھوا آشرم کھولنے کی اپیل کرتی ہوں، آپ لوگوں کا یہی پرمارتھ دیکھنے کے لئے شاید میں جیتی رہ گئی۔"

پاپی کا دل سب سے پہلے وجد میں آتا ہے، کنور کی رسوائی میں دمڑی بابو نے خاص حصہ لیا تھا ہمدردی کے آنسو بہاتے ہوئے نعرہ لگایا "کنور مولچند کی جے۔"

آسمان پر تارے کان لگائے سن رہے تھے، انھوں نے آواز بازگشت سے جواب دیا "کنور مولچند کی جے۔"

دمڑی بابو نے فرمایا: "بھائیو! کملا دیبی کی اپیل ملک کی ودھواؤں کی اپیل ہے۔ اب کان میں تیل ڈالکر بیٹھ رہنے کا وقت نہیں ہے، میرے خیال سے ایک ودھوا آشرم کنور مولچند کے نام پر اودھ کے تعلقہ داروں کی طرف سے بنایا جائے۔ کیونکہ اس کار خیر کا خیال سب سے پہلے انھیں کے دل میں آیا ہے، اس کے لئے میں وہ رقم کافی سمجھتا ہوں جو آج نذر میں آئی ہے، ایک طرح سے تو وہ کنور صاحب ہی کی ہے۔"

کرشن نگر کے رائے صاحب نے جیب سے پانچسو کے نوٹ نکالکر کہنے لگے "یہ ودیا دھری کے انعام کو لایا تھا اب آشرم کا باغ اسی رقم سے بنیگا اسیطرح اور سب صاحبوں نے دل کھولکر وعدے کئے۔ آوا کے راؤ صاحب نے کل رقم کا حساب لگایا تو چالیس ہزار سے زیادہ کا چندہ ہو گیا۔

مجلس برخاست ہوتے ہی لوگ اُس ودھوا کو اپنانے والے رشی کا چرن چھونے لگے، کنور صاحب نے دوڑ کر دمڑی بابو کو گلے لگا لیا۔

اگلے سال ہرشچندر بھون کے سامنے "مولچند ودھوا آشرم" نظر آنے لگا۔ ہال میں سنگ مرمر پر یہ کتبہ لکھا تھا:-

"جوگی وہ نہیں جو اپنے سُکھ کے لئے سنسار چھوڑ دے۔ جوگی وہ ہے جو دوسروں کی دست گیری کے لئے اپنا جوگ چھوڑ دے۔" دمڑی بابو

نوحۂ طفلی

(از مسٹر کیلاش ورما شائق ہنگامی)

وہ دن بھی کیا عجب تھے کیا خوب زندگی تھی
خوگردۂ طرب تھا ہر بات میں خوشی تھی
دل میں جو آرزو تھی گلشن کی اک کلی تھی
دنیائے عیش و راحت میرے لئے بنی تھی

دریائے شادمانی رگ رگ میں موجزن تھا
کتنی لطافتوں سے شاداب یہ چمن تھا

اب تک نہیں مٹے ہیں نقش و نگارِ طفلی
مَیں خود بنا ہوا ہوں اک یادگارِ طفلی
شوخی وہی ہے اب تک جو تھی بہارِ طفلی
بس ہو تو زندگی کو کردوں نثارِ طفلی

قسمت میں میری کب ہے ممکن وصالِ طفلی
شاید بہشت میں پھر دیکھوں جمالِ طفلی

ہر سُو نئے مناظر جلوے دکھا رہے ہیں
اندازِ نو نو سے دل کو لبھا رہے ہیں
دیکھو تو کیسے کیسے فتنے اُٹھا رہے ہیں
رہ رہ کے سب کے سب کیوں مجکو رجھا رہے ہیں

وہ دل نہیں رہا ہے وہ ولولے نہیں ہیں
جی پست ہو گیا ہے وہ حوصلے نہیں ہیں

ممنون ہوں جو طفلی جلوہ مجھے دکھا دے
مدہوش مجکو کردے بیخود مجھے بنا دے
بھولے ہوئے فسانے کانوں کو پھر سنا دے
اک کیف بیخودی ہو وہ مے مجھے پلا دے

تیرے بغیر اب وہ رونق کہاں چمن میں
ہاں اوس پڑ گئی ہے اس گلشنِ کہن میں

میری فغاں میں شاید کوئی اثر نہیں ہے
وہ شام اب نہیں ہے اب وہ سحر نہیں ہے
پہلو میں میرے وہ دل اور وہ جگر نہیں ہے
میں کون ہوں کہاں ہوں مطلق خبر نہیں ہے

طفلی کی حد سے شاید آگے نکل گیا ہوں
دنیا سمجھ رہی ہے اب میں سنبھل گیا ہوں

اے میری پیاری طفلی اے نو بہار ہستی لے روح زندگانی اے سازگار ہستی
او غمگسار ہستی اور رازدار ہستی بے تیرے خود ہی ہستی مجکو ہے بار ہستی

طفلی تو جا چکی تھی جاتی ہے اب جوانی
مٹ کر رہے گی آخر ہستی کی بھی نشانی

کانوں میں میرے کس کی آواز آرہی ہے بنکر جو ایک نغمہ دل میں سما رہی ہے
طفلی کی یاد شاید مجکو دلا رہی ہے افسانہائے دلکش شائق سنا رہی ہے

آئے گا اب نہ لیکن گذرا ہوا زمانہ
مٹ کر رہے گی یہ بھی تخئیل شاعرانہ

صبح بہار

(از جناب عبدالعزیز فطرت)

(۱)

عنوانِ فسانۂ مسرت ہے تو سامانِ ہزار لطف و بہجت ہے تو
جذبات میں طوفان ہوا پھر برپا اے صبحِ بہار کیا قیامت ہے تو

(۲)

پھر چاروں طرف پھیل گئی نکہت گل پھر محفلِ گل ہے اور نوائے بلبل
لے ساقیِ حسن تجھ کو موسم کی قسم مجھ راندۂ قسمت کو بھی اک ساغرِ مل

(۳)

کیا تجھ کو دکھا دوں دلِ پُرخوں اپنا؟ افسانۂ اندوہ سنا دوں اپنا؟
جا اے سحرِ نشاط! میں غمگیں ہوں پڑھ اور کسی پہ جا کے افسوں اپنا

ستم رسیدہ

(از جناب عبدالوحید صاحب فاروقی۔ پرتاب گڈھ)

"جلدی کرو"۔ میں نے ملازم سے کھانوں کی فہرست واپس کرکے کہا۔

لاہور میں گوکہ یہ ایک معمولی ہوٹل تھا مگر انتظام اور سلیقہ مندی بالکل یورپین تہذیب کے موافق تھی۔ دیواروں پر جا بجا عمدہ رنگین تصویریں خوشنما چوکھٹوں میں آویزاں تھیں۔ صفائی حددرجہ کی تھی، کمرے میں جس میز پر میں بیٹھا تھا اُس کے علاوہ چار میزیں اور تھیں لیکن سب کی سب خالی یہ کمرہ زینہ سے قریب تھا اور دو کھڑکیاں نیچے سڑک کی جانب کھُلتی تھیں۔ برابر والے کمروں سے قہقہوں اور باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے ہوٹل کے ملازم کا تقریباً دس منٹ انتظار کیا۔

کمرے کے باہر سے پیروں کی چاپ سُنائی دی، آواز رُک رُک کر آرہی تھی، آنیوالا قدم اُٹھانے میں نہایت محتاط معلوم ہوتا تھا، شاید نوکر کھانا لارہا تھا، آواز دروازے کے بالکل قریب آگئی "بہت دیر لگائی" کے الفاظ میری زبان پر آکر رُک گئے کیونکہ آنیوالا بجائے ملازم کے ایک خوبصورت دُبلا اور مصیبت زدہ نوجوان تھا۔ چہرہ پر اُداسی چھائی ہوئی تھی، آنکھیں حددرجہ دماغی پریشانی اور اندرونی تفکرات کا پتہ دے رہی تھیں، آنسو جاری تو نہ تھے مگر آنکھوں میں کچھ وہ کیفیت نمایاں تھی جو کثرت گریہ سے آنسوؤں کے خشک ہوجانے پر اکثر ہوجاتی ہے۔ اُس کی نگاہ کبھی میرے چہرہ پر پڑتی تھی اور کبھی کمرے کی مختصر فضا میں ایک غیر معنوی انداز سے اُٹھ اُٹھ کر رہ جاتی تھی داہنے ہاتھ میں کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی شئے تھی اور دوسرا ہاتھ کمال بے پروائی اور خود فراموشی کی حالت میں لٹک رہا تھا۔ قدم جیسا کہ آواز سے ظاہر تھا نہایت احتیاط سے اُٹھ رہے تھے، جو ایک ایسے جسم کو سنبھال رہے تھے جو شاید ان کے قابو میں نہ تھا۔ نوجوان میز کے برابر میرے رُوبرو کرسی کھینچکر بیٹھ گیا اور ایک سیاہ دُوربین کاغذ سے نکالکر میرے سامنے میز پر رکھدی، دُوربین بالکل نئی تھی، ابھی کسی جگہ پالش پر بھی نشان نہ پڑا تھا، میں نے اُس کے چہرہ پر نظر ڈالی۔

"کیا آپ اسے خرید سکتے ہیں؟" اُس کے منہ سے یہ سوال کچھ عجیب کشمکش کے بعد نکلا۔

"کیا آپ نے اس کو کبھی استعمال نہیں کیا یہ تو بالکل نئی ہے" مَیں نے سوال کیا۔

"جی ہاں، صرف ایک دفعہ خریدتے وقت دوکان پر دیکھا تھا اور دوسری بار مکان پر اُٹھا کر آنکھوں سے لگایا تھا اور پھر کاغذ میں۔۔۔۔۔۔" اس کی آواز رک گئی اور آنسو کے دو قطرے میز پر ٹپک پڑے۔

"آپ کو شاید کوئی صدمۂ عظیم گذرا ہے، کیا آپ مجھ سے اپنی مصیبت بیان کر سکتے ہیں؟"

"نہیں" اُس نے ضبط گریہ کے بعد کہا "مجھے یقین ہے کہ آپ کو میری داستان سُنکر سخت صدمہ ہوگا، میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا"۔

"نہیں آپ ضرور بیان کیجئے، شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں"

"آپ کی اتنی امداد کافی ہے کہ آپ یہ دُوربین خرید لیں"۔

"دُوربین تو خرید ہی لونگا مگر آپ اپنی داستان ضرور کہیئے"۔

"اچھا تو سُنئیے"۔

دس یوم پیشتر میں اپنے ایک دہلوی دوست کے ہمراہ رہتا تھا۔ جو یہاں ایک چھوٹی سی کپڑے کی دوکان کا مالک ہے، میں مصوری کرتا ہوں آج سے قبل دسویں دن میرے دوست کے نام دہلی سے اُس کی والدہ کی علالت کا ایک تار آیا، ہم لوگ ایک ہوٹل میں کھانے پینے کا حساب رکھتے تھے، میرا دوست میرے لئے ایک ہفتہ کے لئے کھانے کے پیشگی دام ادا کرکے چلا گیا، اُس نے ایک ہفتہ میں واپس آجانے کا وعدہ کیا، کیونکہ اُسے یقین تھا کہ وہ اس سے زیادہ قیام نہ کریگا۔ جاتے وقت ہوٹل والے سے احتیاطاً یہ بھی تاکید کردی تھی کہ اگر وہ ایک ہفتہ میں واپس نہ آسکے تو بھی وہ میرے کھانے کا حساب جاری رکھے۔ وہ آکر سب ادا کر دیگا"۔

غرض اس کے چلے جانے پر ایک ہفتہ تو میں اسی ہوٹل میں کھاتا رہا۔ اِسی اثنا میں مَیں نے ایک تصویر بھی تیار کرلی لیکن دوسرے ہفتہ میں اُس نے خلاف وعدہ میرا حساب جاری رکھنے سے صاف انکار کردیا۔ اب میرا کوئی نہ تھا۔ میں نے تصویر فروخت کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔

صبح دس بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں کرسی پر کھڑکی کھول کر بیٹھا تھا کہ دفعتاً میری نظر ایک سامنے کی کھڑکی پر پڑی جو ہمیشہ بند رہتی تھی اور جس پر اگر میرا خیال صحیح ہے تو دو یوم قبل "ٹولیٹ" یعنی کرایہ پر خالی ہے، کی تختی لٹک رہی تھی۔ یہ سوچکر میں نے دوبارہ کھڑکی پر نظر ڈالی، اُف! وہ تو پہلے سے بھی زیادہ بھلی معلوم ہوئی۔ ایک خوبصورت لڑکی دونوں تختوں کو ہاتھ سے پکڑے کھڑی ہوئی میری طرف ٹکٹکی

باندھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا ملکوتی حُسن میرے دل کو تسخیر کرنے کے لئے کسی حربہ کا محتاج نہ تھا۔ عشق کی بجلی نے میرے جسم میں ایک پُر کیف رعشہ پیدا کر دیا!

اس کا داہنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکلا اور اُس نے ایک سُرخ رومال ہلایا، پھر کھڑکی بند کرتی ہوئی غائب ہو گئی، اور میں مبہوت ہو کر اُس جانب تکتا رہ گیا۔

شام کو چھ بجے میں پھر کھڑکی کے سامنے بیٹھا، کوئی بیس منٹ انتظار کے بعد کھڑکی پھر کھُلی، اور ایک بار وہ پری جمال پھر میرے روبرو تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید کاغذ تھا جس کو اُس نے سلاخوں میں پھنسا دیا اور پھر میری طرف تکتی رہی۔ کاغذ پر کچھ لکھا تھا لیکن مجھ سے پڑھا نہ جاتا تھا کیونکہ اس وقت کافی اندھیرا ہو چلا تھا۔ لڑکی نے جھک کر کاغذ کی طرف دیکھا اور چلی گئی۔ میں اسی سوچ میں آدھ گھنٹہ تک بیٹھا رہا کہ کیونکر اس تحریر کو پڑھوں، اور اس کے بعد شاید کرسی ہی پر پڑے پڑے سو گیا مجھکو وہی صورت پھر بھی دکھلائی دیتی رہی، کبھی ہنستی اور مسکراتی.... رات کے اندھیرے میں اتنی صفائی سے دیکھنا ناممکن ہے اس لئے شاید میں سو ہی گیا تھا!"

"آئیے کھانا کھا لیجئے تو پھر باتیں کریں، آپ بہت بھوکے معلوم ہوتے ہیں اور نقاہت کی وجہ سے آپ کو ناطقہ پر بہت زور دینا پڑتا ہے۔"

"نہیں پہلے آپ دُوربین خرید لیں"

"اس کی کونسی جلدی ہے۔ کھانا تو کھا لیجئے۔"

"نہیں" نوجوان نے ایک کمزور آواز سے کہا۔

مجھے وہ سخت بھوکا معلوم ہو رہا تھا اس لئے اب ضد کرنا بے سود تھا۔ میں نے اس سے دام پوچھے۔

"دو سَو روپیہ کو خریدا ہے۔"

"دو سَو روپیہ.... دوربین کی حالت دیکھتے ہوئے بالکل ٹھیک دام تھے۔ اس کے علاوہ وہ جھوٹ بولتا ہوا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے دو سو روپیہ کے نوٹ اس کے سامنے رکھ دیئے۔"

"ہاں۔ اب کھاؤں گا۔"

بعد فراغت طعام اُس نے اس طرح سلسلہ جاری کیا:۔

"جس وقت میری آنکھ کھُلی تو اچھا خاصہ دن تھا۔ میں فوراً اُٹھا اور ابھی منہ ہاتھ دھو ہی رہا تھا کہ دروازہ پر دستک کی آواز آئی۔

"کون۔ صاحب!"

"دروازہ کھولو"

"اچھا" میں نے دروازہ کھولا۔ اور ایک صاحب اور اُن کی لیڈی کے لئے راستہ چھوڑ کر ایک جانب کو ہٹ گیا۔ دونوں نے کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے اس طرح گفتگو شروع کی:۔

"تمہارا کوئی پینٹنگ (Painting) تیار ہے۔"

"جی ہاں" مَیں نے جواب دیا، اور ساتھ ہی الماری سے تصویر نکالکر پیش کر دی۔

"گڈ (بہت اچھا)" صاحب بولا۔

"ریلی" (درحقیقت Really) اس کی میم نے کہا۔

"تم اس کا کیا پرائس (قیمت) لیگا؟"

"میں نے خود کوئی پینٹنگ (تصویر) اپنے ہاتھ سے نہیں بیچی، اس لئے مناسب قیمت نہیں بتا سکتا آپ خود کہہ دیں۔" میں نے انکساری سے کہا

"What do you say! تم کیا کہتے ہو؟" میم صاحب نے کہا۔

"ویل۔ ہم دو سو دیگا" صاحب بولا۔

"لے لیجئے" میں نے کہا۔

اُس نے دو سو روپئے میرے آگے گن دیئے اور تصویر لپیٹ کر چپراسی کے حوالے کی اور رخصت ہوا۔ اس کو رخصت کر کے میں فوراً جنرل مرچنٹ کی دوکان پر گیا اور پورے چار گھنٹے کی کوشش کے بعد دو سو پر راضی کر کے یہ دُوربین خریدی، اور بھاگتا ہوا مکان پہونچا، زینہ پر چڑھکر کھڑکی کا رُخ کیا، اور دُوربین کاغذ کے ٹکڑے پر لگا دی۔۔۔ آنسوؤں کے مسلسل قطرے اس کی آنکھوں سے میز پر گرنے لگے" آہ وہ مایوسی اور صدمہ کیونکر بیان کروں جو کاغذ کے اس مضمون نے مجھ پر پہونچایا۔۔۔"

"میری نجات کے فرشتے۔ میں ایک شریف گھر کی بدنصیب لڑکی ہوں، ایک بدمعاش مجھکو زبردستی اُٹھا لایا ہے جس نے مجھکو ایک دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کر ڈالا ہے۔ آج وہ کہیں گیا ہے اور نصف شب کے قریب آکر مجھے خریدار کے حوالے کر دیگا۔ آپ اس وقت سے پہلے آجائیے، باہر کی کنجی میں نیچے پھینک دونگی، آپ کھول کر مجھے کسی طرح بچا لیئے، ورنہ میں اپنی عصمت کی حفاظت خودکشی سے کرونگی۔ بیگناہ قیدی "زبیدہ"

ایک نوجوان لڑکی کی خودکشی۔۔۔ لاش رسّی کے پھندے میں لٹکی ہوئی پائی گئی، مکان میں دوسرا کوئی نہ تھا، پولیس تحقیقات میں سرگرم ہے۔" میں پڑھ ہی چکا تھا کہ ایک اخبار فروش کی آواز آئی۔

دُوربین کھڑکی پر رکھی اور میں کُرسی پر بیٹھ گیا، قریب آدھ گھنٹہ تک شاید میں بیہوش رہا، رسّی میں لٹکی ہوئی خوبصورت لاش نظروں کے سامنے گھومتی رہی، اس کے بعد صورت دھندلی پڑتی گئی اور میرے سامنے وہی کاغذ کا ٹکڑا تھا... اس کے بعد کھڑکی.... اور پھر دُوربین... اور میرا بیجان جسم کرسی پر.... !

مجھے ہوش آگیا۔

بھوک سے دماغ بیکار ہو رہا تھا، اس صدمہ نے اور نمک پاشی کی... بھوک کی بارود رکھی ہی تھی، اس میں اس سانحہ کی چنگاری آگری۔ دُوربین اُٹھا کر سیدھا دوکان پر پہونچا، لیکن اُس نے واپس لینے سے انکار کیا۔

دل کو ایک اور ٹھیس لگی، اور میرے قدم خود بخود ایک طرف کو اُٹھنے لگے، دل و دماغ بیکار تھا ہی میں قدموں ہی کی رہنمائی پر چلنے لگا۔ اِس ہوٹل میں آپ کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا.... پھر آپ کو معلوم ہی ہے کہ کیا ہوا، لیکن نہ مجھے اور نہ آپ کو یہ معلوم ہے کہ آئندہ کیا ہوگا، اور کہاں جاؤں گا اچھا خدا حافظ"۔

میں روکنے کے لئے اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں بہت تیزی سے زینے سے نیچے اُترا لیکن وہ سڑک کے مجمع میں غائب ہو چکا تھا۔

درحقیقت میں نے دُوربین خریدنے کے علاوہ اُس کی کوئی مدد نہ کی اور کر ہی کیا سکتا تھا جبکہ موت نے اس کی معشوقہ کو اس سے بچھاڑ ہی دیا تھا۔

دُعا

(از ٹیگور) (مترجمہ این - ڈی - ایم)

جہاں صاف دل ہو نہ خوف و خطر ہو
جہاں رہ کے آزاد اونچا ہی سر ہو

جہاں ودّیا وان جاری ہو ہر سو
صداقت کی آتی ہو ہر سمت سے بُو

جہاں "تیری" "میری" کا جھگڑا نہ ہووے
جہاں "میری بھومی" کا رگڑا نہ ہووے

جہاں کوششوں کی نہ کچھ انتہا ہو
کمال اپنا مقصد ہو اور مدعا ہو

جہاں شاملِ حال ہو عقلِ انساں
نہ کر دے اُسے عادتِ بد پریشاں

جہاں قول اور فعل میں رنگ تیرا
وسیع دائرے میں رہے ڈھنگ تیرا

[illegible]
بڑھے روز و شب سر قدم آگے آگے

تنقیدِ کتب

کمالِ داغ[1]

یہ فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے چار دیوانوں گلزارِ داغ، آفتابِ داغ، مہتابِ داغ اور یادگارِ داغ کا انتخاب ہے جسے فاضل محترم پروفیسر حامد حسن قادری (سینٹ جانس کالج آگرہ) نے وسیع مطالعہ کے بعد مع ایک فاضلانہ و نقادانہ مقدمہ کے جو ایکسو دس صفحات پر آیا ہے مرتب کیا۔ شعرا کے کلام کا انتخاب کرنیوالے عموماً اپنے ذوق کے مطابق اشعار منتخب کیا کرتے ہیں۔ اس لئے اسی مذاق کے لوگ اس انتخاب سے محظوظ ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ممنون ہیں کہ قادری صاحب نے اپنے انتخاب میں ہر قسم کے مذاق سلیم کا لحاظ رکھا ہے۔ البتہ بازاری اور عامیانہ مذاق کے تمام اشعار نظر انداز کر دئے ہیں، اس کے علاوہ لکھنوی رنگ میں ڈوبے ہوئے اشعار کو بھی زیادہ جگہ نہیں دی گئی ہے۔ لیکن اس انتخاب میں اصلی چیز فاضل مؤلف کا قابل قدر مقدمہ ہے جسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں اردو غزلگوئی پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، دوسرے جزو میں تغزل کے انقلاب کے اسباب سے بحث کی گئی ہے، آخر میں داغ کی غزلگوئی پر ریویو ہے۔ پہلے حصہ میں غزلگوئی کی تدریجی ترقی، دوسرے میں شعر اردو کی تخئیل کا ارتقا بیان کیا گیا ہے اور تیسرے حصہ میں حضرت داغ کی شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں داغ اور امیر کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ بہر حال کتاب بہت دلچسپ اور قابل قدر ہے۔

ریاضِ سخن[2]

رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کو جب ہز مجسٹی ملک معظم نے "پریوی کونسلر شپ" کے اعلیٰ اعزاز سے مشرف فرمایا تو اس خوشی کی تقریب میں دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول صاحب گلشن نے ۱۱۔ فروری ۱۹۳۴ء کو اپنے دولت خانہ "سرسوتی نواس" ۱۸ البرٹ روڈ الہ آباد میں ایک عالی شان بزم مشاعرہ منعقد فرمائی، جس کی صدارت آنریبل سر شاہ محمد سلیمان صاحب چیف جسٹس الہ آباد ہائیکورٹ

---

[1] قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ مصنف صاحب سے سینٹ جان کالج آگرہ کے پتہ سے طلب کی جا سکتی ہے۔

[2] مرتبہ "دھرم رتن" دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول صاحب گلشن رئیس لاہور۔ کتابت، طباعت دیدہ زیب و رنگین کاغذ سفید قیمتی، انگریزی وضع کی خوبصورت جلد، تقطیع ۲۹ × ۲۲ ضخامت ایکسو نوے صفحات۔ مرتب صاحب سے مل سکتی ہے۔

نے فرمائی تھی اور دُور دُور کے تقریباً اٹھاسی سخنوران نغز گو نے شریک ہو کر دادِ سخن گستری د
دیوان صاحب نے انھیں حضرات کی طرحی غزلیں حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کر کے کتابی صورت
انڈین پریس، الہ آباد سے شائع کر دی ہیں، اسی گلدستہ کا نام "ریاض سخن" ہے۔ بزم مشاعرہ، ارباب مشا
اور سر تیج بہادر سپرو کی تصویروں کے علاوہ ان کے متعلق مختلف تقریریں وغیرہ بھی اس میں د
کر دی گئی ہیں اور طرحی غزلیات کے علاوہ اس میں دو نادر چیزیں اور بھی ہیں (۱) یعنی سہاگن بیوہ
متعلق حضرت جوش ملیح آبادی اور (۲) حضرت ظریف لکھنوی کا شہر آشوب۔ موخر الذکر نظم میں موجود
کے شعراء پر جو کچھ تنقید کی گئی ہے وہ بہت سبق آموز ہے۔ ایک بند نمونتاً درج ہے:۔

اے عجائب خانۂ ہستی کی جنس بے بہا — عہد موجودہ کے شاعر واہ کیا کہنا ترا
تیری کثرت ہر جگہ مردم شماری سے سوا — تو فرشتہ ہے بشر کی شکل میں اس عہد کا

تجھ کو کچھ کھانے سے مطلب ہے نہ کچھ پینے سے کام
شعر کہہ کہہ کر سنانے اور نقطے چننے سے کام

بہر حال شائقین سخن کو گلشن صاحب کا بیحد ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس یادگار مشاعرہ کی غ
اور اس کے مکمل حالات کتابی صورت میں یکجا کر کے رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کے اعزاز کی ایک ا
یادگار قائم کر دی ہے۔

رموز کلام غالبؔ

مرزا غالبؔ دہلوی کے کلام کی جس قدر شرحیں شائع ہوئی ہیں آج تک کسی اردو شاعر کے
پر اس قدر توجہ نہیں دیگئی ہے۔ مبسوط شرحوں کے علاوہ بعض حضرات نے انگریزی اور اردو زبا نو
میں صرف پسندیدہ اشعار کی بھی شرحیں لکھی ہیں۔ بعض نے مرزا کے اشعار کی تخئیل کی تصویریں
بنا کر شائع کی ہیں۔ اسی قسم کی ایک مشکور کوشش یہ پانچ جزو کا چھوٹا سا رسالہ بھی ہے جس میں
مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری نے اپنے رنگ میں مرزا غالبؔ کے صرف سات مختلف اشع
کی شرح لکھی ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ شرح کیسی ہے اور بڑی بڑی شرحوں کے مقابلہ میں اس کی
ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" مثلاً فاضل شا
نے غالبؔ کے مندرجہ ذیل شعر کی شرح بیس صفحوں میں لکھی ہے ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

لہ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ ماہ تمام ۱۳ کورٹولہ اسٹریٹ۔ کلکتہ۔

اس شعر سے جہانتک ہم سمجھے ہیں یہ شعر مرزا کے جذبۂ رشک کی ایک عمدہ اور دلپذیر تصویر ہے۔ مگر جہانتک مولانا محمد اسحاق صاحب سمجھے ہیں وہ ایک داستان طلسم ہوشربا ہے جو غالباً خود مرزا غالب کی بھی سمجھ میں نہ آئی ہوگی۔ کیونکہ اول تو مرزا کی تخئیل کا ٹیگور کی تخئیل سے مقابلہ کیا گیا ہے دوسرے اِدھر اُدھر کے قصے فضول بھر دئے گئے ہیں، ہم تو یہی کہیں گے کہ موجودہ کاروباری زمانہ میں جبکہ ہر شخص کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے صرف ایک شعر سمجھنے کے لئے اتنی لمبی چوڑی شرح کی ضرورت نہ تھی، ہرچہ گیرید مختصر گیرید پر عمل کرنا چاہیئے تھا۔

سالنامہ ساقی ۱۹۳۵ء

دہلی کا رسالہ "ساقی" میدان ترقی میں روزافزوں قدم بڑھا رہا ہے۔ ۳۵ء کا سالنامہ اپنے مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے قابل تعریف بلکہ بہت سے دیگر سالناموں سے بہتر ہے۔ اگرچہ تصاویر میں بعض دوسرے پرچوں کو فوقیت حاصل ہے لیکن معنوی خوبیوں کے لحاظ سے رسالہ کے اڈیٹر شاہد احمد صاحب بی۔ اے (آنرز) کی کوشش بہت قابل داد ہے۔ اس سالنامہ میں پنڈت برجموہن ناتھ دتاتریہ کیفی دہلوی، خواجہ عشرت لکھنوی کے مضامین اور حضرات جوش ملیح آبادی اور حضرت امجد حیدرآبادی کی نظمیں خوب ہیں۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ "ساقی" دہلی۔

عقد ثریا[1]

یہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا تالیف کردہ تذکرہ شعراء ہے اور اس میں ۱۶۳ فارسی گو شاعروں کے حالات بترتیب حروف تہجی درج ہیں۔ لیکن اس میں کسی شاعر کے کلام کا انتخاب شامل نہیں ہے۔ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ شروع میں مولوی عبدالحق صاحب کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں تذکرہ پر تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ ضخامت چھ جزو۔

تذکرہ گلزار ابراہیم مع تذکرہ گلشن ہند[2]

یہ شعراء اردو کا ایک قابل قدر اور نایاب تذکرہ ہے جسے وارن ہسٹنگز کے زمانہ میں علی ابراہیم خاں صاحب علی ساکن پٹنہ نے ۱۱۹۸ھ میں لکھا تھا۔ اسی تذکرہ کو مرزا علی لطف نے اردو کا جامہ پہنا کر اس کا نام "تذکرہ گلشن ہند" رکھا۔ اب ان دونوں تذکروں کو ڈاکٹر سید محی الدین

---

[1] قیمت مجلد ایک روپیہ دو آنہ۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

[2] لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ حجم ۳۹۶ صفحات۔ قیمت مجلد ڈھائی روپیہ۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔

قادری ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی۔پروفیسر اُردو عثمانیہ یونیورسٹی نے مرتب کرکے مفید حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔

اگرچہ مرزا علی لطف نے تذکرہ گلشن ہند کی بنیاد تذکرہ گلشن ابراہیم پر قائم کی تھی لیکن تمام شعراء کو نہیں لیا تھا اور بعض بعض شاعروں کے حالات میں اپنی ذاتی معلومات سے اضافہ بھی کیا تھا اس لئے دونوں کتابوں کی حیثیت جداگانہ ہے۔ درحقیقت ایک تذکرہ دوسرے کا تکملہ ہے، اس لئے دونوں تذکروں کو یکجائی شائع کرنے کی بڑی ضرورت تھی جو انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کی توجہ سے پوری ہوگئی ہے۔ اس میں شعراء کے سوانح حیات بہ ترتیب حروف تہجی درج کئے گئے ہیں ہر شاعر کے متعلق پہلے گلشن ابراہیم کی عبارت ہے، اس کے بعد جو اضافہ مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں کیا ہے وہ درج کردیا گیا ہے۔ تذکرہ گلزار ابراہیم کی بہت بڑی کمی یہ ہے کہ بعض شعراء کا حال درج کرکے انتخاب کلام کے بجائے صرف اُن کے اشعار کی تعداد لکھدی گئی ہے اشعار درج نہیں کئے مثلاً:-

"آہ۔ آہ۔ اسمش میر مہدی۔ خلف الصدق میر سید محمد سوز تخلص شاگرد والد ماجد خویش است۔ ۱۱ شعر"

اس لئے یہ تذکرہ بہت حد تک تشنہ رہ گیا ہے۔ اس کے لئے بھی مولوی عبدالحق صاحب بی اے نے ایک فاضلانہ و محققانہ مقدمہ لکھا ہے جس سے کتاب کے حسن و قبح پر بہت بڑی روشنی پڑتی ہے۔

پرویں و ثریا

یہ مختصر سی کتاب بلجیم کے مشہور و معروف ادیب مورس میٹرلنک کے "اگلیے وین اینڈ سیلے سٹ" نامی ڈرامہ کا دلچسپ اُردو ترجمہ ہے، جسے دہلی کے ہونہار نوجوان ادیب شاہد احمد اور فضل حق قریشی صاحبان نے اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ شروع میں سید ممتاز حسین صاحب دہلوی بی۔اے نے "اعماق قلب" سے ترکیبیں نکالکر "ڈرامائی نگارش" کی دو صفحوں کی "تقریب" میں تعریف کی ہے مسٹر شاہد احمد مارس میٹرلنک کے دلدادہ ہیں، اس سے پہلے وہ "نرگس جال" کے نام سے میٹرلنک کے دوسرے ڈرامہ کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ یہ ترجمہ اگرچہ بقول مترجمین "شستہ و رفتہ" ہے، لیکن بعض جگہ ثقالت سے خالی نہیں ہے، کہیں کہیں محاورات کا غلط استعمال بھی ہوگیا ہے مثلاً "میں اچھی طرح محسوس کرتی ہوں کہ تم بالکل ایک بھائی کی طرح مجھ سے ملاقات کروگے" میں ملاقات کے بجائے "ملا" کافی تھا۔ کتاب دلچسپ ہے۔

---

۵ لکھائی چھپائی دیدہ زیب، کاغذ عمدہ، ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۶ جزو، قیمت مجلد ایک روپیہ ملنے کا پتہ: ساقی بکڈپو۔ دہلی

اُردو میں ڈرامہ نگاری

مصنفہ سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی یہ دلچسپ و محققانہ تصنیف پندرہ مختلف
اب پر مشتمل ہے، جن میں ڈرامہ کی ابتدا، ڈرامہ کی قسموں، ڈرامہ اور تھیٹر، اُردو ڈرامہ کی
پیدائش، اندر سبھا، قدیم اُردو ڈراموں کی بعض اہم خصوصیات، طرز قدیم کے علمبردار، شیکسپیر کے
دوسرے قدیم ترجموں، قدیم ناٹک کمپنیوں، طرز جدید کے پیشروؤں، طرز جدید کے پیروؤں، اُردو
ڈرامہ کے مستقبل سے بحث کی گئی ہے اور "فلم اور اُردو ڈرامہ" کے عنوان سے متحرک و متکلم
تصاویر پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب مفید اور پراز معلومات ہے جن حضرات
کی طبائع کو تحقیقات سے لگاؤ ہے اُن کے لئے اس کا مطالعہ بہت دلچسپ ہوگا کتاب کی
زبان اگرچہ صاف اور سلیس ہے مگر کہیں کہیں غیر مانوس عربی و فارسی الفاظ استعمال ہو گئے ہیں
جن سے پرہیز لازم تھا مثلاً ارتسامات، اکتسابِ کیف، "سبز گرہ"۔ اس کے علاوہ انگریزی الفاظ
اور انگریزی ترکیبیں بہت زیادتی کے ساتھ بغیر مناسب ترجمہ استعمال کی گئی ہیں۔ ان جزوی
نقائص کے علاوہ کتاب قابل قدر ہے

ماہِ تمام

محمد اسحاق صاحب امرتسری کی ادارت میں کلکتہ سے "ماہ تمام" نامی اُردو کا ایک ادبی ماہوار رسالہ شائع
ہونا شروع ہوا ہے تین پرچے علحدہ علحدہ نکلنے کے بعد چوتھا پرچہ اپریل و مئی کا یکجائی شائع ہوا ہے۔ پنجاب کے رسالوں
میں جو خصوصیات عام ہیں وہی اس رسالہ میں بھی موجود ہیں رنگین و سادہ تصویروں سے پرچہ میں دلچسپی و دلآویزی
پیدا کرنیکی کوشش کیجاتی ہے قیمت سالانہ تین روپیہ۔ دفتر ماہ تمام واقع ۵۲ کولو ٹولہ اسٹریٹ کلکتہ سے طلب کیا جائے

آہ کے سنو شعر

پنڈت برج بہادر ایم۔ اے گولڈ میڈلسٹ نے سید محمد صفدر صاحب آہ سیتاپوری کے سنو منتخب اشعار کا
یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع پر شائع کیا ہے جس میں آہ صاحب کی تصویر بھی ہے لیکن افسوس ہے کہ چھپائی کی خرابیوں
کے باعث اس مجموعہ کی دلکشی کو سخت صدمہ پہونچا ہے۔ آہ صاحب ایک پختہ مشق اور پُر گو شاعر ہیں، اردو اور
فارسی دونوں میں کہتے ہیں۔ مجموعہ کے شروع میں چند مشہور شعرا کی تحریروں کا عکس بھی ہے قیمت چار آنہ
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی یا جعفری بکڈپو سیتاپور۔

حجم ۲۰۰ صفحات تقطیع چھوٹی قیمت مجلد دو روپیہ لکھائی چھپائی معمولی ملنے کا پتہ: آرکیڈیا بوز ایجنسی اندرون لودلی سشاہ
قادر کوٹلہ حیدرآباد دکن

دُولارے دُوہاولی

(از مسٹر اقبال ورما سحرؔ ہتگامی)

ناگری پرچارنی سبھا بنارس کا ایک جلسہ پنڈت مہابیر پرشاد صاحب دویدی ایڈیٹر "سرسوتی" کی علمی خدمات کے اعتراف میں مئی ۱۹۳۳ء میں بنارس میں راجہ ویر سنگھ دیو والی ریاست اوڑچھا کی صدارت میں ہوا تھا اُس میں راجہ صاحب موصوف نے دو ہزار روپیہ کا ایک سالانہ ادبی انعام دینے کا اعلان فرمایا تھا۔ چنانچہ امسال یہ انعام پنڈت دولارے لال بھارگو کو اُنکی "دولارے دوہاولی" نامی برج بھاشا کی کتاب پر دیا گیا ہے

میں بھارگو جی سے ۱۹۲۲ء سے واقف ہوں جب اُنھوں نے اپنا مشہور رسالہ "مادھوری" جاری کیا تھا مجھے ان سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوا مگر اُنھوں نے نہ کبھی خود کو شاعر ہی ظاہر کیا اور نہ اپنا کلام ہی سنایا۔ البتہ اس طرف کبھی کبھی ہندی رسالوں میں اُن کا ایک آدھ دوہا نظر آجاتا تھا جس سے اُن کے ذوق شاعری کا پتہ چلتا تھا مگر دولارے دوہاولی نے اُن کے شاعرانہ کمال کو روز روشن کی طرح سب پر ظاہر کر دیا۔ اس کتاب میں دو سو آٹھ دوہے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد مجھے اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بھارگو جی کو محض شاعری کا شوق ہی نہیں ہے بلکہ وہ اس فن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، اُن کے کلام کی پختگی پر کہنہ مشق استادوں کو بھی رشک ہو سکتا ہے، گو اُنھوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے پُرانی ہندی (برج بھاشا) ہی کو پسند کیا ہے۔ واقعی شاعرانہ اعتبار سے پُرانی ہندی میں سُور۔ تلسی۔ کیشو۔ بہاری۔ بھوشن وغیرہ نے جو کمالات دکھائے ہیں اُس کے لئے نئی ہندی کے سخنوران کو ابھی ایک مدت درکار ہوگی بہرحال بھارگو جی نے اپنی دوہاولی کے ذریعہ پُرانے ہندی شاعروں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ کئی کئی دوہوں کے ذریعہ ایک ہی موضوع کی مختلف طریقوں پر صراحت کی گئی ہے۔ پُرانی ہندی کی شاعری فی الجملہ عشقیہ شاعری ہے۔ دوہاولی میں بھی یہی بات ہے، مگر ٹھیک اُسی حد تک کہ زیادہ سے زیادہ تغزل کو فوقیت حاصل ہو گئی ہے شاعر نے اس امر کا بھی خیال رکھا ہے کہ عامیانہ طرز بیان سے تغزل کی شان میں بٹہ نہ لگنے پائے بہرحال بھارگو جی نے اپنے دوہوں میں بہت سی ایسی باتیں رکھ ڈالی ہیں جن سے کلام میں خاصی جدت پیدا ہو گئی ہے

پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ مگر شاعرانہ اسلوب کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا۔
اِس کتاب میں اچھوت اُدّھار پر بھی کئی دوہے ملتے ہیں

रही अछूतोद्धार नद छुआ छूत निय डूब
सास्वन को तिनको गहन क्रान्ति भंवर सों ऊब

الہ آباد میں اتحادی کانفرنس کو ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ایک دوہا اس کے متعلق بھی ہے۔

محاسنِ ظاہری کے لحاظ سے بھی یہ کتاب بہت دلفریب چھپی ہے، مصنف اور اُن کے والد ماجد کی تصاویر کے علاوہ اس میں دس رنگین تصویریں ہیں جو موضوع کے اعتبار سے خواہ کلیتاً موزوں نہ کہی جاسکیں مگر خوشنمائی کے اعتبار سے بہت قابل تعریف ہیں۔ دبیز کاغذ کے بڑے صفحوں پر یہ کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی گئی ہے۔ ہر صفحہ پر صرف تین دوہے ہیں جو بڑے ٹائپ میں چھپے ہیں، اس طرح دو سو آٹھ دوہے بہتّر صفحوں پر درج ہیں۔

شروع میں پنڈت لوکناتھ اوویدی کا لکھا ہوا ۲۰ صفحوں کا دیباچہ ہے جس میں ہندی شاعری کے متعلق بہت سی باتوں کا ذکر ہے مگر ان باتوں کا نفسِ مضمون سے کوئی سیدھا لگاؤ نہیں اور دیباچہ مذکور ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ یہاں ایک خاص بات کا ذکر بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ دیباچہ کے صفحہ ۴۴ و ۴۵ پر کی تقریباً پچیس تیس سطریں میرے اُس ہندی مضمون سے محض برائے نام تصرف کے ساتھ بلا کسی حوالہ کے نقل ہو گئی ہیں جو شاعری میں تغزل" کے عنوان سے مارچ ۱۹۳۳ء کے ہندی رسالہ "سرسوتی" میں چھپا تھا۔

کتاب کے آخر میں ہندی کے کتنے ہی نامور شاعروں اور ادیبوں کی تقریظیں درج ہیں جن میں رائے بہادر لالہ سیتارام میتھلی شرن جی گپت، پنڈت اجودھیا سنگھ اُپادھیائے، شری سمترانندن پنت۔ رائے بہادر پنڈت شکدیو بہاری مشر، پروفیسر رام داس گوڑ وغیرہ کے نام نامی بھی نظر آرہے ہیں۔

بہرحال کتاب قابل قدر ہے اور ڈھائی روپیہ قیمت پر مصنف سے لکھنؤ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

رُباعی

(از جناب بسمل الہ آبادی)

مزاملاپ کا دل سے جو دل ملے تو ملے
بندھی کلی نہیں کھلتی کلی کھلے تو ملے
بڑھا کے رسم گھٹائیں یہ غیر ممکن ہے
کسی سے حضرت بسمل اگر ملے تو ملے

گلدستۂ عشرت

۲۹- اپریل ۲۵ء کو ایڈیٹر زمانہ کے چھوٹے فرزند برج نراین نگم سلمہٗ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جھانسی کی شادی خانہ آبادی کماری بملا دختر نیک اختر رائے بہادر کپتان کے۔ ایس۔ نگم کے ساتھ لکھنؤ میں ہوئی۔ برات میں اصحاب برادری کے علاوہ اکثر احباب بھی کانپور لکھنؤ و دیگر مقامات سے تشریف لائے تھے۔ بعض شعرائے کرام نے اس تقریب مبارک پر سہرے بھی مرحمت فرمائے ہیں چنانچہ ہم اس نمبر میں بعض سہرے تبرکاً ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ امید کہ شاعرانہ حیثیت سے بھی ان شگفتہ سہروں کی قدر کیجائیگی۔ راقم الحروف کے دل پر احباب کی اس عنایت و محبت کا جو گہرا اثر پڑا ہے اس کا اظہار کسی رسمی شکریہ سے ناممکن ہے۔

جناب سیماب اور مولانا کاؔم دونوں کے بعض اشعار میں جو توارد ہو گیا ہے اُسے حسن اتفاق سمجھنا چاہیئے۔ عجیب بات ہے کہ جس روز کاؔم صاحب نے اپنا سہرا مکمل کیا ہے اُسی کے دوسرے دن سیماب صاحب کا سہرا آگرہ سے موصول ہوا۔ بہرحال دونوں صاحبوں نے اپنے اپنے طور پر فکر سخن کر کے داد سخنوری دی ہے۔

ایڈیٹر

(۱)
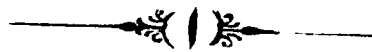
از حضرت سیماب اکبرآبادی

برج سے لائی ہے جو گوندھ کے مالن سہرا
باندھے بیٹھے ہیں وہی برج نراین سہرا

گومتی آج ہم آغوش ہوئی گنگا سے
بن گیا آبروئے عیش کا درپن سہرا

رعبِ نوشاہ پھر اُس پر یہ حجاب رنگیں
جوشِ جلوہ سے ہے چلمن پسِ چلمن سہرا

برہمن جپتے ہیں آنند کے اشلوک اس پر
پھول مالا نہیں ہے علیشؔ کی سُمرن سہرا

پھول تھے جتنے شگفتہ وہ کھلے جاتے ہیں
جانِ گلشن ہے کہ ہے حاصلِ گلشن سہرا

ہے نگم فیملی کا ایک جوان زینتِ بزم
رام۔ راج۔ اور دیا کا ہے مزیّن سہرا

کانپور آج سر افرازہے اس بہجت سے
اُس کے فرزند کے سر پر ہے یہ روشن سہرا

نذر کیا کیجیئے سیماب کہ ہے عجلت میں
موجِ افکار کی اک جنبشِ دامن سہرا

(۲)

(از جناب محمد یعقوب خان صاحب نصا کلام بی۔اے)

برج سے گوپیاں لائی ہیں سجا کر سہرا
کہ مرے برج نراین کے بندھے سر سہرا

ہر لب غنچہ پہ نعرہ ہے "سری کرشن کی جے!"
پریم کا دیوتا گویا ہے سراسر سہرا

بلبلیں خلد بہ نغمہ ہیں، چمن جانِ بہار
ایسے ماحول سے آیا ہے یہ بنکر سہرا

سلکِ گوہر کہوں یا عقدِ ثریا لکھوں
میرے نزدیک تو ان سے بھی ہے بڑھکر سہرا

جسکا ہر پھول گندھا ہے عمل حُب پڑھکر
ایسا نادر کسے ہوتا ہے میسّر سہرا

حُسن اور عشق کی میزان میں جو تولا اسکو
دونوں پلّوں میں نظر آیا برابر سہرا

خندۂ گل کی قسم، نغمۂ بلبل کی قسم
کِھلتا ہے برج نراین ترے منھ پر سہرا

یہ چمک اور دمک پھولوں میں کب ممکن تھی
ہر لڑی میں ہے لئے معدنِ گوہر سہرا

تیرے الفاظ میں ہے نکہتِ گلہائے خلوص
اسی باعث ہے کلام اتنا معطّر سہرا

(۳)

(از شاعرِ نازک خیال جناب محشر لکھنوی)

مسرّتوں کا نہ کیوں ہو بیامبر سہرا
ہوا ہے برج نراین کے زیبِ سر سہرا

ہر ایک خوش ہے کہ دولھا دلھن کے پھول کھِلے
یہ خاندان میں شادی کی ہے خبر سہرا

خوشی کا دور ہوا سمدھیانے والوں میں
کہیں یہ دل ہے کسی جا پہ ہے جگر سہرا

بلند ہو گیا آوازۂ مبارک باد
کہ آیا بزم میں دولھا جو باندھکر سہرا

چمن میں بلبلوں نے بزم میں حسینوں نے
اتر میں ڈوب کے گایا ہے رات بھر سہرا

خوشا بحال کہ دولھا ہے نورِ چشم نگم
دمِ نظارہ ہوا سرمۂ نظر سہرا

لڑی ہیں نظریں کہ دیکھیں جمالِ دولھا کا
دکھا رہا ہے سرِ بزم یہ اثر سہرا

فریفتہ ہوئے جاتے ہیں دیکھنے والے
کسی حسین کا ہے جنبشِ نظر سہرا

ادب سے آتے ہی اقبال نے بلائیں لیں
یہ کون آیا ہے محفل میں باندھکر سہرا

ہر ایک شعر سے محشر ہوئی ہے روشن بزم
لکھا ہے تو نے یہ مجموعۂ گہر سہرا

عالمِ نسواں

مجلس اقوام میں عورتیں قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہیں چنانچہ تخفیف قوائے جنگ کے سلسلہ میں جو کانفرنسیں جنیوا میں مقرر ہوئی تھیں ان میں پانچ ملکوں کی عورتیں بطور ڈیلیگیٹ شریک ہوئی تھیں۔ اگرچہ ان کانفرنسوں کا مدعا پورا نہیں ہوا لیکن بعض ضروری باتوں کے متعلق مفید کارروائی ہوئی مثلاً بردہ فروشی کا انسداد۔ بچوں کی حفاظت، افیون کی پیداوار اور استعمال میں کمی کی کوشش، غلامی اور بیگار کا انسداد۔ عوام کی صحت اور تندرستی کی تدابیر کے متعلق عورتوں نے تمام مہذب ممالک کی توجہ مبذول کرانے میں بڑی کوشش کی۔

سال مختتمہ ۱۵۔ اپریل ۱۹۳۲ء میں صوبہ پنجاب میں سال ماسبق کے مقابلے میں چھ ہزار دو سو اٹھتر لڑکیاں اسکولوں میں زیادہ داخل ہوئیں

لکھنؤ یونیورسٹی کی اکزکٹو کونسل نے لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط یا جداگانہ تعلیم پر غور و خوض کرنے کے بعد سفارش کی ہے کہ نو دس برس کی عمر تک مخلوط تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ پرائمری مدرسوں میں خواہ وہ لڑکوں ہی کے ہوں یا لڑکیوں کے جہاں تک ممکن ہو لایق استانیاں رکھی جائیں۔ گریجوئیٹ ہونے کے بعد تکمیل تعلیم کا انتظام مخلوط ہونا بہتر ہے۔ یہی رائے پٹنہ یونیورسٹی کی بھی ہے، اندھرا یونیورسٹی نے سکنڈری اور انٹرمیڈیٹ تعلیم کے لئے جداگانہ مگر اعلیٰ تعلیم کے لئے مخلوط تعلیم کی رائے دی ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی نے بھی صرف دس برس کی عمر تک مخلوط تعلیم کی رائے دی ہے، ڈھاکہ یونیورسٹی قطعی جداگانہ تعلیم کے حق میں ہے۔ ہماری رائے میں لکھنؤ یونیورسٹی کی رائے بہت صائب ہے یعنی بچوں کی تعلیم کے لئے استانیوں کی تعداد زیادہ ہونی چاہیئے کیونکہ چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے جس قدر عورتوں کی تعلیم مؤثر ہوتی ہے اس قدر مردوں کی نہیں ہو سکتی۔ سر جارج اینڈرسن کی بھی یہی رائے ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ فی الحال ماہر استانیاں کافی تعداد میں میسر نہیں آسکتیں اس لئے استانیوں کی تعلیم و تربیت پر جس قدر زیادہ زور دیا جائے بہتر ہوگا۔ ہماری رائے میں عام لڑکوں لڑکیوں کا تعلیمی نصاب بھی جداگانہ ہونا چاہیئے۔

عموماً ہندوستانی عورتوں کو گھر کے دھندوں اور بچوں کی پرورش سے اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ وہ کسی تفریح، علمی شغل یا جسمانی ورزش میں کچھ بھی وقت دے سکیں جس سے اُن کی صحت پر بہت خراب اثر پڑتا ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت طبقہ نے اب اس طرف توجہ کرنا شروع کردی ہے اور جگہ جگہ "زنانہ کلب" کھلتے جاتے ہیں۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں بندریا باغ لکھنؤ میں لیڈی ہیگ صاحبہ نے زنانہ کلب کا سنگ بنیاد رکھا جس میں عورتوں کی تفریح اور کتب بینی کے لئے کافی انتظام ہوگا۔ اس کلب کا عورتوں کی صحت، وسعت نظر، تعلیمی ترقی اور اصلاح معاشرت وغیرہ پر جس قدر عمدہ اثر پڑیگا وہ ظاہر ہے۔ اس سلسلہ میں مسز ناناوتی پریسیڈنٹ کلب، مسز غلام حسین سکریٹری اور مہارانی کھیراگڈھ کی مساعی جمیلہ خاص طور پر قابل قدر ہیں جن کی اَن تھک کوششوں سے کلب کے لئے ایک شاندار عمارت کا اس قدر جلد انتظام ہوگیا۔ اگر مقامی حکام کی لیڈیاں بھی لیڈی ہیگ کی طرح انجمہائے خواتین کی سرپرستی کیا کریں تو کوئی شہر و قصبہ زنانہ کلب اور لیڈیز ریڈنگ روم سے خالی نہ رہے

ودھوا کانفرنس ملتان نے ہندو سوسائٹی سے اپیل کی ہے کہ بال بدھواؤں کو کنیاؤں کی طرح سمجھا جائے اور اُن کی شادیاں کنواریوں کی طرح کیجائیں، (۲) بیواؤں کی شادی کو عام رواج دیا جائے (۳) رنڈوؤں کو بن بیاہی لڑکیوں سے شادی کرنے کی حوصلہ افزائی نہ کیجائے۔ (۴) حکومت ایک خاص عمر کے بعد مردوں کو شادی کی ممانعت کردے۔

یورپ میں فیشن کی پیروی قابل اعتراض حد تک ہے، چنانچہ حال میں معلوم ہوا ہے کہ فرانس میں اونچی ایڑی کے جوتوں کی وجہ سے گرنے کے جو حادثے ہوتے ہیں اُن میں اوسطاً دو ہزار عورتیں ہر سال مرجاتی ہیں

یورپ میں عموماً اور فرانس میں خصوصاً ہندوستانی ساری کا رواج عورتوں میں ترقی کررہا ہے

یورپ میں اس وقت عورتوں میں ہوابازی اور سینما کا شوق ترقی پر ہے۔ ہندوستان میں بھی اسکا اثر نمایاں ہے لیکن ہوابازی کا شوق ابھی ممالک غیر سے یہاں تک نہیں آیا ہے۔ امریکہ۔ انگلستان اور ٹرکی میں جہاں عورتوں میں ہوابازی کا شوق بہت زیادہ ترقی کرگیا ہے عورتوں کے باقاعدہ کلب قائم ہوگئے ہیں جن کے ممبروں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی ہے۔ یوروپین عورتوں کا یہ شوق جب

وطن کے زیر اثر ہے کیونکہ ان کی یہی خواہش ہے کہ جنگ کے زمانہ میں وہ قوم کی ضروری خدمات انجام دینے میں مردوں سے پیچھے نہ رہیں۔ چنانچہ اسی جذبہ کے ماتحت آجکل انگلستان کے بڑے گھرانوں کی عورتیں "اینٹی گیس" تحریک میں شامل ہو رہی ہیں، اور گیسوں کی مصنوعی جنگ میں غیر معمولی سرگرمیاں دکھا رہی ہیں۔ آرمی اسمال آرمس ٹریننگ اسکول کے شعبۂ گیس میں عورتیں دھڑا دھڑ بھرتی ہو رہی ہیں۔ یہی حال ریڈ کراس سوسائٹی سینٹ جان ایمبولینس برگیڈ اور ومنس لیجین کا ہے جہاں عورتوں کو گیس کی جنگوں اور ہوابازی کی باقاعدہ تعلیم دی جا رہی ہے۔

کراچی کے سیٹھ ڈونگرسی شام جی جوشی نے مہیلا ودیالیہ کو تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لئے بیس ہزار روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔ سیٹھ صاحب عورتوں کی صحیح تعلیم کے زبردست حامی ہیں۔

بمبئی کی ایک پارسی خاتون نے پارسی لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایک تالاب اور ایک ورزش خانہ بنانے کے لئے دو لاکھ روپیہ عطا کیا ہے۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے امتحان ایم۔ اے کے جو نتائج شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ امسال پانچ لڑکیاں اچھے نمبروں سے پاس ہوئی ہیں۔

استنبول کی بین الاقوامی زنانہ کانفرنس میں ہندوستان کی طرف سے مسز حامد علی بمبئی اور بیگم کمال الدین صوبہ سرحد نے شرکت کی۔

مس الزبیتھ پال جو میری وانا میکار ہائی اسکول کی ایک دیسی عیسائی لڑکی ہے ضلع الہ آباد کے اولمپک کھیلوں میں سو گز اور دو سو بیس گز کی دوڑ میں اول رہی۔ اس نے سو گز کی دوڑ گیارہ سکنڈ میں طے کی۔

ڈاکٹر سی۔ بی۔ کاملے لیڈی سرجن کانپور نے شہر میں زچہ و بچہ کا شفاخانہ تعمیر کرنے کے لئے بیس ہزار روپیہ عطیہ کیا ہے۔ اور وصیت کی ہے کہ وفات کے بعد اُن کی لاش طلبا کی تعلیم کے لئے میڈیکل کالج بھیج دی جائے۔

مس سوناوتی جادون جو زنانہ یونیورسٹی کی ایک ہونہار گریجویٹ ہیں کولھاپور میونسپلٹی کی ممبر نامزد ہوئی ہیں۔

علمی خبریں اور نوٹ

مرزا غالب کی یہ پیشگوئی کہ "شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن" حرف بحرف پوری ہو رہی ہے، اُن کے انتقال کو تقریباً پینسٹھ ۶۵ سال کا عرصہ گزرا ہے، مگر اس عرصے میں اُن کی شہرت دنیا کے دوسرے ملکوں تک پہونچ گئی ہے اور اُن کے دیوان کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں، اور جتنی شرحیں غالب کے کلام کی لکھی جا چکی ہیں اتنی آجتک کسی ہندوستانی شاعر کے کلام پر نہیں لکھی گئیں۔ اُن کی قبر دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ کے زیر سایہ چونسٹھ کھمبے میں کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھی، مگر اب قدردانانِ غالب کی ایک انجمن "یادگار غالب" کے نام سے علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی صدارت میں قائم ہوئی ہے، جس کے خاص کارکن خواجہ حسن نظامی، مسٹر دیش بندھو گپتا ڈائرکٹر روزنامہ "تیج" دہلی، مسٹر آصف علی بیرسٹر، میر محمد حسین، پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی، منشی مہاراج بہادر برق دہلوی اور مسٹر شاہد احمد اڈیٹر رسالہ "ساقی" دہلی وغیرہ ہیں۔ مزار کے ملحق قطعات اراضی کے مالکان مسیح الملک حکیم محمد احمد خاں اور حکیم محمد عبد الحمید خاں صاحب نے اپنی اپنی اراضی انجمن کو مرحمت فرما دی ہے۔ امید کہ قدردانانِ ادب کی امداد سے انجمن مذکور عنقریب اس جگہ ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرا سکے گی۔ چندہ حکیم عبد الحمید خاں صاحب مالک ہمدرد دواخانہ و سکریٹری انجمن "یادگار غالب" لال کنواں دہلی کے نام سے بھیجا جائے۔

خوشی کی بات ہے کہ لکھنؤ میں ریاست محمود آباد کے جواں بخت اور روشن خیال راجہ کی سرپرستی اور علم دوستی کی بدولت میر انیس مرحوم کے مقبرہ کی تعمیر کا مسئلہ بھی نہایت خوش اسلوبی سے حل ہو رہا ہے۔ راجہ صاحب کو اُردو کی ترقی سے خاص دلچسپی ہے چنانچہ پچھلے دنوں انھوں نے لکھنؤ میں ایک شاندار مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے ایک نہایت عالمانہ تقریر اُردو کے متعلق فرمائی تھی۔ آپ نے لکھنؤ کے بعض سرآمد شعرا کو بھی اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ہے۔ آپ کی ذات والاصفات سے ہم کو بڑی بڑی اُمیدیں ہیں۔ آپ کے والد گرامی مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد صوبہ میں ہر نیک و مفید ملک تحریک کے حامی و مددگار تھے۔ ہم کو امید ہے کہ انھیں شاندار روایات کی پھر تجدید ہوگی۔

علمی و ادبی دنیا کے لئے پچھلے مہینہ کے دو اہم واقعات ہندی ساہتیہ سمیلن اندور اور لائبریری کانفرنس لکھنؤ ہیں۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کی صدارت مہاتما گاندھی نے کی چنانچہ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں ہندی کی جو تعریف کی ہے وہ ہندو اور مسلمان دونوں کے غور کرنے کے قابل ہے۔ آپ کی رائے میں:-

"ہندی وہ زبان ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو دیوناگری اور عربی دونوں خطوں میں لکھی جاتی ہے، اور جس میں عربی، فارسی، انگریزی اور سنسکرت کے مناسب الفاظ شامل کر لینا جائز ہے۔"

یہی ہندوستانی زبان ہے جو در حقیقت ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے اور اسی زبان میں ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے کی صلاحیت ہے۔ لیکن اگر ہم اس کی سب سے بڑی خصوصیت قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو اس زبان کو عربی، فارسی اور سنسکرت کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ سے گرانبار نہ کرنا چاہیئے۔ در اصل اس وقت اردو ہندی زبانوں کے قدردانوں کے سامنے سب سے اہم یہی مسئلہ ہے۔ اس کے متعلق ہمارے دوست منشی پریم چند نے اسی پرچہ میں ایک فاضلانہ مضمون لکھا ہے۔ ہم کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم کو قابل مضمون نگار کی رائے سے پورا اتفاق ہے۔

ہندی ساہتیہ سمیلن اندور میں ایک ہندی یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز پاس ہوئی ہے جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی طرح ایم۔ اے تک جملہ علوم و فنون کی تعلیم ہندی زبان میں دیگی اور اسی کے ساتھ طلبا کو مختلف قسم کے ہنر بھی سکھائیگی جو گریجویٹ ہونے کے بعد انھیں معاش حاصل کرنے میں مدد دیں۔ مجوزہ اسکیم کے مطابق عملی کارروائی شروع کرنے کی غرض سے اندور کے رئیس اعظم سر حکم چند صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی ہندی یونیورسٹی الیوسی ایشن کے نام سے قائم ہوئی ہے جس کے ممبروں میں منجملہ دیگر اصحاب کے سید راس مسعود، اور مس اندرابائی بھگوت ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ریاست اندور بھی ہیں۔

آل انڈیا لائبریری کانفرنس لکھنؤ میں پنجاب یونیورسٹی کے فاضل وائس چانسلر ڈاکٹر وولنر نے چار لفظوں میں ہندوستان کی عام جہالت اور علمی و ادبی پسماندگی اور مطالعۂ کتب سے استغنا کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ "ہندوستان کے کسان، دکاندار، وکیل حتیٰ کہ اسکول کے ماسٹر تک کتابوں کے بغیر یا صرف چند کتابوں کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر لیتے ہیں۔" اگرچہ اس بے توجہی میں ہندوستانیوں کی عام ناداری اور ناخواندگی کو بھی دخل ہے لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں لائبریریوں کی بہت بڑی کمی ہے اور ملک بھر میں کوئی ایسی مرکزی لائبریری نہیں ہے جس میں جملہ علوم و فنون کی کتابیں موجود ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے میں تمام ملک میں چھوٹی چھوٹی لائبریریاں

کا جال پھیلا دینا چاہیئے تاکہ ان سے دیہات کی ستر فیصدی آبادی مستفید ہو سکے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی رائے پر صاد کرتے ہیں۔ لیکن یہ اسکیم صوبہ واری گورنمنٹوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کی سرگرم امداد اور مشترکہ کوشش کے بغیر شروع نہیں ہو سکتی۔

ہم کو یہ سنکر خوشی ہوئی کہ مفتی محمد سعید خاں صاحب حیدر آبادی کے ورثا نے مفتی صاحب مرحوم کے بیش بہا کتب خانہ کو پبلک کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ہم نے سُنا ہے کہ اس کتب خانہ میں بعض بیش قیمت نسخے ہیں اور اکابر خاندان کی نقل کردہ کتابیں خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ کتب خانہ میں تقریباً چار ہزار کتابیں ہیں جن میں زیادہ تر قلمی کتابیں اور بعض نسخے چھٹی صدی کے لکھے ہوئے ہیں۔

افسوس ۲۸۔اپریل کو ایک مختصر سی علالت کے بعد مشہور اُردو ڈرامہ نویس آغا محمد شاہ حشر کاشمیری کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم ہندوستان کے ان مشہور، مسلمہ اور کہنہ مشق ادیبوں اور شعرا میں تھے جن کی بدولت اُردو زبان کی نظم و نثر دونوں کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ ڈرامہ کی دنیا میں مرحوم کو عوام میں جو کامیابی نصیب ہوئی ہے وہ دوسرے ڈرامہ نگاروں کے حصہ میں نہیں آئی۔ ہم کو افسوس ہے کہ آپ کی وفات حسرت آیات سے ڈرامہ نویسوں کی صف میں جو جگہ خالی ہو گئی ہے وہ آسانی سے پُوری نہ ہو سکے گی۔ جب سے ہندوستان میں سینما کو عروج ہوا ہے اس وقت سے آپ کے تیار کردہ کئی ڈرامے پردۂ فلم پر بھی آ گئے ہیں۔ ابھی ان کا سلسلہ جاری تھا کہ عمر نے وفا نہ کی، اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

ہم اپنے ملک کے تعلیمی انسٹی ٹیوشنوں کی خاطر خواہ قدر نہیں کرتے ہیں لیکن دوسرے مہذب ممالک کے علما ہندوستان کے علمی و ادبی اداروں سے خاصی دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ چین کے دو مشہور پروفیسر تان یون شاہ اور چان یوسین نے اپنے ملک کے وزیر تعلیم کے معرفت ڈاکٹر ٹیگور کے وشوا بھارتی دار العلوم کے لئے مختلف علوم و فنون پر چینی زبان کی ڈھائی سو کتابیں بھیجی ہیں۔ یونیورسٹی میں چینی زبان کی ڈیڑھ ہزار کتابیں پہلے سے موجود تھیں۔

مولوی قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی نے ۱۰ سال کی مسلسل محنت کے بعد کشمیر کی تاریخ لکھی ہے جس کی ضخامت ۱۴ صفحات ہے۔ کتاب کا نام "نگارستان کشمیر" ہے۔ لایق مصنف نے راج ترنگنی و

گلزار کشمیر و تاریخ ریاست جموں و کشمیر وغیرہ تاریخی کتابوں کی بنیاد پر یہ تاریخ مرتب کی ہے۔

ریاست حیدرآباد دکن میں اُردو کی توسیع و ترقی کے لئے بہت کچھ ہو رہا ہے چنانچہ عثمانیہ یونیورسٹی کی تازہ رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ پچھلے سال یونیورسٹی مذکور نے دیگر زبانوں کی کتابوں کا اُردو ترجمہ کرانے میں دو لاکھ تین ہزار پانسو بارہ روپیہ خرچ کیا۔ اس وقت یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ماہرفن اور فاضل مترجموں کا بہت بڑا عملہ ملازم ہے، بہت سے قابل مترجم پورے وقت کے ملازم ہیں بعض صرف وظائف پر کام کر رہے ہیں اس سال پچپن کتابیں زیر ترجمہ ہیں جن میں سے سترہ مکمل ہو چکی ہیں۔ یونیورسٹی پریس میں اس وقت اننتی کتابیں زیر طبع ہیں جن میں پچیس اسی سال دی گئی ہیں، پینتیس ۳۵ کتابیں چھپ چکی ہیں اور پچیس شائع بھی ہو گئی ہیں۔ دارالترجمہ کی مجلس وضع اصطلاحات کے سال بھر کے دوران میں اکیسو ۲۱ جلسے ہوئے جن میں پانچ ہزار سات سو اصطلاحات مرتب ہوئیں۔ یہ کارگذاری ہر حیثیت سے اطمینان بخش ہے اور ہم اس پر کارکنان متعلقہ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

اسلامی تاریخ ہند کی تالیف کی اطلاع (جو دارالمصنفین اعظم گڑھ کے اہتمام میں مرتب ہونیوالی ہے) زمانہ میں دیجا چکی ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ خبر خوشی سے سُنی جائیگی کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے سو سو روپیہ کی قسطوں میں ایک ہزار روپیہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اہل قلم حضرات میں سے ڈاکٹر محمد ناظم پی۔ ایچ۔ ڈی محکمہ آثار قدیمہ لاہور، پروفیسر نجیب اشرف ندوی ایم اے اسمٰعیل کالج بمبئی۔ پروفیسر محمد ابراہیم ایم۔ اے عثمانیہ کالج اورنگ آباد اور مولوی الطاف علی بی اے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے اس کام کے لئے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔

فی زمانہ تمام دنیا میں جس قدر رواج سنِ عیسوی کا ہے اس قدر اور کسی سن کا نہیں ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ سن حضرت مسیح کی پیدایش یا مصلوب ہونے کے دن سے شروع ہوا تھا۔ مگر اٹلی کے مشہور ہیئت داں پروفیسر ڈومینکو آرجنٹیری نے حال میں اٹلی کی سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے ثابت کیا ہے کہ سنِ عیسوی کی ابتدا مسیح کی پیدایش سے گیارہ سال بعد ہوئی ہے۔ آپ کا بیان ہے کہ قدیم زمانہ کی عام مسیحی روایتوں کے مطابق حضرت عیسیٰ ۲۵۔ دسمبر روز اتوار کو پیدا ہوئے تھے لیکن ۲۵ دسمبر کی تاریخ اتوار کے دن صرف ۱۱ قبل مسیح میں پڑتی ہے۔

۱۹۳۴ء میں جزائر برطانیہ کے اندر پندرہ ہزار چھ سو باسٹھ کتابیں شائع ہوئیں جو سال ماسبق کے مقابلہ میں تعداد

چہ سو چھ زیادہ ہیں ۔ الغرض اتنی بڑی تعداد کتابوں کی کبھی شائع نہیں ہوئی تھی ۳۴-۱۹۳۳ء کا نقشہ حسب ذیل ہے :-

	۱۹۳۳ء	۱۹۳۴ء
نئی کتابیں	۹۵۲۸	۹۵۴۷
ترجمے	۳۰۰	۳۹۰
رسالے	۱۱۷۷	۱۲۵۹
نئے اڈیشن	۳۹۴۰	۴۴۳۲

سب سے زیادہ تعداد افسانوں کی ہے، یعنی چار ہزار پانسو اکتیس جو بمقابلہ ۱۹۳۳ء چار سو بائیس زیادہ ہے۔ سفرناموں، بچوں کی کتابوں، بحری، فوجی، کاروباری اور فنی کتابوں میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ لیکن جغرافیہ معاشرت، لٹریچر، موسیقی و مذہب کے متعلق کتابوں میں کمی رہی۔

حیدرآباد کی جدید المطبع کتابوں میں دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک تو ہیت کی ریت جو نواب صادق جنگ محمد جلال الدین خاں حلم آغائی مرحوم کی ٹھمریوں کا مجموعہ ہے جس میں ہر ٹھمری کی ابتدا میں اس کی راگنی اور گانے کا وقت بھی درج کر دیا گیا ہے۔ ان ٹھمریوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اُردو، فارسی، عربی اور بھاشا کے الفاظ نہایت خوش اسلوبی سے استعمال ہوئے ہیں۔ دوسری کتاب مسٹر اگھوندر راؤ صاحب جذب عالمپوری وکیل عدالت ہائیکورٹ حیدرآباد کی یکصد رباعیوں کا مجموعہ "رباعیات جذب" ہے۔ ان رباعیوں میں پنڈت صاحب موصوف نے ہندی اور سنسکرت کے حکیمانہ اقوال کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ لایق مترجم سنسکرت کی کتاب "بھرت ہری نیتی شتک" کے سو اشلوکوں کا بھی اُردو زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں

رسالہ "زمانہ" کو دو ہونہار مستعد اور جفاکش نوجوانوں کی ضرورت ہے جو کم سے کم دو سال تک صرف برائے نام الاؤنس پر اسکے اسٹاف میں باقاعدہ کام سیکھنے کی غرض سے شامل ہو سکیں۔ صرف انھیں نوجوانوں کو درخواست دینا چاہیئے جو ہندو مسلمانوں کے باہمی تفرقات یا سیاسی اختلافات سے بالاتر ہو کر اپنی زندگی ملک کی ادبی خدمت کرنے کے لئے وقف کرنا چاہتے ہوں اور محض معمولی گذارہ پر تعریف کی خواہش اور قدردانی کی تمنا سے بے نیاز ہو کر اردو کی توسیع و ترقی کیلئے مستقل طور پر کام کرنیکو تیار ہوں اور کچھ عرصہ تک ایڈیٹر زمانہ کے ساتھ کام کرنیکے بعد رسالہ کا بوجھ اپنے ذمے لے سکیں

ایڈیٹر زمانہ کانپور

ہندوستان کی
خاص
پینے کی
چیز

گرمی کے موسم میں اگر
حلق خشک ہے
یا اسمیں سوزش ہے یا دکھتا ہے
تو اسکا بہترین علاج بیبس ہے
گرمی کے زمانہ میں ہزاروں آدمی حلق کی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حلق میں خشکی اور دکھن سانس کے ذریعہ سے خاک پھانکنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے بیبس کی ٹکیاں روزمرہ چوس کر اپنے حلق کی حفاظت کیجئے جو جراثیم کش اور سانس کے ذریعہ شفا دینے والی ٹکیاں ہیں۔ بیبس کی ٹکیاں حیرت انگیز طور پر تسکین دہ اور شفا بخش ہیں جو سینہ اور پھیپھڑوں کی ناقابل قدر حفاظت کرتی ہیں۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ
ایجنٹس میسرس اسمتھ اسٹانسٹریٹ اینڈ کمپنی لمیٹڈ اٹالی کلکتہ

اودھ کا سفیدہ
اور دسہری آم

ہمارے فارم سے جو ۱۹۲۵ء سے قائم ہے بہترین آم اور آم کے قلم اور لکھنؤ کے مشہور خربوزہ کے بیج و ہر قسم کی سبزی و ترکاری کے تخم روانہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ زردہ۔ قوام۔ گولی تمباکو خوردنی۔ لکھنؤ کی مشہور چکنی ڈلی و چکن کی ٹوپی کے پلے و فردیں دلحاف و رضائی چھپے ہوئے اور ہر قسم کی کھانے پینے کی تمباکو وغیرہ نہایت ارزاں فروخت ہوتی ہیں تاجروں سے خاص رعایت۔

فہرست کارخانہ طلب کرنے پر مفت روانہ کی جاتی ہے۔

فرمایش کے ساتھ نصف قیمت پیشگی آنا چاہیئے ورنہ تعمیل سے معذوری ہے

ہر خط میں اپنا نام اور القاب و پتہ ڈاکخانہ و اسٹیشن صاف صاف تحریر کرنا چاہیئے

المشتھر

مینجر ہندوستانی کمپنی
ملیح آباد۔ لکھنؤ

شایع ہو گیا ہے

ہز ہولی نس صاحب جی مہاراج کی
شہرہ آفاق تصنیف

یتھارتھ پرکاش

حصۂ سوم

جس کے پہلے دو حصوں نے سال گذشتہ میں مذہبی دنیا میں
ہلچل پیدا کر دی تھی چھپکر شائع ہو گیا ہے۔ اس حصہ
میں آریہ سماجی۔ سناتن دھرمی و سکھ مذہب کی دھرم
پستکوں سے سیکڑوں حوالہ جات پیش کر کے پیروان
رادھا سوامی مت کی ان مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے
جن کی وجہ سے وہ ان بھائیوں کے ہم خیال بننے
سے قاصر ہیں۔ نیز واضح کیا گیا ہے کہ

سچے رشیوں پیغمبروں۔ سنتوں کی مذہبی
تعلیم میں بین مشابہت ہے

امید ہے کہ متلاشیان حق اس نادر تصنیف کا بغور
مطالعہ کر کے اپنے لئے فیصلہ کر سکیں گے کہ اصلی
سچا روحانی مذہب کیا ہے۔

کاغذ سفید چکنا حجم ۳۲۸ صفحہ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ مجلد
قیمت دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ

اسٹور کیپر دیال باغ۔ آگرہ

(نوٹ)
سکریٹری صاحبان برانچ ست سنگھ یہ کتب اپنے ہاں
فروخت کے لئے رکھ سکتے ہیں اور قیمت فروخت
ہو جانے پر بھیج سکتے ہیں۔

آپ کے لئے

نئی طاقت حاضر ہے

جب سیناٹوجن کی چند خوراکیں آپ کے اعضائے
رئیسہ کی طاقت بے نظیر طور پر بحال کر سکتی ہیں تو پھر
آپ خستگی اور تکان کیوں محسوس کرتے ہیں۔ یعنی طاقت
کی کمی کے باعث زندگی کا لطف نہیں اٹھا سکتے
ضعف کی علامتیں یعنی بیخوابی۔ طاقت کی
کمی۔ بے خیالی۔ پیٹ کی شکایتیں سب بہت جلد
دور ہو جائیں گی اور پھر کبھی عود نہ کریں گی۔
کیونکہ سیناٹوجن پائدار طاقت تعمیر کرتی ہے۔
ایک مشہور یوروپین طبیب تحریر فرماتے ہیں:۔
"سیناٹوجن فوری اور قابل قدر اثر دکھاتی ہے جسکا
اظہار طاقت میں بتدریج اضافہ سے ہوتا ہے۔"

خود کو طاقتور اور تندرست آدمی بنایئے

آج ہی

سناٹوجن کا استعمال شروع کر دیجئے۔

SANATOGEN

اصلی مقوی غذا

تمام بازاروں اور دوا فروشوں سے ملتی ہے۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

مرتبہ : دیا نراین نگم ، بی ۔ اے

جلد ۶۴	مئی ۱۹۳۵ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

تصاویر:-

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ مع ایک غیر سے سے ششماہی عہ ، ہندوستان کیلئے ششماہی تین روپیہ

قیمت فی پرچہ ۸

قیمت سالانہ صہ

زمانہ

جلد ۶۴ مئی سنہ ۱۹۳۵ء نمبر ۵

نغمۂ بہاراں

۱۰۹۵۰ ۲۵۹

سنہ ۱۳۵۴ھ

نغمی

تاریخ دلفریب جشن جبلی

۱۲۱۱ ۳۲۶ ۳۵۳ ۴۵

سنہ ۱۹۳۵ء

برائے نذرِ محبت عالم آئینۂ سطوت وحشم سلطان سلاطینِ دوراں قیصرِ ہند

۵۹ + ۴۰۰ + ۲۶۱ + ۱۶۰ + ۱۵۰ ۳۴۸ + ۶ + ۲۷۵ + ۷۶ + ۱۴۱ + ۵۰ + ۶۵۰ + ۲۱۳

سنہ ۱۹۳۵ء — سنہ ۱۳۵۴ھ

ملک معظم نجم الطاف اوج کمال شہنشاہ جارج پنجم خلد اللہ ملکہ واجلالہٗ

۷۰ + ۶ + ۹۵ + ۶۶ + ۶۳۴ ۹۵ + ۲۰۷ + ۶۱ + ۹۱ + ۱۰ ۱۲۱ + ۹۳ ۱۰۵۰ + ۹۰

سنہ ۱۹۳۵ء — ۱۳۵۴ھ

از یادگار خاکسار سید مقبول حسین وصل بلگرامی

۳۰۲ + ۱۲۶ + ۱۲۸ + ۱۷۸ + ۷۴ + ۸۸۲ + ۲۳۶ + ۸

سنہ ۱۹۳۵ء

کیا خوب دھوم ہے اب تازہ بہار آئی — کیا راحت افزا آئی، کیا خوشگوار آئی

سنہ ۱۹۳۵ء = ۲۱ + ۱۱۳۳ + ۳۱ + ۲۱ + ۶۹۸ + ۳۱ — سنہ ۱۳۵۴ھ = ۱۱ + ۲۰۸ + ۲۱۳ + ۳ + ۱۵ + ۵۵ + ۶۰۰ + ۳۱

کس طرح سے یہ آئی اور بے قرار ہو کر — اب کیسے ہنس پڑے گل بے اختیار ہو کر

سنہ ۱۹۳۵ء ۲۳۱ + ۱۲۴۴ + ۵۰ + ۳۲۷ + ۱۰۰ + ۳ — سنہ ۱۳۵۴ھ = ۲۲۱ + ۵ + ۱۴ + ۲۰۷ + ۲۱ + ۱۵ + ۷۰ + ۲۱۷ + ۸۰

وقت ایسا ہے دل افزا ہر ایک دل ہے قرباں ۱۳۵۴ھ
نظارہ ایسا دلکش، دنیا ہے آج حیراں ۱۹۳۵ء

جو کوہ ہیں وہ گل ہیں رنگینیوں کے مخزن ۱۳۵۴ھ
اک اک کو ہے تحیر، صحرا ہے رشکِ گلشن ۱۹۳۵ء

ہے یہ ادا گلوں میں، سب دل نثار جس پہ ۱۳۵۴ھ
وہ بلبلوں کے نغمے، اک ایک روح پرور ۱۹۳۵ء

دیکھا؟ ہر ایک جا ہے اس وقت زیب و زینت ۱۳۵۴ھ
سب طرف ہے مہیا سامانِ عیش و عشرت ۱۹۳۵ء

رنگین، بہجت آگیں مژدہ میں سن رہا ہوں ۱۳۵۴ھ
یہ رازِ عیش افزائیں خود بھی جانتا ہوں ۱۹۳۵ء

روشن ہوا ہے مجھ پر جو کچھ ہے رازِ دوراں ۱۳۵۴ھ
شمع قدم ہے شاعر، شاعر سے کیا ہے پنہاں ۱۹۳۵ء

اس سے ہے زیبِ عالم، قائم بہارِ فطرت ۱۳۵۴ھ
شاعر وقارِ کیواں، آئینہ دارِ فطرت ۱۹۳۵ء

شاعر سے جا کے پوچھیں، یہ اہتمام کیوں ہے ۱۳۵۴ھ
حیران سب ہوئے ہیں، یہ انتظام کیوں ہے ۱۹۳۵ء

سنئے یہ ہر طرف سے آج آتی ہیں صدائیں ۱۳۵۴ھ
قسمت سے دن یہ آیا، ہم سب خوشی منائیں ۱۹۳۵ء

تقدیر سے ہے آیا وہ دورِ کامرانی ۱۳۵۴ھ
پائے گا کوئی کیا اب جس کا نظیر و ثانی ۱۹۳۵ء

ہے دورِ جشنِ جبلی یکسر نشاط آگیں ۱۳۵۴ھ
تاریخ، نیک و جامع، اک یادگار رنگیں ۱۹۳۵ء

ایسا ہے جشن اُس کا رفعت پناہ جو ہے ۱۳۵۴ھ
خورشید حلم جو ہے، شاہوں کا شاہ جو ہے ۱۹۳۵ء

موجِ یمِ محبت، شان و وقارِ عالم ۱۳۵۴ھ
سائل نواز، حامی، شاہنشہ معظم ۱۹۳۵ء

وہ شاہ جارج پنجم، رشکِ جہان و سلطاں ۱۳۵۴ھ
وہ تاجدارِ اعلیٰ، ماہِ کمال و ذی شاں ۱۹۳۵ء

وہ شاہدِ عنایت، جس کا زمانہ شیدا ۱۳۵۴ھ
وہ مقصدِ شجاعت، جود و سخا کا دریا ۱۹۳۵

ہم میں وہ پایا، طالع شمار جس پر ۱۳۵۴ھ
وہ سطوتِ مکارم، مفتوں وقار جس پر ۱۹۳۵ء

کیا رعب، کیا ہے سطوت، کیا جود، کیا ہے دولت ۱۳۵۴ھ
کس میں یہ شان و شوکت، اللہ ایسی طاقت ۱۹۳۵ء

صدقے شکوہ جس پہ، اجلال ہو تو ایسا ۱۳۵۴ھ
عالم کو فخر جس پہ، اقبال ہو تو ایسا ۱۹۳۵ء

کس طور، کس روش سے پچیس سال گزرے ۱۳۵۴ھ
دورِ حکومت ایسا، ہو خلق شاد جس سے ۱۹۳۵ء

کس نے مودّت ایسی دیکھی بنائے آکر ۱۳۵۴ھ
یہ بختِ فتحمندی دُنیا دکھائے آکر ۱۹۳۵ء

افزوں رہے برابر اقبال، اوج و دولت ۱۳۵۴ھ
ہو شاہ کو مبارک، یہ خاص روزِ بہجت ۱۹۳۵ء

اے وصل کچھ نہ پوچھو، دل خوب جانتا ہے ۱۳۵۴ھ
تاریخ کا یہ قطعہ جس فکر سے لکھا ہے ۱۹۳۵ء

نقاد حال دیکھیں، صنعت کا یہ ہے گلشن ۱۳۵۴ھ
ہے شعر شعر یکسر ہجری و عیسوی سن ۱۹۳۵ء

نوید جوبلی

(از مسٹر منوہر لال طالب بی۔ اے (آنرز) ایل ایل بی وکیل کوال)

نویدِ جوبلی آئی کہ پیغامِ بہار آیا
خزاں دیدہ چمن کے پتے پتے پر نکھار آیا

پرانی ڈالیوں نے کونپلیں تازہ نکالی ہیں
چمن کے خار و گل کہتے ہیں ابرِ نوبہار آیا

تمناؤں کی دُنیا دل کے گوشے میں مچلتی تھی
نہ اِس پہلو قرار آیا نہ اُس پہلو قرار آیا

خدا کا شکر ہے آخر کبھی تو آرزو نکلی
کبھی تو میرے گلشن میں بہار آئی نگار آیا

بہ شکلِ نغمۂ اُمید اظہارِ تمنا سے
کسی کی بات پر اہلِ قفس کو اعتبار آیا

فضائے دہر گونج اُٹھی ہے اُمیدوں کے نغموں سے
مسرت کا مغنی لے کے وہ رنگین ستار آیا

ہوئے عالم بالا بسی ہے بوئے الفت میں
سمجھتے ہیں زمیں والے کہ ہم بستے ہیں جنت میں

یہ سلور جوبلی ہے ہند کے شاہِ معظم کی
شہنشاہِ ثریا جاہ بھارت کے مکرم کی

برس پچیس سے وہ ہے سریر آرائے امپائر
حکومت کو میسر ہے اعانت ربِ اعظم کی

اسی عہدِ حکومت سے ہی شان و شوکتِ شاہی
کہ ہے تصویر یہ دورِ ہمایوں دورۂ جم کی

اسی عہدِ حکومت میں ہوئی جنگ امن کی خاطر
اسی میں قیصرِ ولیم نے گردن آخرش خم کی

اسی عہدِ حکومت میں اڑے انساں ہواؤں میں
فرشتوں سے بھی ہمسر ہو گئی اولادِ آدم کی

فضائے ہند میں سنتے ہیں نغمے حور پیرس کے
خبر لاتی ہے "لاسلکی" جہاں کے زیر اور بم کی

بشر کے واسطے سارے عناصر ہو گئے خادم
حکومت میں مسیحائی کی خدمت تو نے کیا کم کی

ترا عہدِ حکومت، ارتقائے علمِ انسانی!
تری فطرت ہے سلطانی تری حکمت ہے لاثانی!

یہ سلور جوبلی شایانِ شاہنشہ ہے شوکت میں
کہ شیرینی سے الفت کی مشابہ ہے حلاوت میں

مبارک تجھ کو "سلور جوبلی" کا جشنِ شاہانہ
منانا "گولڈن جبلی" کا بھی ہو تیری قسمت میں

اسے فخرِ قبولیت عطا کر اے شہِ والا
عقیدت کا خراج بے بہا لایا ہوں خدمت میں

مرا پیارا وطن ہندوستاں تیرا دعا گو ہے
عقیدت اس کی ہے ڈوبی ہوئی رنگِ محبت میں

وہ عارض ہے کہ ہو اس پر نگاہِ شفقتِ شاہی
کہ یوسف بن کے وہ بکنے کو ہے مصرِ تجارت میں

اسی کے لختِ ہائے دل کی ہے ناگفتہ بہ حالت
وہ بھوکوں مر رہے ہیں آہ اس دورِ فلاحت میں

ہزاروں خودکشی کو شغلِ بیکاری سمجھتے ہیں
وہ بچ جائیں جو مل جائے انھیں حصہ حکومت میں

نہیں افضلائے عالم میں کسی سے بھی وہ کم ہرگز
جو حاصل دسترس انکو بھی ہو صنعت میں حرفت میں

وہ پتلے ہیں وفا کے جاں نثاری ان کی فطرت ہے
کوئی ہمسر نہیں ان کا عقیدت اور شجاعت میں

ہے محتاجِ نگاہِ خاص ان کا حال ناگفتہ
پہنچ امداد کو، پہنچے تھے وہ تیری مصیبت میں

وفاداروں پر اپنے اک نگاہِ لطف ارزاں کر
محبت کے پرستاروں کو شاہا گل بداماں کر

شاہ جارج پنجم کی عہد حکومت کے پچیس سال

۱۹۱۰ء کا زمانہ تھا مسٹر اسکوئتھ (جو بعد میں لارڈ ہو گئے تھے) وزیر اعظم تھے۔ گورنمنٹ برطانیہ دو زبردست مخمصوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ ایک طرف دارالعوام اور دارالامرا میں سخت کشمکش تھی دوسری جانب آئرلینڈ والے آزادی و خود مختاری کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ کشمکش رفع نہ ہونے پائی تھی کہ ۶ مئی کو ہز میجسٹی ایڈورڈ ہفتم شاہ انگلستان و قیصر ہندوستان نے داعی اجل کو لبیک کہا جس کے ماتم میں سلطنت برطانیہ کا یونین جیک سرنگوں ہو گیا۔ اس کے بعد ولیعہد سلطنت پرنس آف ویلز شہزادہ جارج "ہز میجسٹی جارج پنجم بفضلہ تعالیٰ حامی ملت والدین بادشاہ سلطنت متحدہ برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ و نوآبادیات و مقبوضات برطانیہ ماوراء البحر و شاہنشاہ ہندوستان" کے القاب و خطاب کے ساتھ تخت نشین ہوئے۔ گو آپ ۶ مئی ۱۹۱۰ء ہی کو سریر آرائے سلطنت ہو گئے تھے، لیکن اپنے ہر دلعزیز والد بزرگوار سے اظہار عقیدت و ارادت کے لحاظ سے آپ کی تاجپوشی کا جشن سال بھر بعد منایا گیا چنانچہ سال بھر برابر اس مبارک تقریب کی عظیم الشان تیاریاں ہوتی رہیں اور ۲۲ جون کو ویسٹ منسٹر کے قدیم گرجا میں یہ رسم بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔

آج پچیس سال کے بعد اس مبارک جشن کا مختصر بیان یقیناً باعث دلچسپی ہوگا۔ تاجپوشی کے وقت ملک معظم قرمزی رنگ کا لباس شاہی در بر، گلے میں "آرڈر آف دی گارٹر کا کالر" اور "مین ٹیننس" کی روایتی کلاہ برسر تخت اجلال پر رونق افروز تھے۔ عقب میں افواج بحری و بری و محلات شاہی کے بڑے بڑے افسران اور اُن کے پیچھے یونین آف دی گارڈ کے جوان مؤدبانہ کھڑے تھے۔ ہندوستان کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سابق وائسرائے کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔ شاہی ہیرالڈ (نقیب) آداب محفل کے انصرام میں مصروف تھے۔ نائیٹس آف دی گارٹر کی صفیں برابر باندھے کھڑی تھیں۔ لارڈ چانسلر، وزیر اعظم، دیگر وزرا، رؤسا، امرا اور معززین سب زرق برق پوشاکوں میں ملبوس جشن کی شان دوبالا کر رہے تھے۔ عوام کو ملک معظم اور ملکہ معظمہ کے درشن کرنے کا موقعہ ملا تو "خدا بادشاہ جارج

Maintenance کا   Order of the Garter کا

کو سلامت رکھے" کے فلک بوس نعروں سے تمام فضا گونج اٹھی۔ لاٹ پادری صاحب نے حلف دلا کر بادشاہ سلامت کو تاجپوشی کے چبوترہ پر بٹھایا، اور اُن کے سر، سینہ اور ہاتھوں پر عطر اور پھلیل ملا۔ اس رسم کے بعد بادشاہ کو طلائی کرہ (orb) دیا گیا، ہاتھ میں شاہی انگوٹھی پہنائی گئی اور ایک عصائے سلطنت اور دوسرا عصائے انصاف پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ملکہ معظمہ کے بھی عطر ملا گیا اور تاج پہنائے گئے، گرجا میں جا کر دعائیں مانگی گئیں۔ جب گرجا سے شاہی جلوس محل کی طرف روانہ ہوا تو عجیب منظر تھا۔ تمام سڑک پر دو رویہ تماشائیوں کے اس قدر ٹھٹ لگے ہوئے تھے کہ سروں پر سے تھالی پھر جائے۔ اور فوجی جوان لارڈ کچنر کی ماتحتی میں مصروف انتظام تھے۔ جب شاہی سواری بازار سے گزری تو عوام کے نعرہ ہائے مسرت سے زمین و آسمان گونج اٹھے۔

اس مسرت بخش تقریب سے اہل برطانیہ کی روح کو جو بالیدگی اور قلوب کو جو سرور حاصل ہوا اُس سے ہندوستان بھی محروم نہیں رہا۔ چنانچہ ۱۲۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں بھی جشن تاجپوشی منایا گیا بیشمار حکام، انجینئر، فوجی سپاہی، کاریگر اور مزدور چھ مہینہ تک دہلی کی آراستگی میں مصروف رہے۔ تقریباً پچاس مربع میل اراضی کو صاف اور ہموار کر کے چار سو چھپّر کیمپ لگائے گئے جن میں چالیس ہزار روسا نہ خیمے اور بارگاہیں تھیں جن میں ڈھائی لاکھ آدمیوں کی عارضی رہائش کا انتظام کیا گیا۔ اس تقریب میں ایک سو چالیس والیان ریاست سے زیادہ شریک ہوئے اور ہر رئیس کے حشم و خدم میں سو سے لیکر پانسو تک متوسلین موجود تھے۔

ہزمیجسٹی ملک معظم اور ملکہ معظمہ" پی۔ اینڈ او" کمپنی کے جہاز "مدینہ" میں سوار ہو کر بندرگاہ پورٹسمتھ سے روانہ ہوئے اور ۲۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو بمبئی پہونچے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ انگلستان کے کسی فرمانروا نے شہنشاہ ہندوستان کی حیثیت سے ہندوستان آکر دربار کیا ہو بمبئی سے شاہنشاہ معظم روانہ ہو کر ۷۔ دسمبر کو دہلی پہونچے۔ لال قلعہ کے قریب ایک خاص اسٹیشن آپ کے استقبال کے لئے تعمیر کیا گیا تھا، جہاں بڑے بڑے افسران، عہدیداران اور معززین نے اعلیٰحضرت کا استقبال کیا۔ اسٹیشن سے شاہی سواری لال قلعہ کو روانہ ہوئی جہاں بڑے بڑے والیان ریاست اور روسا و امرار دیدہ و دل فرش راہ کئے ہوئے موجود تھے قلعہ کے باہر ہزارہا آدمیوں کا ہجوم شاہی درشنوں کے لئے موجود تھا۔ چنانچہ بادشاہ سلامت و ملکہ معظمہ نے مثمن برج میں جلوہ افروز ہو کر عوام کو جھروکہ درشن دیے۔

قلعہ سے شاہی کیمپ تک دو رویہ فوج استادہ تھی، فوج نے پہلے ایک طرف سے اور پھر دوسری طرف سے رائفلیں سر کیں۔ اسی کے ساتھ ایک سو ایک ضرب توپ کی شاہی سلامی اتاری گئی اور آخر

میں لاکھوں آدمیوں کے نعرہائے مسرت نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

اس کے بعد شاہی جلوس نکلا، راستہ پر تقریباً پچاس ہزار فوج جرار دو رویہ تعینات تھی جو جلوس کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی جاتی تھی۔ سب سے آگے گورنر جنرل صاحب اور صوبجات کے گورنر صاحبان مع حشم و خدم تھے، اُن کے پیچھے حضور ملک معظم کی سواری اور اُن کے عقب میں زرق برق و رنگا رنگ پوشاک میں ملبوس اور جواہرات میں غرق والیان ریاست اور ان کے ہمرکاب دس ہزار فوج تھی۔

شاہی جلوس قلعہ سے نکلکر خاص سڑک سے پہلے جامع مسجد پہونچا وہاں سے براہ اسپلاناڈ روڈ چاندنی چوک، فتحپوری، موری دروازہ، سڑک راجپور، سڑک چوبرج ہوتا ہوا شاہی کیمپ کی بارگاہ میں پہونچا جہاں اسمبلی اور صوبجاتی کونسلوں کے بہت سے نمایندے قدمبوسی کے منتظر تھے۔

اس جشن شاہی کا آٹھ روز تک سلسلہ جاری رہا جس میں بہت سی اہم تقریبات اور رسمیں ادا ہوئیں۔ مثلاً والیان ریاست کی حضور شاہی میں پذیرائی ہوئی، ملکہ معظمہ نے پردہ دربار منعقد کیا جس میں ہندوستان کی رانیاں، مہارانیاں باریاب ہوئیں۔ کنگ ایڈورڈ میموریل کا سنگ بنیاد نصب ہوا، سات انگریزی اور تین ہندوستانی رجمنٹوں کو جھنڈے عطا ہوئے، مشعلوں کی روشنی میں فوجی مظاہرہ ہوا، افواج متعینہ ہند کے پچاس ہزار منتخب جوانوں کی پریڈ ہوئی، پولو ٹورنامنٹ ہوا، نمایش اسپان فوجی فٹ بال میچ کا فائنل، والنٹیروں اور ہندوستانی افسروں کی پذیرائی، ضیافتیں اور گارڈن پارٹیاں اور تقسیم تمغہ جات و نشانات وغیرہ وغیرہ رسمیں ادا ہوئیں۔

لیکن اس جشن کا سب سے بڑا واقعہ ۱۲۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کا دربار تاجپوشی تھا جو اعلیحضرت ملک معظم اور ملکۂ معظمہ کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ یہ دربار ایک بڑے بھاری میدان میں جو شاہی کیمپ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا منعقد ہوا۔ شاہی چبوترہ کے سامنے تقریباً دس ہزار بڑے بڑے افسر نیم دائرہ کی شکل میں استادہ تھے۔ بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ نے انگریزی اور اُردو میں وہ اعلان پڑھنے کا اذن دیا جو ویسٹ منسٹر میں پڑھا گیا تھا۔ اس کے بعد ملک معظم کے سامنے سے جلوس پر جلوس سلام کرتے ہوئے نکلے اور شاہی سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ آخری توپ کے بعد ہزاکسلنسی وائسرائے نے ان شہنشاہی انعامات کی فہرست پڑھی جو اس دن بطور اعزاز عطا کئے گئے تھے، بعدہٗ شاہی نقیب نے اپنے گھوڑے کی رکابوں پر استادہ ہوکر نعرہ ہائے مسرت بلند کئے اور بگل بجایا۔

بادشاہ سلامت نے استادہ ہوکر اپنا اعلان شاہی صاف لہجہ میں سنایا جس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ اسی اعلان کے ذریعہ تقسیم بنگال منسوخ کی گئی، عام تعلیم کے پچاس لاکھ روپیہ سالانہ

کا عطیہ منظور ہوا اور بہار کا صوبہ قائم ہوا۔ دہلی سلطنت ہند کا پایۂ تخت قرار دیا گیا اور صوبجات کی دوبارہ تقسیم ہوئی۔ آخر میں ملک معظم نئی دہلی کا سنگ بنیاد اپنے دست مبارک سے نصب فرماکر دہلی سے تشریف لے گئے۔ یہ الوداعی منظر عدد درجہ موثر تھا جس کا لوگوں کے قلوب پر عرصہ تک اثر باقی رہا۔

دربار دہلی کے بعد بادشاہ سلامت کے عہد سلطنت میں سب سے بڑا واقعہ جنگ عظیم کا ہے جو ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور جس میں برطانوی نوآبادیات ومقبوضات کے علاوہ ہندوستان کے لاکھوں فرزند قربان ہوگئے۔

اگرچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم قوموں کی جنگ تھی لیکن چونکہ انگلستان کا بادشاہ تمام برطانوی افواج اور انگریزی نوآبادیات ومقبوضات کی فوجوں کا سپہ سالار اعظم ہوتا ہے اس لئے جنگ کے سلسلہ میں بھی ملک معظم کی مصروفیات کا مختصراً ذکر کردینا بے محل نہ ہوگا۔

دہلی دربار اور جنگ عظیم کے درمیان کا دفقہ اگرچہ پرامن تھا لیکن اسی دوران میں بعض ایسی سیاسی پیچیدگیاں رونما ہوگئیں کہ ملک معظم اور اُن کے قابل وزرا کے تدبر وسیاست کی بہترین آزمائش ہوگئی اور وہ اس آزمائش میں پورے اُترے۔ غرض اِس جنگ میں ملک معظم کی ذاتِ اقدس وہ آئینی مرکز ثابت ہوئی جس کے گرد تمام رعایا جمع ہوسکتی ہے۔

جب ۱۹۱۴ء میں یورپ کے آسمان میں جنگ کے بادلوں کی گھنگھور گھٹائیں چھانے لگیں تو ملک معظم نے اس بلا کو ٹالنے کی انتہادرجہ کوشش کی اور قیصر جرمن اور زار روس کو بہت کچھ سمجھایا مگر قیصر اور شہنشاہ آسٹریا اور زار روس کے دل میں جنگ کی دھن سمائی تھی اس لئے کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ بالآخر یہی مناسب سمجھا گیا کہ دنیا کے امن وصلح کو پامال کرنیوالے ہٹ دھرموں کے خلاف طاقت سے کام لیا جائے۔ اسی اثنا میں ۳۔ اگست ۱۹۱۴ء کو بادشاہ بلجیم نے تار دیا کہ جرمن فوجوں نے بلجیم پر حملہ کردیا ہے اس لئے بلجیم کی مدد کی جائے۔ اس خبر سے حضور کو بہت افسوس ہوا کہ ایک زبردست طاقت باہمی معاہدوں کو توڑ کر ایک کمزور سلطنت کو پامال کرنے پر آمادہ ہے اس لئے انگلستان کی طرف سے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کردیا گیا۔ اور ملک معظم نے اپنی افواج قاہرہ کے نام ایک پیغام بھیجکر ان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کردیا اور تمام قوم اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہوگئی اس طویل جنگ میں ملک معظم اور ملکہ معظمہ نے شروع سے آخر تک سپاہیوں کی فلاح وبہبود اور بچوں کی بیماروں اور زخمیوں کی تیمارداری اور برطانوی فوجوں کی عام راحت وآسایش کا خیال رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ افواج بحری وبری کے متعلق جو کچھ واقعات روزانہ ظہور پذیر ہوتے تھے

ان سے بادشاہ سلامت کو پوری طرح واقفیت رہتی تھی، کیونکہ لارڈ کچنر جو اس زمانہ میں وزیر جنگ تھے اکثر قصر شاہی میں موجود رہتے تھے اور ذرا ذرا سی باتیں ہز مجسٹی کے گوش گذار کرتے رہتے تھے اور ملک معظم ہر محاذ جنگ کی خبریں نہایت ہمدردی اور اولوالعزمی کے ساتھ سنا کرتے تھے اور سپہ سالار سے لیکر ہر شخص کی ہر طریقے سے حوصلہ افزائی فرماتے رہتے تھے۔ غرض جب تک جنگ کا خاتمہ نہیں ہوگیا بادشاہ سلامت نے اپنے آرام و راحت کی کوئی پروا نہیں کی۔

اس زمانہ میں انگریزی فوجیں کئی محاذوں پر نبرد آزما تھیں لیکن چونکہ مغربی محاذ سب سے قریب تھا اس لئے بادشاہ سلامت وقتاً فوقتاً فرانس تشریف لیجاکر خود بہ نفس نفیس فوج کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔

دوران جنگ میں ملکۂ معظمہ نے بھی آرام و راحت ترک کردی تھی۔ اس وقت بیمار دل اور زخمیوں سے برطانیہ کے تمام اسپتال، مستقل یا عارضی پٹے پڑے تھے۔ علیاحضرت ملکۂ معظمہ برابر شفاخانوں میں تشریف لیجاکر بیماروں اور زخمیوں کی خدمت کرتی تھیں جس سے اہل فوج کو اپنی حب الوطنی وجاں نثاری کا پورا صلہ مل جاتا تھا۔

انگلستان کے شاہزادگان عالی وقار بھی جنگی خدمات میں اپنے شاہی والدین سے پیچھے نہیں رہے چنانچہ شہزادہ ولیعہد پرنس آف ویلز نے انگریزی سپاہ کے ساتھ فرانس میں کام کیا اور ڈیوک آف یارک نے اُس فیصلہ کن مشہور بحری جنگ میں حصہ لیا جو جزیرہ نمائے جٹلینڈ کے سامنے ہوئی اور جس میں انگریزی جنگی بیڑے نے جرمنی کی بحری طاقت کا خاتمہ کردیا

۱۹۱۵ء کے اکتوبر میں فرانسیسی محاذ پر ایک ایسا افسوسناک واقعہ پیش آیا جس سے ملک معظم کی ذات اقدس کو چشم زخم پہونچا۔ ۲۸۔ اکتوبر کو جبکہ بادشاہ سلامت بمقام ہیور (Havre) انگریزی فوج کے کیمپ کا معائنہ فرماچکے تھے اور فرانسیسی فوجوں کی ہمت افزائی کرکے فرانسیسی پریسیڈنٹ کے ساتھ اپنی فوجوں کا معائنہ فرمارہے تھے کہ اسی اثناء میں فوجی طیاروں کی ایک ٹکڑی چیرز لگاتی ہوئی آپ کی طرف بڑھی۔ اس شور و غل سے ملک معظم کا گھوڑا چراغ پا ہوگیا اور آپ زمین پر آرہے جس سے جسم اقدس پر سخت چوٹیں لگیں۔ مگر کچھ دنوں بعد حضور انور شفایاب ہوگئے۔

غرض اعلیحضرت ملک معظم نے پانچ مرتبہ فرانس جاکر انگریزی سپاہ کی ہمت افزائی فرمائی۔ سب سے پہلا سفر دسمبر ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ یہ ایک سو ستر برس کے بعد پہلا موقعہ تھا کہ انگلستان کے کسی بادشاہ نے فرانس جاکر اپنی فوج سے شرکت کی ہو۔ حضور معظم کا سب سے زیادہ کامیاب مگر تکلیف دہ سفر مارچ ۱۹۱۸ء

یں ہوا جبکہ جرمنوں نے جان توڑ آخری حملہ کیا۔ اعلیٰحضرت اس حملہ کے وقت تین روز تک دورہ فرماتے رہے اور زخمیوں سے شگفتہ پیشانی سے بات چیت کرکے ان کو مبارکباد دیتے رہے

آخر کار جنگ عظیم میں سلطنت برطانیہ کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور دنیا میں امن واماں قائم ہوگیا۔ مال غنیمت میں سب سے بڑا حصہ برطانیہ کو ملا۔ افریقہ کی تمام جرمن نوآبادیاں، خط استوا کے جنوب میں بحرالکاہل کے تمام جرمن جزیرے، مصر و سوڈان، فلسطین، شرق اردن، اور عراق تمام زرخیز ممالک برطانیہ کے حصہ میں آئے۔

جنگ کے بعد چند قابل ذکر واقعات اور پیش آئے۔ یعنی ۱۹۱۹ء میں تیسری جنگ افغانستان ہوئی جس میں افغانستان کو انگریزی سیادت سے آزاد کردیا گیا اور اس کی کامل آزادی و خودمختاری تسلیم کرلی گئی۔ ۱۹۲۰ء میں عراقی قبائل خصوصاً کردوں نے بغاوت کی جنھیں فوراً کچل دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں ملیبار کے موپلا لوگوں نے شورش کی جو فرو کردی گئی، عرصہ تک وزیرستان میں قبائل سے جھڑپیں ہوتی رہیں، بلکہ ان کا سلسلہ ابتک جاری ہے۔

جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد پرانی دنیا بالکل نئی ہوگئی، حکومتوں کے تختے اُلٹ گئے، بادشاہوں کے تاج سروں سے اُتر گئے اور اس وقت کئی درجن بادشاہ اور شاہنشاہ زادے خانماں برباد پھر رہے ہیں لیکن بفضلہ تعالیٰ ملک معظم کی سلطنت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اور ملک معظم کے زیر سایہ تقریباً دو تہائی دنیا سکھ کی نیند سو رہی ہے۔

لطفِ سخن

(از جناب تسکین سورونوی)

نگاہِ شوق جو صورت گرِ مجاز نہ ہو
تو حُسن و عشق میں پھر کوئی امتیاز نہ ہو

نظر بھی آئے تو آنکھوں کو امتیاز نہ ہو
نظر نواز اگر حُسنِ بے نیاز نہ ہو

تو ہی بتا دے الٰہی کہ کس طرح انساں
خطا سرشت تو ہو اور خطا نواز نہ ہو

درازیِ شبِ غم کی دعائیں کرتا ہوں
غرض یہ ہے کہ مری زندگی دراز نہ ہو

ہزاروں مست ہیں اُنکے اور اہتمام یہ ہے
کسی کے سامنے ظاہر کسی کا راز نہ ہو

مزے ملے ہیں کچھ ایسے غمِ محبت میں
یہی دعا ہے کہ اب کوئی چارہ ساز نہ ہو

ہر ایک سانس پہ اب میرا دم نکلتا ہے
میں ڈر رہا ہوں کہ یہ بھی کسی کا ناز نہ ہو

غریب ہو تو رہے پاسِ وضع ہی تسکین
کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہ ہو

روحِ کلامِ غالب

(از مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی)

غالب غزل کا بادشاہ تھا اُس نے اس صنف سخن کی ماہیت کو خوب سمجھا ہے۔ غزل کی تعریف مختصراً یہ ہے کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخلی ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہویدا ہو سکے اور اس کی وسعت ادراک کا پتہ چل سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ جملہ اصناف سخن میں غزل گوئی جتنی آسان ہے اتنی ہی دشوار ہے۔ اگر غزل غزل ہو تو اس کو بوستانِ نظم کا ایسا قطعہ کہنا چاہیئے جس کی روشیں غیر مسلسل اور نامربوط ہونے کے باوجود بیحد دلکش اور روح افزا ہیں۔ جس طرح آسمان پر چھٹکے ہوئے تاروں کی بے ترتیبی ان کی نور آفرینیوں کو جلا دے دیتی ہے اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر اشعار اُس کے حُسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور با اینہمہ نامربوطی دیے نظمی "کلّ جدیدٌ لذیذٌ" کا مصداق بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شعر نئی تخیُّل کا حامل ہوتا ہے اور ہر تخیُّل میں نئی نئی نکتہ آفرینیاں ہوتی ہیں کہیں فلسفۂ اخلاق وتصوف کے گوناگوں رموز عالم حیرت واستعجاب طاری کر دیتے ہیں تو کہیں جذبات حُسن ومحبت کی بوقلمونی مسحور و بیخود بنا دیتی ہے۔ غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ اس کا ایک ایک شعر اس معیار پر پُورا اُترے گا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا کلام جب پڑھیئے نیا لُطف آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کلام میں اکثر اشعار شرح طلب ہیں اسی لئے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی موشگافیاں کی گئی ہیں۔ یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے کہ یہ شروح وحواشی اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ غالب کے سوا زبان اُردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ اور نہ صرف اِس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیات شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعرا کے مقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گذشتہ بست سالہ زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو جس بلند آہنگی کے ساتھ سراہا گیا ہے اور اس

ل مدحت طرازی کی گئی ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے ان ضخیم شرحوں کے علاوہ ملک کے نامور مصوّر چغتائی کا دیدہ زیب "مرقع" اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں

کلام غالب کی قدر و منزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے انیسویں صدی کے آخر میں "یادگار غالب" لکھ کر رکھا تھا آج "روح کلام غالب" کی اشاعت سے پایۂ تکمیل کو پہونچ رہی ہے کسی شاعر کے لئے یہ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعرا اس کی دو چار چیدہ غزلوں کے اشعار پر مصرعہ لگائیں اور ان کی تضمین کرکے اپنے کلام میں شامل کرلیں لیکن اُردو کیا فارسی میں بھی کوئی مشہور سا مشہور شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان کی تضمین کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدر افزائی میں یہ ہی ایک کمی تھی جس کو "روح کلام غالب" (جو غالب کی تمام غزلوں کی تضمین ہے) بدرجۂ اتم پورا کرے گی اور اس لحاظ سے غالب کے توصیفی لٹریچر میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کرنا چاہیئے

اُردو ادب میں تضمین کا رواج در اصل فارسی کا اتبّاع ہے۔ اُردو میں فارسی غزلوں کی بھی تضمین کی جاتی ہے، اکثر شعرا خود اپنی غزل کی بھی تضمین کرتے ہیں۔ یہ تضمین دو قسم کی ہوتی ہے۔ مثلث اور مخمس۔ مثلث میں اول مصرعہ تضمین کا ہوتا ہے۔ اور دو مصرعہ اصل غزل کے جس کی تضمین کی جائے۔ مخمس پانچ مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعہ تضمین کے ہوتے ہیں اور دو اصل غزل کے۔ اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف "روح کلام غالب" نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے۔ یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین مصرعے اپنے چسپاں کئے ہیں۔

تضمین کی صرف یہ ہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے دست و گریباں ہو جائیں بلکہ اُن سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کتنے ہی دقیق اور لاینحل ہوں اس لطافت کے ساتھ نمایاں کر دیا جائے کہ پوری تضمین ایک ہی دل و دماغ کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر آتے ہیں لیکن چونکہ اول سے آخر تک ہر غزل کی تضمین کی گئی ہے اس لئے اگر کہیں کہیں یکساں زور قلم نسبتاً نہ پایا جائے تو الشاذ کالمعدوم کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تضمین کرنے میں اپنی پوری قوت شاعری صرف کرکے کلام غالب کی شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ مشکل ترین اشعار

کے معانی اور مطالب اس طرح واضح ہوجاتے ہیں کہ کسی شرح کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام شرحوں پر فوقیت حاصل ہے اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ غالب کے جن مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شارحین نے نثر میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دئے ہیں اُن کو مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت وبلاغت کے ساتھ لکھدیا ہے کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور بیساختہ زبان سے نکل جاتا ہے

آفتاب آمد دلیل آفتاب

غالبًا اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالب اور مرزا مرحوم دونوں فطری شاعر تھے۔ مرزا مرحوم خود بھی ایک دردمند دل رکھتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جو درد غالب کے کلام میں ہے اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی خواجہ حافظ نے خوب فرمایا ہے:۔

بنال بلبل اگر بامنت سر یاریست　　　که ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاریست

جب وہ درد رسیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی داستانِ غم سناتا ہے تو سُننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہے۔ یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پر پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ذرا اس بے زباں دل کی صدا سُن　　　کچھ اپنی قدردانی کا گلہ سُن
یہ لعل بے بہا کہتا ہے کیا سُن　　　سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اِس اپنی آرزو پہ مر مٹا ہوں　　　کہ نصب العین چشم سرمہ سا ہوں
ہمہ تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں　　　نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافلہائے تمکیں آزما کیا

ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب　　　اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب
مجھے امیدِ کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب　　　یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

کیا خوب شرح کی ہے ؂

جنوں مانع ہوا اُستاد کا احساں اٹھانے سے   فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے
رہا انکارِ عقلِ کل کو غیرِ لا بتانے سے   نہ تعلیم درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

ایک مقطع کی تضمین مُلاحظہ ہو جس میں غالب نے بوڑھاپے کا رونا رویا ہے ؂

کیئے مرزا کا حال کیا غالبؔ   بے طرح ضعف ہو گیا غالبؔ
ہے یہ پیری بھی کیا بلا غالبؔ   مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

غالبؔ کے ایک شعر کی جس میں توحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے تضمین کے تین مصرعوں میں ایسی شرح کی گئی ہے جس سے شاعر کا مافی الضمیر صاف سمجھ میں آ جاتا ہے لکھتے ہیں۔

ہیں موحّد بجدا شرک ہے دل سے مقصود   ہم معبّد ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود
رو بقبلہ ہیں تو صرف ایک جہت ہے مقصود   ہے برے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غالبؔ نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کر کے عاشق کی خوش نصیبی انوکھے طرز سے ثابت کی ہے جس میں زلفوں کی پریشانی کو شبِ وصال میں لطف کا سبب ظاہر کیا ہے۔ اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت مزہ دے گئی ہے۔ تضمین نگار نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں کہتے ہیں:۔

بزم میں جو ہمنشیں تیرا ہے راتیں اُس کی ہیں   صبح نظارہ میں کر دیتا ہے، راتیں اُس کی ہیں
اس سے بھی وہ خوش نصیب اعلیٰ ہے راتیں اُسکی ہیں   نینداس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ایک شرح طلب شعر کی منظوم شرح ذیل کی تضمین میں ملاحظہ ہو:۔

ہنسی یاروں نے کیا کی ایک نصیحت مجھکو فرمائی   نہ اب وہ جوشِ وحشت ہے نہ فرطِ ناشکیبائی
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا ساماں رسوائی   نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

جب غالب دہلی سے لکھنؤ کے سفر کے لئے اس اُمید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے کچھ امداد لے کر نجف اشرف اور حرم محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک غزل لکھکر ان جذبات کا اظہار کیا۔ اس غزل کے دو شعروں کی تضمین قابل ملاحظہ ہے۔ کس خوبی سے واقعات کی تصویر کھینچی ہے۔

عقل حیران ہے کس وجہ سے چھوڑی دہلی کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی
یک بیک چھوڑدی کیوں الفت و راحت گھر کی لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھُلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

جب چلے گھر سے تو تھی دل میں یہاں اور ہی لہر بیٹھ رہنا ہمیں اور ترکِ سفر ہے اک قہر
قصد ہے دور کا مانع جو نہ ہو گردش دہر مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

غالب نے اکثر موقعوں پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے، اور یہ اُن کی فہم کا قصور ہے۔ اس مطلب کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو کیا خوب کہا ہے:-

میری سخنوری یہ عبث قیل و قال ہے مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے
کہتا ہوں سب کچھ اور زباں میری لال ہے گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے شعر بھی ہیں جو سہل ممتنع کا حکم رکھتے ہیں، ایسی غزل کے ایک شعر کی تضمین نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو جس میں تضمین کی زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے مل گئی ہے۔

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے حاصلِ گریۂ و بکا کیا ہے
اِس تڑپنے سے مُدعا کیا ہے دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے
آخر اِس درد کی دوا کیا ہے

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تضمین کے نمونے پیش کر دیئے ہیں تاکہ ناظرین "روح کلام غالب" کی خوبیوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم ہو سکے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو مخمس بنا کر وسعت دینے میں کہاں تک کامیابی

ل کی ہے اور غالب کی اس آرزو کو کہ اُن کے بیان کی وسعت کے لئے تنگنائے غزل
یادہ وسیع میدان درکار ہے کس حد تک پورا کیا ہے۔ غالب کے اسی مضمون کے شعر کی
ن میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

سخن میں چاہیئے کوئی جدید طرزِ عمل — کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل
نہ کیوں ہو حدِ تغزل میں رہ کے جی بیکل — بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مرزا مرحوم کی تضمین کے متعلق اس قدر لکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے شاعروں
جو غالب کی بعض غزلوں کے خمسے کئے ہیں اُن کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی تضمین کا کیا درجہ ہے
ل کے طور پر میر مہدی مجروح دہلوی کے خمسوں کو جو غالب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے مرزا مرحوم
خمسوں کے بالمقابل درج کرتے ہیں۔ مبصر اور ناقد ان کو پڑھکر خود رائے قائم کریں:۔

مرزا	مجروح
یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا	م نخوت سے کچھ روا نہ ہوا
کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا	حاجت کسی پہ وا نہ ہوا
تجھ پہ احساں طبیب کا نہ ہوا	کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا
درد منت کش دوا نہ ہوا	درد منت کشِ دوا نہ ہوا
مَیں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا	مَیں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
ہو گے رُسوا تمھیں کہا مانو	ے خدا رحم اِن حبیبوں کو
بات بڑھ جائیگی بہت یوں تو	جلائیں نہ بد نصیبوں کو
بِل کے سُن لو الگ جو سُنتے ہو	رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو	جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اِک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا	اِک تماشا ہوا گِلہ نہ ہوا
اور تجھ سا حسیں کہاں سے لائیں	ل عبث جاکے اپنا سر ٹکرائیں
حسرتِ دل کی داد کس سے پائیں	تی احسان کیوں کسی کا اٹھائیں
کس کے ہاتھوں سے زخم دل پر کھائیں	اُس سے جب آرزوئے دل ہی نہ پائیں
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں	ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
رکھتا لذت جو ہے دہانِ حبیب
شہد و مصری کو وہ کہاں ہے نصیب
کیا کہوں بات ہے عجیب و غریب
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
فکر کی قسمت آزمانے کی
یعنی اُس شوخ کو بلانے کی
یہ سُنو بات دل جلانے کی
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جب سے عقل و تمیز آئی تھی
تیرے ہی در پہ جبہہ سائی تھی
دمبدم عاجزی فزائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
اس کی بخشش نے کی ذرا نہ کمی
کچھ تلافی یہ ہم سے ہو نہ سکی
کیا بڑی بات ہم نے کی ایسی
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
اُن کے جب بحرِ فکر بہتے ہیں
ہم تو مجروح غرق رہتے ہیں
آپ کیوں طعن و طنز سہتے ہیں
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
سخنِ تلخ کب ہے اُن کے قریب
اُن سے باتیں سُنے یہ کس کے نصیب
ہے حلاوت ہی کچھ سخن میں عجیب
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
جب ہمیں دُھن تھی اُن کے لانے کی
استطاعت تھی گھر سجانے کی
اب جو بدلی ہوا زمانے کی
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان طاعت ہی میں کھپائی تھی
کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی
سر تھا سجدہ تھا جبہہ سائی تھی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
قابلِ فخر کیا ہے بات اپنی
عین احساں ہے اُسکی خوشنودی
ہم نے اُس پر نثار کیا شئے کی
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
مثلِ مرزا مصروہ رہتے ہیں
جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹ بہتے ہیں
سب غمِ انتظار سہتے ہیں
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

لاتقنطو نوید ہے اُم الکتاب میں
زاہد گناہِ خلق ہیں واں کس حساب میں
ہے عرض یہ جنابِ تقدس مآب میں
کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
گو آرزوے دید میں مَیں بیقرار ہوں
ہرگز وہ یاں نہ آئیں گے میں گو طلب کروں
پر کچھ تو شغل چاہیئے بیکار کیوں رہوں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں
شادی و غم کو عشق میں اک ارتباط[1] ہے
اس میں کبھی حیات ہے گاہے ممات ہے
ہے طُرفہ حال اور نئی واردات ہے
مَیں اور حظِّ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
حکمِ خدا میں گو لبِ چون و چرا ہے بند
مالک ہے وہ حقیر کرے خواہ سربلند
پر دل تو اس خیال سے رہتا ہے فکرمند
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
ہمدرد قہر نے بتِ خانہ خراب کے
اوسان کھودئیے دلِ بے صبر و تاب کے

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

جامِ سبو کو رکھ نہ بچا کر سحاب میں
شامل نہ کر صبوحی کو شب کے حساب میں
واں کچھ کمی نہیں کرے ہے تو اضطراب میں
کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
لکھ تو دیا نہیں کہ مرا حال ہے زبوں
ہے اُن سے آرزوئے تسلّی نرا جنوں
آگاہ اُن کی عادت و خصلت سے خوب ہوں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں
وہ آج میرے گھر چلے آئے مستِ مَے
شکر خدا کہ ہو گئے قصّے تمام طے
جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے
مَیں اور حظِّ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
یا تو ملائک سے بھی تھا مرتبہ بلند
ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب خوار و مستمند
پہونچا رہا ہے ہر متنفس ہمیں گزند
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
بے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے
لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے

[1] ارتباط کی ط کو ت سے بدلکر اسکو ممات واردات اور بات کا ہم قافیہ کرنا صریح غلطی ہے معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے شروع ہوئی ہے

آثار ہم سمجھ گئے اُن کے عتاب کے
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

ہے اِک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

اہلِ نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود
ہے اُس کی ذات پاک سے ہر چیز کی نمود

ہر ایک کو نہیں خبرِ نیستی و بود
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

میں لاکھ جاں سے اپنی فدا اُس پہ ہوں مگر
میری اذیتوں سے خوشی ہے وہ فتنہ گر

ہے یار میرا دشمنِ آرام کس قدر
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

رکھتے ہیں گو نہاں وہ جمالِ نظارہ سوز
سامانِ زیب رہتا فراہم مگر ہے روز

نکھ سُکھ سے تا درست رہے روئے دلفروز
آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز

پیشِ نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

تا ہو نہ اُس کو میرے اُٹھانے میں اہتمام
محفل میں اُس کی ہم نے نہ رکھا کسی سے کام

یاں تو صفِ نعال میں رکھا سدا مقام
مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

گہ شوخیاں جتا کے ملانا نگاہ کا
گہ شرمناک ہو کے پھرانا نگاہ کا

آثار بات بات میں ہیں پیچ و تاب کے
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

اشیا کی ہے تصور اشیا سے سب نمود
دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب وجود

ہستی کے واہمے کی بدولت ہے ہست و بود
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کیا کہیے ہوتی تھی شبِ غم کس طرح بسر
اختر شماریوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر

توڑا ستم یہ اور نیا چشمِ شوق پر
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

گو خود نما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز
نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز

ہے محوِ ناز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز
آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز

پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

رہتے تھے ہم پیالہ جہاں اُن سے خاص و عام
اُٹھتا تھا ایسی بزم سے میں روز تشنہ کام

پینے میں آج مجھکو نہ ہو کس طرح کلام
مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

آتا ہے یوں تو اُن کو لڑانا نگاہ کا
نظریں بچا کے سب کی ملانا نگاہ کا

اندازِ دلبری سے جھکانا نگاہ کا
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
جب تک کہ پھیرِ خاص مقدر ہی کا نہ جائے
بنتا نہیں ہے کام کوئی لاکھ گر بنائے
اس بات کا یقین کوئی کس طرح سے لائے
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
مقدور تک تو سعی میں یاں دست و پا ملائے
پر کیا کریں مراد ہی جب کوئی بر نہ آئے
یہ حال ہو تو خاک محبت کا لطف آئے
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
ملکِ عدم کے دیکھئے عازم یہ کیا بنے
اس رو میں ڈر بہت ہیں نشیب و فراز کے
پر جس میں بس ہی اپنا نہ ہو اس میں کیا کرے
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
مجروح کو اس امر سے ہے خوب آگہی
اب وہ نہیں ہے بادہ پرستی جو پہلے تھی
بالکل ہی ترک مے ہو یہ ممکن نہیں ابھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

آفت ہے اُف مگر یہ اٹھانا نگاہ کا
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے
مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے
لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
وہ نالہ جو کہ عرشِ معلّٰی کو بھی ہلائے
وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے
وہ نالہ اور کان تک اُس شوخ کے نہ جائے
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے
لیتا نہیں عدم سے ادھر دم کہیں اسے
بے اختیار ہوں نہیں مجھکو گرا نہ دے
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی
دیکھا نہ ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

جوگی

(از پرنسپل رام پرشاد صاحب کھوسلہ ناشاد، ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس)

ہیں ڈھونڈھ رہی آنکھیں تجھ کو نت اک درشن کی بھوکی — دن رات ہوں جنگل میں تجھ بن تو آ جوگی تو آ جوگی

تو آس بندھا دے نراسوں کی تو پیاس بجھا دے پیاسوں کی — دن رات تڑپتی جیتی ہے وہ پریم کا گھونٹ پلا جوگی

اس گھر کو تجھ کو گھر اپنا دو چار گھڑی تو دم لے لے — کیوں آئی ہیں بدلی تیرے مارا تو نے بھبھوت رما جوگی

آواز سے ہوش بھلا دے تو، انداز سے مست بنا دے تو — کچھ ایسے سر چھیڑ دے تن کی من کی کوئی میٹھی تان سنا جوگی

گر پریم نگر کا باشی ہے، کس جنگل کا تو مت بلاشی ہے — کیوں کر یہ امتحاں کاشی ہو، تو بیٹھ کے دھونی رما جوگی

کیا بات ہے وہ جس کے کارن یہ بھیس کیا تو نے دھارن — کس بات سے تیرا من کا مرتا کیوں تو نے جوگ لیا جوگی

سنسار سے کیوں تنگ آیا ہے تو من کو کیوں کلپاتا ہے — کیوں در در الکھ جگاتا ہے کوئی پریم کا راگ سنا جوگی

کیوں اپنوں سے منہ موڑا ہے سنسار سے رشتہ توڑا ہے — گھر بار کو تو نے چھوڑا ہے کچھ دل کا حال سنا جوگی

کیوں انگ بھبھوت رمائی ہے کیوں جوگ کی دنیا بسائی ہے — کس دھن میں ہوا سودائی ہے تو دل کا بھید بتا جوگی

کیا عشق نے چوٹ لگائی ہے کس بت پہ طبیعت آئی ہے — کیا حسن کا تو سودائی ہے کیوں بیکل ہو آتا جوگی

کیوں جھوٹا جوگ کماتا ہے کیوں جھوٹا بھیس بناتا ہے — کیوں جھوٹے بول سناتا ہے تو سچ کی ڈگر پر آ جوگی

کیوں دھونی کو گرماتا ہے کیوں اپنا آپ جلاتا ہے — جب تجھ میں پریم کی آگ نہیں دھونی کو آگ لگا جوگی

سچ مچ کا یہ ویراگ نہیں جب تجھ میں پریم کی لاگ نہیں — یہ راگ بیاگ کا راگ نہیں تو ست کا تار بجا جوگی

جس جوگ سے تن کو روگ ہو جس جوگ سے من کو سوگ نہ ہو — جس جوگ سے جیتا بھوگ نہ ہو کوئی ایسا جوگ کما جوگی

کہسار میں ٹھوکریں کھاتا ہوں رہ ملتی نہیں گھبراتا ہوں — منزل سے بھٹکا جاتا ہوں تو بن جا راہنما جوگی

یہ دنیا ہے مستانوں کی یہ محفل ہے دیوانوں کی — ہے بھیڑ لگی بیگانوں کی تو اپنا آپ بچا جوگی

تو جوگ کا اپنے راز بتا تو معنیِ عجز و نیاز بتا — اس ہستی کا انداز بتا ہے اصل حقیقت کیا جوگی

تو مجھ کو سمجھ نادان نہیں سب جانتا ہوں انجان نہیں — میں دنیا دار انسان نہیں ہے چشمِ حقیقت وا جوگی

ہے جادو منتر یاد اگر سن سکتا ہے فریاد اگر
ہے در پہ ترے ناشاد اگر تو اس کو شاد بنا جوگی

اصلاح دیہات اور اسکا پروگرام[1]

تعلیم نسواں

(از شیخ سعید الدین احمد صاحب محکمہ کوآپریشن پنجاب)

دیہاتی آبادی جن آلام و مصائب میں مبتلا ہے، ان میں سب سے موذی مرض ان کی جہالت اور لاعلمی ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے اور ہمارا مقابلہ اُن اقوام سے ہے جن کے ہاتھ میں عناصر اربعہ کی باگ ڈور ہے ہمیں واسطہ اُن قوموں سے پڑا ہے جن کے ہوائی جہاز فضائے بسیط میں مصروف پرواز ہیں، جن کی کشتیوں اور جہازوں نے سمندر کی پشت کو مرکب بنا رکھا ہے۔ ہم میدان ترقی میں اُن لوگوں کے ساتھ گامزن ہیں جو کبھی تو اپنی لاسلکی کے ذریعہ سے سات سمندر پار امریکہ اور یورپ کی باتیں اس طرح سنتے ہیں جس طرح ہم ایک دوسرے کی بات سُن سکتے ہیں۔ اور کبھی وہ اپنے علم سے صحراؤں بیابانوں سمندروں اور دریاؤں پہاڑوں اور وادیوں کو عبور کر کے طیاروں اور ہوائی جہازوں پر سوار ہو کر ادھر سے اُدھر بلا روک ٹوک چلے جاتے ہیں۔ علم ہی کی بدولت آج یہ لوگ زمین و آسمان پر حکمرانی کرتے ہیں علم ہی کے طفیل یہ سمندر کی تہ میں اپنی آبدوز کشتیاں اور تارپیڈو چلا رہے ہیں، اور علم ہی کے ذریعہ سے یہ اقوام عالم میں ممتاز اور باعزت خیال کیے جاتے ہیں۔

وقت کا سب سے ضروری مسئلہ اور اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے ملکی بھائیوں میں کسی طرح تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا کہ ہم قعر مذلت کی گہرائیوں سے نکلکر معراج کمال تک پہنچ سکیں مفکرین نے اس کا حل "تعلیم نسواں" قرار دیا ہے، اس لئے ہمیں چاہیئے کہ جس طرح ہو سکے اس بات کی کوشش کریں کہ ہماری بہنیں اور بچیاں جلد از جلد تعلیم حاصل کریں، جس گھر کی عورتیں تعلیمیافتہ ہونگی اس گھر کے بچے عام طور پر سنجیدہ اور سُلجھے ہوئے ہونگے علم ہی ایسی طاقت ہے جو تنازع للبقا کے لئے تیر و تفنگ سے کہیں زیادہ کارآمد ہے، لہذا ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ ہماری اولاد میں تعلیم حاصل کرنے کا ذوق اور شوق پیدا ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تعلیم نسواں ہی پر قوموں کی تمدنی اور معاشرتی ترقی کا انحصار ہوتا ہے۔ ترکوں

---

[1] سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو "زمانہ" بابت جون، اگست و دسمبر ۳۴ء و فروری ۳۵ء

نے اگر اس قدر ترقی کی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ مصر نے اس قدر ترقی کی تو اس کا باعث کیا ہے جاپان دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے تو اس کا سبب کیا ہے، انگلینڈ اگر علم و ہنر اور تہذیب و اخلاق میں اقوامِ عالم سے بیش از بیش ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ ان تمام ممالک کی ترقی کا راز تعلیم نسواں میں مضمر ہے۔ وہ ملک جس میں خالدہ ادیب خانم جیسی مائیں اور بہنیں ہوں کیوں ترقی نہ کرے۔ وہ قوم جس کی عورتیں زیورِ تعلیم سے آراستہ اور پیراستہ ہوں کس طرح ممتاز نہ ہو۔ اس ملک کے نوجوان جس کی عورتیں لکھی پڑھی ہوں کیونکر مہذب اور متمدن نہ کہلائیں۔ مائیں اور بہنیں اوائل عمر ہی سے اپنے بچوں اور بھائیوں کی کچھ ایسی تربیت کرتی ہیں کہ وہ بڑے ہو کر دنیا میں نام پیدا کرتے ہیں۔

نوجوانوں کا اخلاق اُن کی ماؤں اور بہنوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اُن کی آئندہ زندگی کا انحصار اُن کے مستقبل کا دارو مدار اور اُن کی عزت و وقعت اور قدر و منزلت اُن کی تربیت پر مبنی ہوتی ہے بچہ کی تربیت باپ نہیں کر سکتا ماں کر سکتی ہے، اور ماں میں اعلیٰ تربیت کی صلاحیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ تعلیم یافتہ ہو۔ اس لئے ہمارے ملک کی فلاح و بہبود تعلیم نسواں میں مضمر ہے۔

تعلیم نسواں ہی ایک ایسی نعمت ہے جس کے طفیل ہم اپنی معاشیاتی، اقتصادی، اخلاقی علمی اور تمدنی حالت کو سدھار سکتے ہیں۔ اگر ہماری عورتیں پڑھی لکھی ہونگی تو وہ بچوں کو صاف ستھرا اور سردی گرمی سے محفوظ رکھیں گی، آداب و اخلاق سکھائیں گی، ابتدائی تعلیم دینگی جس سے بچوں کی صحت اچھی ہوگی، اُن میں شائستگی اور تہذیب پیدا ہو جائیگی، جو ہمیشہ ان کی کامیابی اور کامرانی کا باعث ہونگی۔ مہذب ممالک کے نوجوان آجکل اسی لئے تہذیب و ترقی اور علم و ہنر کے علمبردار بنے بیٹھے ہیں کہ اُن کی ماؤں اور بہنوں نے ان کی طبائع میں ایک خاص قسم کی شائستگی اور تہذیب پیدا کر دی ہے الغرض تعلیم نسواں ہی وہ تیغ آبدار ہے جس سے اقلیم جہالت کی بنیادوں کو منہدم کیا جا سکتا ہے۔

بدقسمت ہندوستان کے باشندوں کو ابھی تک اس بات کا علم ہی نہیں کہ تعلیم نسواں کا ملک کی فلاح و بہبود کے ساتھ کہاں تک تعلق ہے، محض چند خواتین تعلیم یافتہ ہیں جن کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے، اس لئے موجودہ صورت حالات سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہمیں سروجنی نائیڈو، بیگم شاہنواز اور لیڈی عبد القادر جیسی مائیں پیدا کرنا چاہیئے۔ مہذب ممالک کے دوش بدوش چلنا ہے تو ہمیں چاہیئے کہ مس خدیجہ بیگم، کملا نہرو اور شریمتی لکھوتی جین جیسی بہنیں پیدا کریں۔ ہمارے ملک میں ظلم اِستاروں کے بجائے اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی بہتات ہونا چاہیئے۔

ہمارے ملک میں کوئی لڑکی اگر تحصیل علم کے لئے مدرسے جاتی ہے تو ماں باپ سخت تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ لڑکی اگر مدرسے نہ جاتی تو ہمارا یہ کام کیوں بگڑتا اور اگر لڑکا اسکول نہ جاتا تو ہمیں کھیت سے چارہ لانے کی تکلیف خود ہرگز نہ برداشت کرنی پڑتی۔ مویشیوں کو چرانے کے لئے اتنا تردد نہ کرنا پڑتا۔ ان بیچاروں کو یہ خبر ہی نہیں کہ تعلیم کے نتائج کیا ہیں۔ اگر ہمارے زمیندار بھائیوں کے بچے تعلیم یافتہ ہوں تو انھیں معلوم ہو کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔ دس من غلہ کی قیمت کیا ہوتی ہے۔ ساہوکار کے سود کا حساب غلط ہے یا درست، پٹواری صحیح اندراجات پر انگوٹھا لگواتا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ ان کے دل و دماغ میں علم کی نورانی شعاعیں ضوفشاں ہو کر انہیں توہم پرستی اور تنگ خیالی سے نجات دینگی اور جہل و نادانی ملک سے کافور ہونگے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم شاہراہ ترقی پر گامزن ہوں اور ہمارے عروج و اقبال کا آفتاب نصف النہار پر چمکے تو ہمیں تعلیم نسواں پر زور دینا چاہیئے۔

گورنمنٹ عالیہ نے ہماری علمی حالت کو سدھارنے اور بہتر بنانے کے لئے ملک کے گوشہ گوشہ میں مدرسے اور کالج قائم کر دیئے ہیں اور دیہاتوں میں اہل دیہات کی بہتری اور بہبودی کے لئے اسکول جاری ہیں۔ پھر بھی ہمارے دلوں میں تعلیم حاصل کرنے کا صحیح شوق اور جذبہ نہیں پایا جاتا۔ گورنمنٹ نے ہماری علمی کمزوری رفع کرنے کے لئے ایک علیحدہ وزارت قائم کی ہے جس کے ماتحت تعلیم و تدریس کی درسگاہیں ہیں لیکن ہم ان درسگاہوں سے کما حقہٗ مستفید نہیں ہوتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم کوئی ایسا انتظام کریں جس کی بدولت ہم اپنے بچوں کو ضروری تعلیم دلوا سکیں۔ بعض صوبوں میں حکومت کی طرف سے جبری تعلیم کے احکام نافذ ہیں لیکن جبری تعلیم سے لوگوں میں اس کی اہمیت کا احساس پیدا نہیں ہوتا اور یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جس چیز میں جبر و اکراہ ہوگا اس سے لوگ صحیح معنوں میں مستفید نہیں ہونگے۔

محکمہ امداد باہمی نے جہاں باشندگان ملک پر دیگر احسانات کئے ہیں وہاں انجمہائے لازمی تعلیم جاری کر کے ہیں صحیح معنوں میں احسانمند کیا ہے۔ ان انجمنوں کے ممبروں کا قواعد و ضوابط کے ماتحت فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے قابل تعلیم بچوں کو مدرسوں میں داخل کرائیں، جو ممبر اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان پر جرمانہ کیا جاتا ہے یا اور کوئی اخلاقی سزا دی جاتی ہے، مثلاً اُسے انجمن کی رکنیت سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے یا انجمن کی میٹنگ جو سزا تجویز کرے اُسے دیجاتی ہے۔ ان انجمنوں کا فائدہ تب ہی ہو سکتا ہے جب اہل ملک انہیں جاری کرانے کی خود خواہش کریں۔

آپ خیال فرمائیں کہ اگر تمام ملک میں اس قسم کی انجمنیں جاری ہوجائیں اور ہمارے بھائیوں کے دلوں میں انھیں مفید بنانے کا شوق ہو تو پھر اصلاح دیہات کا کام کس قدر جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔

اس لئے تمام بھائیوں کی خدمت میں ہماری یہی گزارش ہے کہ اگر وہ اپنے ملک کو خوشحال اور فارغ البال دیکھنا چاہتے ہیں تو براہ کرم اس امر پر زور دیں کہ ہماری لڑکیاں اور لڑکے تعلیم حاصل کریں۔ تمام مذاہب میں حصول علم کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ہندو دھرم میں روح کی شانتی اور طمانیت کا علاج علم ہی کو تصور کیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں اس چیز کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ مہاتما بدھ نے علم پر خاص زور دیا ہے۔ مسلمانوں کے بزرگان دین نے خدا کو پہچاننے کا معیار علم ہی کو مقرر کیا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ علم کی دولت حاصل کر کے اپنی گئی گذری آن بان حاصل کریں۔ ہمارا گم شدہ راستہ مشعل علم کی روشنی ہی سے ہمیں مل سکتا ہے۔ ہم علم ہی کی بدولت مہذب اور متمدن کہلا سکتے ہیں۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اپنی لڑکیوں کو لڑکوں سے پہلے تعلیم دلوائیں، وہ ایک دن مائیں بنکر اپنے بچوں کی صحیح تربیت کر سکیں گی اور ہماری بگڑی بنجائیگی۔

تمام لیڈروں، رہنماؤں، علماء، پنڈتوں، برہمنوں اور دھواں دھار تقریریں کرنیوالوں کا فرض ہے کہ جس طرح ہوسکے اپنے ملک کی بہتری اور بہبودی کے لئے اس وقت علم اور اس کی غرض و غایت پر زور دیں، خصوصاً تعلیم نسواں کا پروپیگنڈا کریں۔ اور اس طرح سے اپنی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد پر پہنچائیں۔

مسٹر الف۔ ایل۔ برین۔ ایم۔ سی۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ کمشنر اصلاح دیہات پنجاب کا اصول "لڑکیوں کو تعلیم دلاؤ" ایک زریں اور بہتری خیز اصول ہے اور اس پر ہمارے ملک کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔

سوز و ساز

از جناب چندر سین صاحب تمنؔ سوزی

روح کے کاندھے سے بار جسم ہلکا کر دیا — جان لیکر اُس نے بیمار دل کو اچھا کر دیا
حرکت دل موج ہے اور زندگی دریا کی موج — جب اجل آئی تو دریا نے کنارا کر دیا
مرنے پر بھی بار احساں سے سبکدوشی نہیں — دوش پر اُس نے اُٹھا کر لاش زندا کر دیا
دہر میں تنہا رہا عقبیٰ میں بھی تنہا رہوں — گوشۂ تربت میں بھی یار دل نے تنہا کر دیا
سوز پروانے جلے لیکن نہ رسوائی ہوئی — شمع نے خود جل کے راز عشق افشا کر دیا

وقتِ فراق

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

فرقت میں حالتِ دلِ ویراں نہ پوچھیے
تقدیر نے کیا ہے جو احساں نہ پوچھیے

جس دن ہوا تھا کوچ دیارِ حبیب سے
میں کس قدر تھا بے سروساماں نہ پوچھیے

یارانِ بزم، صبحِ وطن سی عزیز تھے
کیونکر بنی ہے شامِ غریباں نہ پوچھیے

ڈرتا ہوں سوچ کر کہیں بجلی نہ گر پڑے
کیا چیز تھی تبسمِ جاناں۔ نہ پوچھیے

سینے کو چھوڑ کر جو دھڑکتا ہو سانس میں
اس دل سے حالِ جنبشِ مژگاں نہ پوچھیے

جس نیم جاں مریض کی ہونٹوں پہ جان ہو
اس سے حکایتِ لبِ جاناں نہ پوچھیے

مرگِ طویل، نزع ہو جس شخص کی حیات
اس سے رموزِ چشمۂ حیواں نہ پوچھیے

رہ رہ کے گراں ہوتی ہی راتوں میں بار بار
ڈستا ہے دل کو کیوں مہِ تاباں نہ پوچھیے

ڈر ہے عروسِ وقت کی نبضیں نہ چھوٹ جائیں
شرحِ درازیِ شبِ ہجراں نہ پوچھیے

گاڑے ہوئے نصیب کی آندھی کے سامنے
کیونکر چراغ ہے تہِ داماں نہ پوچھیے

ڈالا ہے جس نے لا کے یہاں آہ عذاب میں
کیا اب بھی اس خدا پہ ہے ایماں؟ نہ پوچھیے

(۲)

وقتِ فراق کاکلِ برہم کی چھاؤں میں
افسردگیِ چہرۂ تاباں نہ پوچھیے

اس نازنیں کے جذبۂ بے اختیار سے
کیونکر چھپا تھی دست و گریباں نہ پوچھیے

افشائے رازِ عشق و محبت کے خوف سے
ان انکھڑیوں کا گریۂ پنہاں نہ پوچھیے

وقتِ سفر چھڑی تھی جو اک گوشہ منتظر
وہ داستانِ دیدۂ جاناں نہ پوچھیے

شرمندہ ہو نہ جائے کہیں رحمتِ خدا
اس بت کا التفاتِ فراواں نہ پوچھیے

اس غم میں بھی ہے جنس بقیدِ حیات جوشؔ!
اس شوخ کے وہ عہد وہ پیماں نہ پوچھیے

ہندوستان کے پچھلے پچیس (۲۵) سال

ہندوستان کے نقشہ پر مختلف صوبوں اور ریاستوں کا مجموعہ نظر آتا ہے، جس میں سیکڑوں زبانیں، بیسیوں مذہب اور درجنوں قومیں آباد ہیں۔ لیکن پچھلے پچیس سال کے اندر ملک میں قومیت کے جذبہ اور قوم پرستی کی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ اس اثنا میں اہل ملک کا زاویۂ خیال بہت کچھ بدل گیا ہے اور اب سبھی ہندوستانی بلا لحاظ زبان، قوم اور مذہب آزادی و خود مختاری کے خواہاں ہیں۔ رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ تغیر پیدا ہونا ضروری تھا، چنانچہ حکومت بھی قدیم مطلق العنانہ طرز حکومت میں تغیر و تبدل کرنے پر مجبور ہوئی، اور اس نے اصلاحات کی سب سے پہلی قسط وہ عطا کی جسے عرف عام میں "منٹو مارلے اسکیم" کہتے ہیں۔ اس کے رو سے صوبجات کی قانونی کونسلوں میں پبلک نمایندے منتخب کئے جانے لگے۔ وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل میں ایک ہندوستانی کی تقرری ہوئی۔ وزیر ہند کی کونسل میں بھی دو ہندوستانی ممبر مقرر ہوئے۔ کسی حد تک عوام کو ووٹ دینے کا حق عطا کیا گیا۔ خاص طبقوں کے لئے جداگانہ نیابت کا طریقہ جاری کیا گیا اور حکومت کے نامزد ممبروں کی تعداد غیر سرکاری ممبروں سے کم کر دی گئی وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح ہمارے ملک معظم جارج پنجم کے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی لارڈ منٹو کے زمانہ میں ہندوستان میں نیابتی حکومت کی بنیاد قائم ہو گئی۔

۶۔ مئی ۱۹۱۰ء کو شہنشاہ اڈورڈ ہفتم کی وفات پر ہز مجسٹی جارج پنجم تخت نشین ہوئے اور لارڈ منٹو کے بعد ۱۹۱۰ء میں لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہو کر ہندوستان آئے۔ یہ ہندوستانیوں کے نزدیک بہترین وائسرائے سمجھے جاتے ہیں۔ انھیں کے عہد حکومت میں ملک معظم اور ملکہ معظمہ ہندوستان تشریف لائے، اور ۱۲۔ دسمبر ۱۹۱۱ء کو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دہلی میں شاہ انگلستان نے بحیثیت شاہنشاہ ہند اپنا دربار تاجپوشی منعقد فرمایا۔ اس دربار دُربار کے طفیل جو برکتیں ہندوستان پر نازل ہوئیں اُن میں خاص طور پر قابل ذکر لارڈ کرزن کے تقسیم بنگالہ کی منسوخی ہے۔ صوبۂ بنگال کو گورنری صوبہ کا درجہ دیا گیا، صوبۂ بہار و اڑیسہ وجود میں آیا، آسام کو بنگال سے علیحدہ کر کے جداگانہ صوبہ بنایا گیا۔ تعلیم عامہ کے لئے مستقل طور پر پچاس لاکھ روپیہ سالانہ منظور کیا گیا۔

بنارس، ڈھاکہ، پٹنہ، میسور اور برما میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ سر سنکرن نائر وائسرائے کی
ایگزیکٹو کونسل میں ممبر قانون مقرر ہوئے، اور کلکتہ کے بجائے دہلی ہندوستان کا پایۂ تخت مقرر ہوا۔
لارڈ ہارڈنگ کا زمانہ ہندوستان کے لئے بہت مبارک ثابت ہوتا، اگر چند ہی روز بعد
جنگ عظیم نہ چھڑ جاتی۔ پھر بھی ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے بعض تدابیر اختیار کی گئیں،
مثلاً سرکاری ملازمتوں، اخراجات جنگ اور کرنسی وغیرہ کے متعلق بعض مسائل کو حل کرنے کیلئے
رائل کمیشن مقرر ہوا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقی اور وسعت دینے
کے لئے ایک صنعتی کمیشن بھی مقرر ہوا۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں ہندوستان نے جان اور مال سے انگلستان کی مدد کی۔ ہندوستان
کے فرزند عراق، فلسطین اور فرانس میں جاکر لڑے اور لاکھوں کی تعداد میں اپنے بادشاہ پر نثار ہوگئے
والیانِ ریاست نے بھی اپنی فوجیں اور ریاستی خزانے اور وسائل برطانیہ کو بے دریغ سپرد کردیئے۔
اور تقریباً ہر صاحب حیثیت ہندوستانی نے جنگی فنڈ میں کچھ نہ کچھ چندہ دیا اور جنگی تمسکات خریدے
غرض ہندوستان نے جرمنی کی یہ توقع خاک میں ملادی کہ برطانیہ سے جنگ ہونے کی صورت میں
ہندوستان میں بغاوت ہوجائیگی۔ اس کے برعکس جب جنگ چھڑ گئی تو تمام ہندوستانی لیڈروں نے
اپنے سیاسی اختلافات بالائے طاق رکھدیئے اور جنگ جیتنے کی تدابیر میں مصروف ہوگئے

ان واقعات کا ہماری سیاسی تاریخ پر بہت خوشگوار اثر پڑا۔ برطانیہ اور ہندوستان کے ارباب
حل و عقد نے ہندوستان کی وفاداری اور قربانیوں کو استحسان کی نظر سے دیکھا اور اس کا صلہ
سیاسی اصلاحات کی صورت میں دینا چاہا۔ لیکن چونکہ گورنمنٹ جنگ کی فکروں میں مبتلا تھی اسلیئے
اس طرف مناسب توجہ نہ کرسکی۔

ہندوستان میں اس تاخیر سے ایک سیاسی ہیجان پیدا ہوگیا۔ ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر اینی بیسنٹ
نے مسٹر تلک کی تائید و حمایت سے ہوم رول لیگ قائم کی۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے متفق و متحد ہوکر
مشترکہ جدوجہد شروع کی۔ ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ کے بجائے لارڈ چیمسفورڈ ہندوستان کے وائسرائے
ہوکر آئے اور مسٹر آسٹن چیمبرلین کی جگہ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند ہوئے اور دونوں نے باہمی صلاح و مشورہ
سے ہندوستان کیلئے آئینی اصلاحات کی اسکیم مرتب کی۔

۲۰۔ اگست ۱۹۱۷ء کو مسٹر مانٹیگو نے دارالعوام میں اپنا مشہور اعلان کیا جس کے رو سے
ہندوستان کے نظم و نسق کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کو رفتہ رفتہ دخل دینے کا وعدہ کیا گیا۔ اور

گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو سلطنت برطانیہ کے اندر بتدریج حکومت خوداختیاری عطا کرنے کا منشا ظاہر کیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء میں مسٹر مانٹیگو کی سرکردگی میں انگلستان سے ایک وفد بھی ہندوستان آیا جس نے ملک بھر میں چھ مہینے تک سیر و سیاحت کر کے حکام اور خاص خاص اہل ملک سے ملکر اصلاحات کے بارہ میں صلاح و مشورہ کیا، اور جدید انڈیا ایکٹ کے متعلق اپنی رپورٹ مرتب کی جس کے بعد ۱۹۱۹ء میں ہندوستان کو حکومت خود اختیاری کی پہلی قسط عطا ہوئی، جسکا ماحصل یہ تھا کہ:-

مرکزی نظم و نسق اور مختلف صوبجات کی حکومتوں میں ہندوستانی عنصر کا اضافہ کیا گیا۔ وائسرائے کی اگزکیٹو کونسل میں تین ہندوستانی ممبروں کا تقرر ہوا صوبوں کی اگزکیٹو کونسلوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے مختلف محکموں کے دو حصے کئے گئے۔ پولیس، مالیات، جیل وغیرہ کو صیغہ جات محفوظ کے نام سے سرکاری ممبروں کے سپرد کیا گیا اور دیگر محکموں کو صیغہ جات منتقلہ کے نام سے گورنروں کے مقرر کردہ ہندوستانی وزیروں کے ماتحت کیا گیا۔ وائسرائے کی قانونی کونسل کے بھی دو حصے ہوئے یعنی لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ۔ اسمبلی میں ایکسو چوالیس ممبر رکھے گئے جن میں ایک سو چار منتخب شدہ اور باقی نامزد کردہ ہوتے ہیں۔ کونسل آف اسٹیٹ میں ساٹھ ممبر رکھے گئے، تینتیس ۳۳ منتخب شدہ اور باقی نامزدہ۔ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو ایک حد تک آزاد و خود مختار کر دیا گیا اور انھیں اپنے چیرمین خود منتخب کرنے اور اپنے اخراجات کے لئے نئے ٹکیس اور محصول لگانے کے اختیارات دیے گئے۔ صاحب وزیر ہند کی کونسل میں بھی ہندوستانی ممبروں کی تعداد بڑھا دی گئی، اور ہر دس سال بعد اصلاحات میں ترمیم اور اضافہ کرنے کا وعدہ کیا گیا

لیکن ان اصلاحات سے ہندوستان کے بڑھتے چڑھتے حوصلوں کی تشفی نہ ہوئی اور اصلاحات کے خلاف بڑے زور شور سے ایجی ٹیشن ہوا۔ اسی کے ساتھ دہشت انگیزی کے بھی واقعات ہوئے گورنمنٹ نے حالات کو قابو میں لانے کے لئے مسٹر جسٹس رولیٹ کی صدارت میں مجرمانہ سازشوں کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی۔ جس کی رپورٹ پر رولیٹ ایکٹ مرتب ہوا۔ اس سے ہندوستان میں عام ناراضگی پھیل گئی اور پنجاب کے افسوسناک واقعات ہوئے۔ اور مہاتما گاندھی بھی سیاسی میدان میں آ گئے اور انھوں نے ستیاگرہ کی تلقین شروع کی۔ اس وقت سے ملک ہندوستان کی عنان سیاست مہاتما جی ہی کے ہاتھ میں ہے۔

پبلک ایجی ٹیشن کو دبانے کے لئے گورنمنٹ ہند نے سختی سے کام لینا شروع کیا۔ ترک موالات اور تحریک خلافت کے سلسلہ میں ہندوستان کے جیل خانے بھر دیئے گئے۔

اسی زمانہ میں افغانستان کی تیسری جنگ شروع ہوئی مگر یہ بہت جلد ختم ہوگئی اور ۸ اگست ۱۹۲۱ء کو نرتقین میں صلح ہوگئی۔ جس کی رو سے افغانستان کی آزادی تسلیم کی گئی۔ اسی زمانہ میں حضور ڈیوک آف کناٹ اور پرنس آف ویلز ہندوستان تشریف لائے اور مجالس قانون ساز کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ لارڈ سنہا کو صوبہ بہار و اڑیسہ کا گورنر مقرر کیا گیا یہ پہلا موقعہ تھا جو ایک ہندوستانی گورنر بنایا گیا۔

۱۹۲۱ء سے لارڈ ریڈنگ کا دورہ شروع ہوا۔ اس وقت ہندوستان میں تحریک نان کوآپریشن زوروں پر تھی۔ لیکن گورنمنٹ نے مستقل مزاجی سے کام لیا حتی کہ لوگوں کا جوش و خروش فرو ہوگیا۔ خود کانگریسی حلقوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو نے سوراج پارٹی کی بنیاد ڈالی اور اسمبلی اور صوبجات کی قانونی کونسلوں پر قبضہ کرنے کی کوشش ہوئی۔

اسی زمانہ میں پنجاب کے اندر اکالی تحریک شروع ہوئی جس کا اس قدر اثر ہوا کہ گورنمنٹ پنجاب نے قانون گوردوارہ منظور کرکے گوردواروں پر اکالیوں کا حق تسلیم کرلیا۔ اسی اثنا میں شمالی ہندوستان کے مختلف مقامات پر فسادات ہوئے جن میں دو سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں، اول تو جلیانوالہ باغ امرتسر، دوسرے چورا چوری کا واقعہ جس میں بلوائیوں نے ایک دیہاتی تھانہ پر حملہ کرکے بہت جانی نقصان پہنچایا تھا۔ مہاتما گاندھی پر مقدمہ چلا کر ان کو قید کی سزا دی گئی اور کراچی میں علی برادران پر بھی مقدمہ چلایا گیا۔ مالابار میں موپلا قوم کی بغاوت ہوئی

اور سوراج پارٹی کے قائم ہونے کا ذکر ہو چکا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں سوراج پارٹی نے بنگال اور صوبہ متحدہ کی کونسلوں پر قبضہ کرلیا اور اسمبلی کی بھی پینتالیس نشستیں کانگریس کے قبضہ میں آگئیں۔ لیکن گورنروں اور گورنر جنرل نے اپنے خاص اختیارات سے کام لے کر کونسلوں اور اسمبلی کے فیصلے بیکار کر دیئے جس کے باعث بعض اوقات بدمزگی اور تلخی سی پیدا ہوگئی۔ بنگال میں دہشت انگیزی کے دبانے کے لئے ایک نیا آرڈیننس جاری کیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں مسٹر سی۔ آر۔ داس کے انتقال کے بعد بنگال کانگریس میں دو پارٹیاں ہوگئیں۔ ہم ملک کی آئینی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ برطانیہ کی عنان لیبر پارٹی کے ہاتھ میں آگئی اور مسٹر ریمسے میکڈانلڈ وزیر اعظم ہوئے، جو ہندوستانی مطالبات سے بہت کچھ اظہار ہمدردی کر چکے تھے۔ گورنمنٹ نے جدید اصلاحات کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے سر الگزنڈر موڈیمین کے ماتحت ایک کمیٹی مقرر کی جس نے اصلاحات کے متعلق اپنی رپورٹ مرتب کی مگر یہ رپورٹ اس وقت شائع ہوئی جب لیبر گورنمنٹ ٹوٹ چکی تھی اور مسٹر بالڈون وزیر اعظم اور لارڈ برکنہیڈ وزیر ہند ہو گئے تھے۔ یہ رپورٹ متفقہ نہ تھی چند ممبروں نے جس میں سر تیج بہادر سپرو خاص طور پر قابل ذکر ہیں دوعملی حکومت کی مذمت کی تھی۔ مگر یہ رپورٹ کھٹائی میں پڑ گئی۔

لارڈ ریڈنگ کے بعد ۱۹۲۶ء میں لارڈ اروِن سا نیک نہاد شخص وائسرائے ہو کر ہندوستان آیا ان کی پالیسی بالکل مختلف رہی، وہ پکے مذہبی اور قول وفعل کے پابند رئیس زادے تھے انکی طبیعت قدرتاً امن پسند، صلح جو اور غریب پرور واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے کانگریس کے سامنے مصالحت کا ہاتھ بڑھایا، جسے دفتری حکومت کے شیدائی ہز اکسیلنسی کی کمزوری پر محمول کرتے تھے بہرحال لارڈ اروِن کے حُسن تدبیر سے صلح کے امکانات بہت زیادہ ہو گئے۔

۱۹۱۹ء کے انڈیا ایکٹ کی رو سے گورنمنٹ کو دس سال کے بعد جدید اصلاحات کے متعلق تحقیقات کرنا ضروری تھا۔ اس لئے برٹش گورنمنٹ نے حکومت ہند کے اتفاق رائے سے سر جان سائمن کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا جو فروری ۱۹۲۸ء میں ہندوستان آیا، چونکہ اس کمیشن کا کوئی ممبر ہندوستانی نہ تھا اس لئے ہندوستان کے سبھی مدبّروں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس پر بھی کمیشن نے اپنا دورہ جاری رکھا اور اس کے خاتمے پر اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ ہندوستانیوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا تھا اس لئے کانگریس اور خصوصاً لیبر جماعت دونوں کی طرف سے جدید آئین کے متعلق ایک گول میز کانفرنس کا مطالبہ کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی لارڈ برکنہیڈ وزیر ہند کے چیلنج پر پنڈت موتی لال نہرو نے اپنے چند رفقائے کار کی مدد سے اپنی مشہور "نہرو رپورٹ" مرتب کر کے پیش کی۔ کانگریس نے مہاتما جی کی رہنمائی میں پھر زور پکڑا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے علاقہ بردولی میں عدم ادائے مالگزاری کی تحریک جاری کر دی۔ سول نافرمانی کے سلسلے میں انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا گیا، اور منشیات کی دوکانوں پر دھرنا دھرا جانے لگا۔

۱۹۲۹ء میں انگلستان میں لیبر پارٹی کو پھر اقتدار حاصل ہوا اور مسٹر وجوڈ وین وزیر ہند ہوئے جنھوں نے ہندوستان کی سیاسی حالت کو مدّنظر رکھتے ہوئے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ لارڈ اروِن

کو انگلستان طلب کیا۔ چنانچہ وائسرائے انگلستان گئے اور وہاں سے جب واپس آئے تو انھوں نے صاف الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ "ہندوستان کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ ڈومینین اسٹیٹس ہوگا" اسی کے ساتھ ہز اکسیلنسی نے کانگریس کو رضامند کرکے گول میز کانفرنس میں شریک کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس مقصد میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی اور لاہور کانگریس نے "مکمل آزادی" کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔

اس کے بعد سول نافرمانی کا سلسلہ پھر زوروں کے ساتھ شروع ہوا۔ اور مہاتما گاندھی نے قانون نمک توڑنے کے لئے ڈانڈی کا مشہور سفر اختیار کیا۔ اسی زمانہ میں خان عبدالغفار خاں کی رہنمائی میں کانگریس کی امداد کے لئے "خدائی خدمتگاروں" کی جماعت قائم ہوئی۔ گورنمنٹ نے مہاتما گاندھی کو گرفتار کرکے نظربند کر دیا اور مرکزی و صوبجاتی حکومتوں نے مختلف قسم کے آرڈیننس پاس کرکے سخت گیری کی پالیسی شروع کی۔

اسی فضا میں پہلی گول میز کانفرنس لندن میں ہوئی جس میں کانگریس کے سوائے تقریبًا ہر جماعت کے نمایندے شریک ہوئے۔ اور فروری ۱۹۳۱ء میں سب ڈیلیگیٹ خوش اور مطمئن واپس آئے اور ہندوستان میں دوسری گول میز کانفرنس کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ارباب حکومت نے مہاتما گاندھی اور دیگر سرکردہ کانگریسی لیڈروں کو جیلخانوں سے رہا کر دیا، اور لارڈ ارون اور مہاتما گاندھی کے مابین گفتگو ہوئی اور مشہور گاندھی ارون معاہدہ مرتب ہوا جس کے بعد کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک بند کر دی۔ اور حکومت نے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس مصالحت میں سرتیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکار کا بڑا حصہ تھا مگر یہ مصالحت دیرپا نہ ثابت ہوئی

۱۹۳۱ء میں لارڈ ارون کے بعد لارڈ ولنگڈن ہندوستان کے وائسرائے ہوئے۔ کانگریس کی طرف سے مہاتما گاندھی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے انگلستان گئے۔ مگر لندن میں فرقہ وارانہ مسائل کا باہمی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور بالآخر وزیر اعظم کو اس کام کو اپنے ذمے لینا پڑا۔ گول میز کانفرنس میں مہاتما گاندھی کے رویہ سے برٹش مدبروں کو مصالحت کا کوئی راستہ نظر نہ آیا اور گورنمنٹ ہند نے لارڈ ولنگڈن کی ماتحتی میں ایک مرتبہ پھر سخت گیری کی پالیسی شروع کی چنانچہ جب مہاتما گاندھی لندن سے دسمبر کو ہندوستان پہونچے اور انھوں نے حکومت کی پالیسی کے متعلق لارڈ ولنگڈن سے ملاقات کرنا چاہی تو ان کی درخواست نامنظور ہوئی اور کانگریس اور گورنمنٹ کی ایک مرتبہ پھر آویزش ہوئی۔ مہاتما گاندھی گرفتار ہوئے اور ملک کے تمام جیل خانے سیاسی قیدیوں سے بھر گئے۔

اس کے بعد لندن میں تیسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی جس کے بعد وھائٹ پیپر شائع ہوا جسے ملک نے ناپسند کیا۔ لیکن اس مرتبہ گورنمنٹ ہند نے کانگریس کو اپنی سخت گیری سے بالکل دبا دیا، اہل ملک بھی سول نافرمانی سے اکتا گئے جس سے یہ تحریک خود بخود مٹ گئی۔

اسی دوران میں دو اور کمیشن ہندوستان آئے۔ ایک نے رائے دہی کے متعلق مسائل کی، دوسرے نے دیسی ریاستوں کے معاملہ کی جانچ کی اور وزیر اعظم نے اپنا مشہور فرقہ وارانہ فیصلہ شائع کر دیا مہاتما جی نے برت کر کے ہریجنوں کے حق میں ہندوؤں سے ترمیم کرائی جسے گورنمنٹ کو بھی منظور کرنا پڑا اس کے بعد کانگریس میں دو جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ سوشلسٹ اور سوراجسٹ، جو مجالس قانون ساز پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ مہاتما گاندھی کانگریس سے علیحدہ ہو گئے اور کانگریس نے اسمبلی کے انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت کر دیا ہے کہ کانگریس ہی ملک کی سب سے بڑی اور ہر دلعزیز پولیٹیکل پارٹی ہے۔ اب مسودہ قانون حکومت ہند دار العوام میں پیش ہو کر تیسری خواندگی کے مرحلہ سے گذر چکا ہے، ملک معظم نے بھی منظوری عطا فرما دی ہے اور وہ بہت جلد پاس ہو کر ہندوستان میں نافذ ہو جائیگا۔

غرض پچھلے پچیس سال کے اندر ملک معظم جارج پنجم کے عہد معدلت مہد میں ہندوستان نے سیاسی میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔

زندگی

(از بابو ہری کرشن سکسینہ بی اے فاضل۔ بی۔ این۔ ایس ڈی کالج کانپور)

عاشقانِ غم کی عالم میں کہاں ہے زندگی　　یہ مکیں وہ ہیں کہ جن کی لامکاں ہے زندگی
صیدِ ظلماتِ اجل ہے بندۂ حرص و ہوا　　بیخودی میں ورنہ نورِ جاوداں ہے زندگی
پاس آنے دے نہ تو اپنے خودی کو بھول کر　　ورنہ صیدِ کشمکش کی نیم جاں ہے زندگی
رفتہ رفتہ بامِ رفعت پر پہونچ ہی جائیگا　　شوقِ صادق کیلئے اِک نردباں ہے زندگی
بہرِ نظارہ فقط چشمِ بصیرت چاہیئے　　بسطِ عالم میں مکینِ لامکاں ہے زندگی

زندگی ہے زندگی گر حل ہے رازِ زندگی
ورنہ اِک افسانۂ سود و زیاں ہے زندگی

سارہ

(مترجمہ منشی کنھیا لال صاحب ایم اے ایل ایل بی۔ سابق ایڈیٹر "چاند")

(سین۔ ایک گاؤں کے ایک جھونپڑے کا اندرونی حصہ ہے، کھڑکی سے جھونپڑوں کی ایک قطار سامنے نظر آتی ہے۔ کھڑکی کے بغل میں صدر دروازہ اور بائیں جانب دوسرا دروازہ ہے۔ فرنیچر کچھ نہیں ہے، دیواروں پر سیاہ چوکور دھبے پڑے ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ آتشدان کے داہنی طرف ایک میز دو کرسیاں اور دیوار سے لگی ہوئی ایک الماری ہے اور اُسی کے پاس ہی چند برتن بھی رکھے ہوئے ہیں، الماری پر بھی کچھ برتن ہیں ایک سیاہ رنگ کی پتیلی چولھے پر چڑھی ہوئی ہے۔ کمرے میں فرش نہیں ہے۔ کھڑکی میں پردے کے بجائے ایک ایک گز معمولی ململ کا کپڑا بندھا ہوا ہے جس سے باہر کا گذرنے والا اندر کی چیزیں نہیں دیکھ سکتا۔ آگ کے پاس زمین پر ایک سیاہ رنگ کا ٹین کا صندوق رکھا ہوا ہے جس کا ڈھکنا کھلا ہے دروازے کے پیچھے بائیں طرف کھونٹی پر ایک سیاہ ریشمی سایہ اور سینہ بند اور پرانے فیشن کی ایک زنانی ٹوپی ٹنگی ہے سہ پہر کا وقت ہے۔ پردہ اُٹھتا ہے تو کمرہ خالی نظر آتا ہے، فوراً ہی بائیں جانب کا دروازہ کھلتا ہے اور سارہ آرمڈ ایک ضعیف عورت رات کے کپڑے نہایت صفائی سے پہنے ہوئے داخل ہوتی ہے۔ اُس کے جسم کے کپڑے نہایت بوسیدہ ہیں اور زیور کے قسم سے انگلی میں صرف شادی کی انگوٹھی ہے، پاؤں میں بوٹ اور بھورے رنگ کے موزے ہیں جو اونچے سائے کی وجہ سے بخوبی نظر آتے ہیں۔ کندھوں پر ایک چھوٹا پلیٹ دار شال پڑا ہوا ہے۔ سارہ کمرے میں آکر نائٹ ڈریس کو میز پر رکھدیتی ہے اور غمگین نگاہوں سے صندوق کو دیکھتی ہے۔ صدر دروازے سے دستک کی آواز آتی ہے اور وہ اس طرف دیکھنے لگتی ہے)

سارہ۔ کون ہے؟

اِما: میں ہوں مسز آرمڈ۔ اِما بریری

سارہ: اندر چلی آؤ بیٹی۔

(اما بڑی لی جو ابھی کام پر سے چلی آرہی ہے کمرہ میں داخل ہوتی ہے، سیاہ رنگ کا سایہ پہنے ہے۔ جاکٹ اور ٹوپی کے بجائے سر اور کندھے پر شال ڈالے ہوئے ہے۔ ایک رنگین سوتی کپڑا کمر کے نیچے سایہ پر بندھا ہے، اس کا سایہ بھی اونچا ہے جس کی وجہ سے موزے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ پاؤں میں چپل ہیں۔ بال کھلے ہوئے ہیں اور ایک قینچی ڈور سے بندھی ہوئی کمر میں لٹک رہی ہے۔)

سارہ۔ تم مجھ بوڑھی عورت کو دیکھنے چلی آئیں، بہت اچھا کیا۔

اما: (دروازے سے) مل بند ہوگیا ہے اور میں اس طرف سے گذری تو خیال ہوا کہ لاؤ دیکھتی چلوں۔

سارہ: (صندوق کے پاس جاکر) جیتی رہو تمھیں ہماری یاد تو رہی۔ آجکل تو میرے ہاتھ بالکل مفلوج ہو رہے ہیں اور بننے والوں کے لئے ہاتھ ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔

اما: اچھا میں آگئی ہوں لاؤ کچھ نہ کچھ کام ہی کردوں۔

سارہ: خوش رہو بچی مجھے کرنا ہی کیا ہے۔

اما۔ (شال اتارتی ہے اور چاروں طرف دیکھکر دروازے میں لٹکا دیتی ہے) خیر میں جانتی ہوں کہ تم اس وقت کیا کر رہی تھیں۔

سارہ: ہاں دو چار چیزیں ایسی ہیں کہ میں اُن کو علحدہ کرنا نہیں چاہتی، حالانکہ یہ جانتی ہوں کہ وہ میرے لئے بیکار ہیں، لیکن اور سامان کے ساتھ اُن کا بیچنا پسند نہیں کرتی۔

اما: (سارہ کے پاس بکس کے اوپر جھک کر) لاؤ کچھ تمھارا ہاتھ ہی بٹا دوں۔

سارہ: اما تو بہت اچھی لڑکی ہے۔

اما: اس کو ذرا اور مضبوط باندھنا چاہیئے، باربرداری میں لوگ بہت بے احتیاطی کرتے ہیں۔

سارہ: کیا کروں ہاتھ سے مجبور ہوں۔ (کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

اما: میں اچھی طرح کسے دیتی ہوں۔

(سب چیزیں باہر نکال دیتی ہے، اور صندوق میں ہاتھ ڈال کر قرینے سے رکھتی ہے)

سارہ: لڑکی تیرے کرگھے کا کیا حال ہوا؟ کیا بگڑ گیا؟

اما: (چاروں طرف دیکھکر) کرگھا تو بالکل ٹھیک ہے، سنیچر ہونے کی وجہ سے آج دوپہری سے کارخانہ بند ہوگیا۔

سارہ: ہوں! میں بالکل بھول گئی تھی، بیکار بیٹھے بیٹھے دنوں کا نام بھی نہیں یاد رہتا۔

آما : پریشان نہ ہو۔ تم بہت تکلیف اُٹھا چکی ہو۔

(صندوق کی چیزیں درست کرتے ہوئے)

ستارہ : ہاں لڑکی! اس بڑھاپے میں کوئی خبر لینے والا بھی نہیں ہے۔

آما : خیر جو ہے سو ہے پادری تو موجود ہی ہیں۔

ستارہ : ہاں وہ تو موجود ہی ہیں۔

آما : (جھک کر) تم کو ہمت اور پر ہی رکھنا چاہیئے، مسز آرمرڈ میری ماں بھی یہی کہتی ہیں کہ مسز آرمرڈ اب سست ہو گئی ہیں کسی وقت وہ بڑی کام کرنے والی تھیں مسز آرمرڈ یہ تمہارا قصور نہیں ہے تم کیا کرو، ہاتھوں سے مجبور ہو گئیں۔

(بات کرنے میں وہ کام میں لگی رہتی ہے)

ستارہ : گو میں ضعیف ہو گئی ہوں مگر کام کرنا چاہوں تو بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ میں نے عمر بھر روزی کے لئے محنت کی ہے لیکن کبھی پس انداز نہ کر سکی

آما : بہت لوگ روپیہ خرچ کرنے میں احتیاط رکھتے ہیں اور بہت لوگ نہیں رکھتے۔ یہ خداداد بات ہوتی ہے۔ میری ماں بھی یہی کہا کرتی ہیں۔ (کام میں لگی رہتی ہے)

ستارہ : ان کا کہنا سچ ہے مجھکو پس انداز کرنے کی کبھی توفیق ہی نہیں ہوئی، اور ٹام آرمرڈ کے انتقال کے وقت میرے پاس جو کچھ روپیہ تھا سب کچھ اس کی تجہیز و تکفین میں صرف ہو گیا

آما : بڑا شاندار جنازہ نکلا تھا مسٹر آرمرڈ کا!

ستارہ : ہاں بیٹی، بڑی دھوم دھام سے تجہیز و تکفین ہوئی تھی۔

آما : سچ ہے۔ میں بھی کئی جنازوں میں شریک ہوئی ہوں مگر ایسا جنازہ کبھی نہیں دیکھا۔

(وہ نائٹ ڈریس لینے کیلئے بستر کے پاس جاتی ہے اور اس کو لیکر صندوق میں رکھتی ہے)

ستارہ : ہاں تم نے نہیں دیکھا ہو گا۔

(آما کچھ چیزیں صندوق میں رکھتی ہے اور کچھ گھٹنوں پر رکھکر اُس کی باتیں سننے لگتی ہے)

ستارہ : (ٹھہر کر) میں تمام عمر خانہ داری کے کاموں میں یکتا رہی، یہاں تک کہ چھڑی کے ٹکڑوں کو بھی بہت احتیاط سے رکھتی تھی۔ بہتر کارخانہ بھی جو ایک لیڈی تھی اپنے گھر کے سامان کو میری طرح صاف و ستھرا نہیں رکھ سکتی تھی، گو روپیہ پاس تھا جیسا چاہتی انتظام کرتی۔ میں تو تعطیل کا دن چیزوں کی صفائی ہی میں صرف کرتی تھی، میرے بال بچے تو تھے نہیں کہ اُن کی دیکھ بھال میں لگی رہتی،

جو وقت بچتا تھا اپنے ہی کاموں میں گذر جاتا تھا، گھر میں کھانے کی کچھ کمی نہ تھی۔ ٹام تو روپیہ پیدا کرنے کا شوقین تھا مگر خرچ بھی ویسا ہی تھا، اس سے کچھ بچتا ہی نہ تھا۔ حالانکہ ہم لوگ رات گئے تک کام میں لگے رہتے تھے۔

اماّ : ہاں مسز آرمرڈ میں خوب جانتی ہوں کہ ہم مل میں جاں توڑ محنت کرتے ہیں مگر پھر بھی بیہ الزام ہی رہتا ہے۔

ستارہ : بیشک دنیا میں جینا مشکل ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ساڑھے پانچ بجے صبح کو مل کا گھنٹہ بجتا تھا تو طبیعت چاہتی تھی کہ دو ایک کروٹ اور لے لوں لیکن ٹام فوراً بستر پر سے اُٹھا دیتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم چھ بجے کے پہلے کارخانہ کے پھاٹک کے باہر رہے ہوں۔ ٹام ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ کام مقدم ہے (اماّ کا سر صندوق میں ہے) اب ایسا وقت آیا ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتی لیکن پادری اچھا آدمی ہے وہ جو کچھ کرے گا اچھا ہی کریگا (اماّ کا سر باہر ہوتا ہے) تم آ گئیں تو بہت اچھا ہوا۔ تھوڑی دیر طبیعت بہل گئی۔

اماّ : میں تم کو یہ کہتے سُنکر بہت خوش ہوں (کھڑی ہو کر) اور میرے لائق کوئی کام تو نہیں ہے۔

ستارہ : کئی سال کے بعد آج اتوار کو مَیں نے اپنا ریشمی سایہ پہنا ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ اسکو نکال لوں مگر روزانہ پہننے کے قابل نہیں ہے۔

اماّ : نکال لو مسز آرمرڈ۔

ستارہ : میری بھی یہی خواہش ہے اور مجھکو پسند بھی ہے۔ تم جانتی ہو کہ مَیں مقروض نہیں ہوں کرسی اور میز علحدہ کرنے میں ملیگا کیا اور جو چیز مجھکو پسند ہے اس کو میں جدا کرنا بھی نہیں چاہتی

اماّ : نہیں مسز آرمرڈ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس کو نکال لو، وہ کہاں ہے؟ میں اس کو اسی میں رکھدوں اوپر جگہ کافی ہے اور ٹوٹنے پھوٹنے کا بھی خوف نہیں ہے۔

ستارہ : وہ دروازہ کے پیچھے لٹک رہا ہے (اماّ جاتی ہے اور کپڑا لاتی ہے) میں نے پادری کو دکھانے کے لئے نکال لیا تھا۔ میں اُس سے دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ یہ پھینکنے کے لائق تو نہیں ہے، میری بہترین ٹوپی بھی اسی کے ساتھ ہے اور بس (اماّ میز کے نیچے بیٹھکر ٹوپی اور کوٹ میز پر تہہ کرکے صندوق میں رکھ دیتی ہے۔)

اماّ : سب اِسی میں رکھدوں مسز آرمرڈ؟

سارہ: تم کو بڑی تکلیف ہوئی لڑکی!

آما: کچھ بھی نہیں تکلیف کی کونسی بات ہے، ہمسایہ کے کام ہمسایہ ہی آتا ہے۔

(ٹوپی میز پر سے اُٹھاتی ہے اور صندوق میں رکھدیتی ہے۔)

سارہ (چاروں طرف دیکھکر) رکھدو زیادہ نہ دیکھو یہ قصہ طلب ہے، سامان تھوڑا تھوڑا کرکے فروخت ہوگیا، اور اب کوئی چیز علحدہ کرنے کے قابل نہیں رہی۔

آما: خیر کچھ پروا نہ کرو، پادری سے سب ٹھیک ہوجائیگا۔

سارہ: مجھے بھی یہی اُمید ہے، چونکہ میں بہت محنت کرنے والی عورت تھی، کام چھوڑنے کا خیال کبھی دل ہی میں نہ آیا۔ اجنبی لوگوں کی موجودگی میں مجھے سونے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا اور جب میری میٹ کوئی کام کرنے کو کہتی تو میں فوراً اُسے کرلیتی اور جب کہیں جانے کو کہتی تو فوراً اُس کے ساتھ چلی جاتی۔ حالانکہ میں آزاد تھی جہاں چاہتی جاتی۔ خیر ہوگا بھی کام کرنے والے کو زیادہ باتیں نہ بنانا چاہیئے۔

آما: (اوٹھکر) اچھا اب تو سب ہوگیا کوئی چیز باقی تو نہیں ہے۔

سارہ: (کچھ سوچکر) ہاں میں اپنی نائٹ کیپ تو بھول ہی گئی۔ (کھڑی ہوتی ہے دو قدم چلتی ہے اور ٹھہر جاتی ہے) خیر رہنے دو وہ میرے پہننے میں آجائیگی، مگر بغیر نائٹ کیپ کے اور چیزیں استعمال میں ٹھیک نہ ہونگی۔

آما: اچھا ابھی تو رکھ دو کپڑوں کے ساتھ پہننا۔

سارہ: (جاتے ہوئے) میں جاؤں لیتی ہی آؤں۔ (جاتی ہے اور فوراً سفید رنگ کی نائٹ کیپ لئے ہوئے واپس ہوتی ہے) بس اب سب چیزیں ہوگئیں۔ (آما کو دیتی ہے)

آما: (اُسکو صندوق میں رکھتے ہوئے) مسز آرمرڈ تمھارے کوئی لڑکا نہیں ہوا؟

سارہ: نہیں آما نہیں (آگ کے پاس بیٹھ جاتی ہے) تم نہیں جانتی کہ بعد میں ان کی کیا حالت ہوتی ہے وہ بڑے ہوجاتے ہیں اور اُن کی شادی ہوجاتی ہے تو وہ بھول جاتے ہیں کہ اُن کی پرورش میں کیسی تکلیفیں اُٹھائی گئی تھیں۔

آما: مسز آرمرڈ میری بھی اب جلد ہی شادی ہونیوالی ہے۔

سارہ: آما تمھاری۔ کس کے ساتھ؟ دیکھو تمھاری ماں نے بہت خدمت کی ہے اُس کو بھول نہ جانا

آما: جو ہنڈل کے ساتھ مسز آرمرڈ!

سارہ : ہنڈل، ہنڈل، رابرٹ ہنڈل کا لڑکا تو نہیں، وہ موکارخانہ میں نگرانی کرنے پر تعینات تھا پھر بُنائی کا کام سیکھنے کے لئے روس چلا گیا تھا۔

اما : ہاں وہی،

سارہ : اس لڑکے کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی، اُس کا باپ اچھا آدمی تھا، مجھکو اچھی طرح یاد ہے لیکن اتنا ہے کہ جو ہنڈل خود بھی اپنا کام کرتا ہے۔

اما : ہاں مسز آرمڑ۔

سارہ : شادی ہوجانے پر اس کا خیال رکھنا کہ پیشتر کی زندگی سے بڑا فرق ہے۔ جب تم اونچے سائے میں آزادی کے ساتھ دوڑتی پھرتی تھیں، وقت پھر دوبارہ کبھی نہیں ملتا ہے۔ اما تو بہت اچھی لڑکی ہے، میرے پاس وہاں (سونے کے کمرے کی طرف اشارہ کرتی ہے) ایک چائے کا پیالہ رکھا ہوا ہے جسے میری شادی میں میری ماں نے دیا تھا۔ ٹوٹ جانے کے خوف سے میں نے اس کو بکس میں نہیں رکھا، میرا خیال تھا کہ میں جبتک زندہ رہوں اس کو اپنے پاس ہی رکھوں حالانکہ وہ میرے کسی کام کا نہیں ہے۔

اما : تو ابھی تک وہ وہیں رکھا ہے۔

سارہ : ہاں کوئی ہرج نہیں (آہستہ سے اُٹھکر) لڑکی لے یہ پیالہ اب تیری شادی کے تحفے میں تجھے دیتی ہوں، حفاظت سے رکھنا اور جب تیری نگاہ اُس پر پڑے تو مجھے یاد کر لینا۔

اما : نہیں مسز آرمڑ میں اس کے لینے کا خیال اپنے دل میں نہیں لاسکتی۔

سارہ : تو مجھ سے ایک تحفہ لینے کا فخر نہیں حاصل کرنا چاہتی؟

اما : نہیں مسز آرمڑ میں اپنے کو اس قابل نہیں پاتی۔

سارہ : اچھا ٹھہرو میں ایک منٹ میں واپس آتی ہوں، کیونکہ پادری کے آنے تک مجھکو بالکل تیار ہوجانا چاہیئے۔

اما : میں تم کو کچھ مدد دے سکتی ہوں مسز آرمڑ؟

سارہ : نہیں لڑکی نہیں میں خود بھی تھوڑا بہت کر سکتی ہوں۔ میرا ہاتھ ابھی اتنا بیکار نہیں ہوا ہے، صرف بُننے کا کام نہیں کر سکتی۔ اور کام میں کوئی قباحت نہیں ہوتی ہے۔

اما : اچھا تو میں صندوق کو اوپر رکھدوں (وہ ایک رسّی لاتی ہے۔)

سارہ : اس سے

آما :- بہت ٹھیک ہے۔

(سارہ جاتی ہے، کھڑکی سے باہر کی جانب ایک شخص کا چہرہ نظر آتا ہے، وہ کمرے میں دیکھتا ہے۔ اور اس کے بعد صورت غائب ہوجاتی ہے اور دروازے پر دستک دیتا ہے۔)

آما : کون ہے ؟

سام : میں ہوں سام ہورکس، (آما جاتی ہے اور دروازہ کھولتی ہے۔)

آما : کیا چاہتے ہو؟

سام :(دروازے کے قریب آکر) آما میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں، میں کارخانے ہی سے تمھارے ساتھ آیا اور دروازے پر انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔

آما : اچھا تو اندر آؤ مجھکو دروازے پر بات کرنے کی فرصت نہیں ہے۔

(آما اُس کو اندر لاتی ہے، دروازہ بند کردیتی ہے اور اس کو وسط کمرے میں کھڑا چھوڑ کر اپنے کام میں مشغول ہوجاتی ہے۔ سام ہورکس بھدی شکل کا نوجوان آدمی ہے اور کاریگروں کی طرح نیلے رنگ کا موٹا کپڑا پہنے ہے، اُس کا چہرہ تیل کے رنگ کا ہے اور کپڑوں میں جابجا دھبے پڑے ہیں، پیر میں جوتے پہنے ہے اور اپنی داہنی جیب میں ایک تیلیا رنگ کا پیچ دار گیند رکھے ہے۔ جب بات کرنے میں وقت ہوتی ہے تو اپنا ہاتھ اوپر پھیرتا ہے، اس کے گلے میں بغیر کالر کے ایک سرخ رنگ کا مفلر پڑا ہوا ہے اور ایک سیاہ ٹوپی کے اندر اس کے بال سمٹے ہوئے ہیں جس کا غالبًا دس حصہ میں ایک حصہ کھلا ہوا ہے)

سام : (آما کی پیٹھ کو تھوڑی دیر دیکھکر) مسز آرمرڈ کہاں ہیں ؟

آما : (بغیر نظر اُٹھائے) اُس سے کیا کام ہے ؟

سام : (عذرخواہی سے) کچھ نہیں صرف پوچھ رہا تھا۔

آما : خیر اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو تو وہ اپنا سر دھو رہی ہے (اُس کی طرف دیکھکر تھوڑے توقف کے بعد) سام ہورکس تم گھر میں بھی ٹوپی نہیں اُتارتے؟

سام : نہیں،

آما : اچھا تو یہاں اس گھر میں تو ٹوپی اُتارلو یا دروازے کے دوسری طرف جاؤ۔

(سام ٹوپی اُتار کر بائیں جیب میں رکھ لیتا ہے اور داہنی طرف کی جیب میں گیند کو ٹٹولتا ہے)

سام : اچھا آما میں اُتارے لیتا ہوں

(اَمّا اپنی پیٹھ اس کی طرف کئے کام میں لگی رہتی ہے اور اس کے بات کرنے کی منتظر رہتی ہے)

اَمّا : اچھا تم کیا چاہتے ہو؟

سام: کچھ نہیں....... وہ عورتیں بڑی خراب ہیں۔

اَمّا : پھر تم کو کیا؟

سام: کچھ نہیں۔

اَمّا : تم جس کام سے آئے ہو وہ بیان کرو، لوگوں کی پیٹھ پیچھے بُرائی کرنے سے باز آؤ۔

سام: نہیں مجھ سے کیا مطلب ہے۔

اَمّا : اچھا پھر؟

سام: آج بہت سُہانا دن ہے، اور موسم بھی خوب ہے۔

اَمّا : ہاں

سام: بہت سُہانا دن ہے۔

اَمّا : ہاں،

سام: بہت ہی عمدہ اور سُہانا دن ہے۔

اَمّا : ہاں

سام: (کچھ سوچکر) اَمّا تم میرا گھر جانتی ہو؟

اَمّا : ہاں

سام: کبھی تم میرے گھر گئی ہو؟

اَمّا : جب سے تمھاری ماں مری نہیں گئی۔

سام: اور اب، میں سمجھتا ہوں نجاؤ گی۔ جب سے میری ماں کا انتقال ہوا تم نہیں گئیں، میری ماں بہت اچھی عورت تھیں اور ہر وقت چارپائی پر بیٹھی رہا کرتی تھیں۔

اَمّا : اپنے لڑکے سے اچھی ہی تھی،

سام: لیکن اَمّا اب میرے گھر میں اُس وقت کی زندگی سے کچھ فرق ہوگیا ہے۔

اَمّا : ہوگیا ہوگا۔

سام: میں نے سامان میں کچھ اضافہ کیا ہے، مَیں نے ایک نئی توشک بنائی ہے، سرخ زمین ہے اور اس پہ نیلی دھاریاں ہیں۔

آما : ہاں ،

سام : تو آما .

آما : (اُس کی طرف دیکھتے ہوئے) اِن باتوں سے تمھارا کیا مطلب ہے ؟

سام : افسوس کچھ بھی نہیں ..... تم کسی لاچار کو کوئی مدد نہیں دے سکتی ہو ؟

(وہ اُٹھکر اُس کے سامنے کھڑی ہوجاتی ہے . سام میز کے کونے پر اس طرح سے کھڑا ہوتا ہے کہ پشت کا کچھ حصّہ آما کے سامنے ہوتا ہے .)

آما : سام ہور کس تم کیا دریافت کرنا چاہتے ہو ؟ صاف صاف کیوں نہیں کہتے ، معلوم ہوتا ہے تمھارے منھ میں زبان ہی نہیں ہے .

سام : ہے تو مگر مَیں اس سے کام نہیں لیتا ہوں .

آما : بیوقوف کہیں کے تمام دن منھ میں لگام دئیے انجن گودام میں مارے مارے پھرنا اور رات میں پاؤں پھیلا کر سو رہنا کچھ اچھا طریقہ نہیں ہے .

سام : جب سے میری ماں کا انتقال ہوا میں بالکل تنہا ہوں ، اُن سے بہت بڑا سہارا تھا جب سے وہ مرگئیں گھر کاٹے کھاتا ہے ، دن میں تو خیر کوئی بات نہیں انجنوں کو دیکھتا رہتا ہوں یا اور میرے بہت سے ساتھی ہیں اُن سے گپ شپ میں وقت گذر جاتا ہے لیکن

آما : تم کوشش نہیں کرتے ، گاؤں کے لڑکے اتوار کو کتوں کی لڑائی دیکھنے اور سینچر کی سہ پہر کو فٹ بال کھیلنے جاتے ہیں اور تم گھر کا طواف کرتے پھرتے ہو ، پھر تمھاری سمجھ میں کیا خاک آئے . تمھارا یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے .

سام : یہ تو ٹھیک ہے آما لیکن میں لوگوں میں مِل جُل کر لڑکوں کے ساتھ کسی گوشے میں کھڑا ہوتا ہوں تو مجھکو دیکھکر سب ہنستے ہیں . اب میں ان لوگوں کی طرح شراب پینا چاہوں تو نہیں پی سکتا ، جو میرا خاص طریقہ ہے میرے لئے وہی ٹھیک ہے .

آما : اچھا جو تمھارا طریقہ ہے وہی ٹھیک سہی .

سام : آما ! میری تنہائی میرے لئے خوفناک ثابت ہورہی ہے ، میں چاہتا ہوں گھر میں کوئی عورت ہو تو اچھا ہے . دن تو خیر انجن وغیرہ دیکھنے میں کٹ جاتا ہے مگر رات کاٹے نہیں کٹتی تنہائی جان لئے لیتی ہے

آما : تو تم اس کو خود سمجھو مَیں کیا جانوں . میرے بس میں کیا ہے

سام: اما! میں... امید رکھتا تھا ...... کہ کسی طرح......

اما: (قریب آکر دھمکی دیتے ہوئے) سام ہورکس! اگر تم صاف صاف نہ بتاؤگے کہ تم کیا چاہتے ہو تو وہ تھپیڑ رسید کرونگی کہ منہ پھر جائیگا۔

سام: (پشت اُس کی طرف کرکے) اما اس وقت تو تم بالکل میری ماں ہی کی طرح مجھ سے باتیں کر رہی ہو۔

اما: میں چاہتی ہوں کہ تمھارے دماغ کا علاج کردوں۔

سام: (یکایک رنجیدہ ہوکر کرسی کے اُوپر جھک جاتا ہے) اما تم میرے ساتھ رہوگی۔ میں انجن گودام میں خوب پیسے پیدا کرتا ہوں۔

اما: بیوقوف کہیں کے دُور ہو۔ تجھے انجن گودام میں منہ باندھے اِدھر اُدھر گھومنے کے سوائے اور کام ہی کیا ہے، تو نہیں جانتا کہ جو ہنڈل کے ساتھ میری شادی ہونیوالی ہے۔

سام: سچ سچ، اما!

اما: بیشک، اشتہار کی خانہ پُری ہوئے اتوار کو پندرہ روز ہوجائیں گے، کوئی پوشیدہ بات تھوڑا ہی ہے۔ مگر تمھیں خبر ہی نہیں ہے۔

سام: مَیں قسم کھا کر کہتا ہوں مجھکو معلوم نہیں تھا، مَیں نے سوچا چلوں اما ہی سے ساتھ رہنے کیلئے کہوں۔

اما: (ذرا نرمی سے) سام! اگر تم کو میری باتوں سے صدمہ پہونچا تو مجھے افسوس ہے۔

سام: یہ میرا ہی قصور تھا اچھا اب مجھکو چلا جانا چاہیئے۔

اما: (صندوق کو اُٹھاکر) پادری مسز آرمرڈ کو دیکھنے کے لئے آتا ہی ہوگا۔

سام: (غرور سے) مجھکو معلوم ہے۔

اما: بیچاری تکلیف میں ہے، میں نہیں سمجھتی کہ پادری اس کے لئے کیا کرسکتا ہے۔

سام: بڑھاپا بُرا ہوتا ہے، اچھا اب مجھکو یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔ (ٹوپی اُٹھاکر) اما معاف کرنا، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ بھی تمھارے پیچھے لگا ہے تو میں پہلے ہی تم سے اپنے دل کا حال بیان کرتا بہت دن سے میں یہ سوچ رہا تھا۔

اما: نہیں نہیں، سام کوئی بات نہیں ہے، اگرچہ تم بیوقوف ہو مگر اچھے لڑکے ہو۔ اچھا سلام،

سام: سلام۔ میں تمھاری شادی میں ضرور شریک ہونگا، امید ہے کہ میری شرکت سے تم کو خوشی ہوگی

اما: اچھا اب تم جاؤ، مسز آرمرڈ آتی ہونگی۔

ام: بہت اچھا اما، سلام،

اما: بندگی۔

(سام جاتا ہے، مسز آرمرڈ اندر کے دروازے سے آتی ہے، وہ نیلے رنگ کا چائے کا پیالہ لئے ہوئے داخل ہوتی ہے۔)

سارہ: اما کوئی آیا تھا؟ مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں نے کسی کو باتیں کرتے سنا ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

اما: سام مورکس آیا تھا مسز آرمرڈ!

سارہ: سام مورکس کا لڑکا جس کا گزشتہ سال انتقال ہوا تھا؟ اسکا تو سنا ہے دماغ صحیح نہیں ہے؟

اما: ہاں وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے کہہ رہا تھا۔

سارہ: (ناراض ہوکر) میرے گھر میں اس قسم کی بات کرنا بہت واہیات ہے۔ تم نے تو دوسرے لڑکے سے وعدہ کیا ہے، میں ہوتی تو اُس کی خبر لیتی۔

اما: اُس کو خبر نہیں تھی۔ میں بھی اُس کے ساتھ سختی سے پیش آئی۔

سارہ: خیر اُس کو بھی کوئی نہ کوئی لڑکی ملجائیگی۔

اما: میرا بھی یہی خیال ہے۔

سارہ: (چائے کا پیالہ اما کے ہاتھ میں رکھکر) دیکھو یہی چائے کا پیالہ ہے۔

اما: (اس کو دیکھتے ہوئے) یہ تو بہت خوبصورت پیالہ ہے مسز آرمرڈ!

سارہ: یہ اصل چینی کا بنا ہوا ہے، بیٹی ذرا حفاظت سے رکھنا۔

اما: میں بہت حفاظت سے رکھونگی،

سارہ: مجھے معلوم ہے، استعمال میں رہیگا تو اور بھی محفوظ رہیگا، دوسری جگہ اس کی اتنی حفاظت نہیں ہو سکتی اور اس کے ٹوٹنے کے خیال سے میں سرد پڑجاتی ہوں۔

(دستک کی آواز آتی ہے)

اما: پادری صاحب ہیں!

سارہ: (بال کو برابر کرتے ہوئے) پہلے کھڑکی سے جاکر دیکھو کون ہے، نوجوان پادری،

اما: (چائے دانی میز پر رکھکر کھڑکی سے جھانکتی ہے) بڈھا پادری تو نہیں ہے، اور کوئی ہے۔

سارہ: پادری نہیں ہے تو چلی آؤ بیٹھو اُس کو دوبارہ کھٹکھٹانے دو۔

(آما کھڑکی سے آکر میز کے داہنے طرف جاتی ہے۔ پھر دستک کی آواز آتی ہے)

سارہ: (بلند آواز سے) آؤ، دروازہ کھول لو۔

(ریورنڈ فرینک الائن اندر داخل ہوتا ہے، وہ لندن اور آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ نوجوان پادری ہے جس کی وضع لنکا شائر کے پادری سے بالکل علحدہ ہے)

الائن: مسز آرمرڈ تسلیم عرض کرتا ہوں۔

سارہ، تسلیمات۔

الائن: مجھکو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر بلنڈیل کو ایک مشنری میٹنگ میں شرکت کرنا ہے اس سے وہ خود نہیں آسکے، اور اپنے بجائے مجھکو آپ کے دیکھنے کے لئے بھیجا ہے۔

سارہ: میاں لڑکے بہت اچھا، بیٹھ جاؤ۔

(آما میز کے بائیں طرف آتی ہے اور اپنے آنچل سے کرسی کو صاف کرتی ہے۔ الائن دست شفقت اُٹھاتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سارہ کی موجودگی اُسے ناگوار ہوئی، وہ ترشروئی سے آما کو دیکھتا ہے اور نگاہ نیچی کرلیتا ہے۔)

الائن: شکریہ، مگر تکلیف نہ کیجئے، میں بیٹھونگا نہیں، اس وقت زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے۔

سارہ: جیسی تمھاری مرضی ہو، میرے لئے دونوں برابر ہیں۔

(آما میز کے داہنی طرف کھڑی رہتی ہے۔)

الائن: مسز آرمرڈ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

سارہ: میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، ہاتھ بالکل بیکار ہوگیا مگر شکر ہے کہ زندہ ہوں۔

الائن: مسز آرمرڈ جو پیغام میں لایا ہوں، افسوس وہ آپ کی اُمید کے خلاف ہے۔ مسٹر بلنڈیل نے آپ کے لئے جو کوشش کی تھی وہ بدقسمتی سے کامیاب نہیں ہوئی لہذا اب آپ کو امداد دینے سے مجبور ہیں۔ میرے خیال میں آپ کے لئے یہاں سے کارخانہ میں جانے کا جو انتظام کیا گیا ہے وہ آج دوپہر کے بعد سے ہو جانا ضروری ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس بہت بُری خبر لایا ہوں، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خوشی بھی ہے کہ آپ کو ایک آرام دہ مکان رہنے کو ملیگا۔

سارہ: جی چاہیگا جاؤنگی نہ جی چاہیگا نہ جاؤنگی اس کے لئے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

الائن: تم کو خدا کی مرضی پر اپنے کو چھوڑ دینا چاہیئے، مذہب کی تسلیاں ہمارے ساتھ ہیں، آؤ اب خدا سے دعا مانگ لیں۔

سارہ: جب میں اچھی اور آرام سے تھی تو دعا نہیں مانگتی تھی، اب تکلیف اور مصیبت کی حالت میں
دعا مانگنا صریح خود غرضی ہے۔

الاین: اچھا تو میں تمھاری کوئی اور خدمت کر سکتا ہوں؟

سارہ: میں نہیں سمجھتی کہ کیا کر سکتے ہو۔

الاین: مسٹر ملنڈیل کی اجازت سے میں تمھارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں (اپنے کوٹ کی جیب سے
انجیل نکالکر) مجھکو اپنی خدمت میں یہ انجیل پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ اس سے تمھارے دل
کو تقویت ہوگی (انجیل دیتا ہے۔ سارہ ہاتھ نہیں اٹھاتی ہے اور کتاب اُس کی گود میں گر پڑتی ہے)
الاین اُس کو اُٹھاکر میز پر رکھدیتا ہے) آہ، بیشک ...... تمھارا ہاتھ ...... میں سمجھ گیا.....

سارہ: شکریہ ادا کرتی ہوں آنکھیں اس قابل نہیں ہیں کہ میں آسانی سے پڑھ سکوں مگر خیر میں اسکو
بہت حفاظت سے رکھونگی۔

الاین: تم کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، اچھا اب مجھکو جانے کی اجازت دو، میں تمھارے لئے دعا کرونگا
اور خدا چاہیگا تو اچّھا ہی ہوگا۔ سلام

سارہ: سلام (الاین جاتا ہے)

آما: مسز آرمرڈ اس تحفہ سے آپ کو کوئی خوشی نہیں ہوئی؟

سارہ: بڈھے پادری کا یہ طریقہ مجھے پسند نہیں آیا اس کو خود آکر سب حال بتانا تھا، میں اُس
چھوکرے پادری سے کیا بات کرتی، وہ ہم سے بالکل واقف ہی نہیں ہے: بیچارا لڑکا بہت ٹھیک
کہتا تھا۔ آما! میں نے تمام عمر گرجا جانے میں کبھی ناغہ نہیں کیا۔ دوسرے لوگ روپیہ جمع کرنے کی
فکر میں لگے رہے اور میں اپنی اُمیدیں گرجا سے وابستہ کئے ہوئے تھی۔ مگر میرے ساتھ بھی یہ
سلوک کیا جاتا ہے کہ ایک نظر فریب پادری دو آنے کی انجیل لیکر میرے پاس آتا ہے۔ ان
لوگوں سے توقع رکھنے کا یہی نتیجہ ہے۔ (باہر تین کا گھنٹہ بجتا ہے)

آما: ارے لو، تین بج گئے میرا کھانا تو بالکل ٹھنڈا ہوگیا ہوگا۔

سارہ: بیٹی تونے یہ بتایا بھی نہیں کہ میں ابھی تک بھوکی ہوں؟

آما: میں تو یہاں سیدھے کارخانہ سے آئی ہوں۔

سارہ: تو تم کچھ کھاکر دم لے لیتیں۔

اما: میرا کھانا تو گھر پر رکھا ہوا ہے۔

سارہ: اری بڑی بیوقوف ہے، جا جلدی کھانا کھا آ۔

آما: (شال کو کندھے پر ڈال کر) اچھا میں جاتی ہوں۔

سارہ: آما تجھ سے بڑا سہارا تھا تو چلی جائیگی تو بڑی مشکل ہوگی۔ تیری جدائی کا خیال مجھکو بہت ستاتا ہے

آما: میری ماں کبھی کبھی آیا کریگی اور تھوڑی دیر دل لبستگی ہوجایا کریگی۔ میں اپنی ماں سے کہدونگی کہ وقتاً فوقتاً چائے لیکر آجایا کرے۔ (دروازے پر دستک ہوتی ہے)

سارہ: یہ کون ہے؟

سام: (باہر سے) میں ہوں مسز آرمرڈ!

آما: سام ہورکس پھر آیا ہے۔

سارہ: سام ہورکس! اب اس کو کیا کام ہے؟ (پکار کر) تو نے اپنے جوتے کی گرد جھاڑی ہے یا نہیں؟

سام: ہاں مسز آرمرڈ

سارہ: مجھے کچھ کام تھا میں نے سوچا چلو خود ہی مل لوں، اس لئے دوبارہ چلا آیا (دروازے کو کھٹکھٹاتے ہوئے بند کرتے ہوئے۔)

سارہ: کھلا رہنے دو، کہو کیا کام ہے۔

سام: ہاں میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں،

سارہ: اچھی بات ہے، آما کھانا کھانے گھر جارہی ہے۔

آما: (دروازہ سے) تھوڑی دیر میں میں اپنی ماں کو تمھارے پاس بھیجدونگی مسز آرمرڈ، اور اس پیالہ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

سارہ: اگر وہ آئینگی تو میں بہت شکرگزار ہونگی (آما چائے کا پیالہ لیکر جاتی ہے) اچھا سام ہورکس کہو کیا کہتے ہو؟

سام: سال کا یہ دن بہت سہانا ہے۔

سارہ: تم مجھ سے تنہائی میں جو کہنا چاہتے ہو کہو اور بکواس نہ کرو۔

سام: صاف صاف کہدوں!

سارہ: تو اور کیا، لڑکے ادھر آ کیا تیرے منھ پر مہر لگی ہے، جو کچھ تجھکو کہنا ہو کہہ۔

سام: ممکن ہے کل صبح اتنا سہانا دن نہ رہے۔

سارہ: اگر میرا ہاتھ قابو میں ہوتا تو میں بتا دیتی، اور مارے گھونسوں کے تجھکو ٹھیک کردیتی۔ اگر کچھ کہنا ہے

تو کہہ چل ورنہ سامنے دروازہ ہے، اپنی راہ لے۔

سام: تم تو ایسی باتیں کر رہی ہو کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ کہاں ہوں، جب سے میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے میں نے کسی سے جھگڑا نہیں کیا ہے۔

سارہ: لوگ تو کہتے ہیں سام ہورکس اُس سے بہت پریشان رہتا تھا۔

سام: (از راہ تعریف) ہاں صحیح ہے۔ باتیں بہت کم کرتی تھی ہر وقت دُور کونے میں چارپائی پر لیٹی رہا کرتی تھی اور جو نام اُس کی زبان پر آتا تھا اُسی نام سے مجھکو پکارتی تھی، عجیب طبیعت کی عورت تھی وہ تو بستر سوار کے نام سے پکاری جانے کے قابل ہے۔ بہت ہی سست کاہل اور چپ چاپ رہتی تھی۔ اور اگر بجائے اُس کے پسند کی نہ ہوتی تو پھر خدا کی پناہ۔ اتنا بولتی تھی کہ گدھا بھی ہو تو اس کا دماغ پھر جائے۔

سارہ: بیوقوف! تجھکو میرے گھر میں جو کام ہوتا ورنہ میں تیرا دماغ درست کردونگی۔

سام: لیکن وہ تو بہت کم باتیں کرتی تھی۔

سارہ: چھوکرا اپنی ماں کے لئے دیوانہ ہو رہا ہے۔

سام: (کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے۔ توقف) آج آسمان کیسا چمک رہا ہے۔

سارہ: عجیب احمق ہے، کیا کہوں ہاتھ سے مجبور ہوں ورنہ جھاڑو سے خبر لیتی۔

سام: میری ماں تو یہ کبھی نہ کہتی تھی۔

سارہ: بھاڑ میں جائے تیری ماں اور تجھکو کیا کہوں، میری زبان خراب کرتا ہے، وہ غریب قبر میں ہے۔ اس کی بے عزتی نہیں کرنا چاہتی۔ زبان گوشت کا لوتھڑا ہے بعض وقت ایسی بات نکل جاتی ہے جو نہ نکلنی چاہئیے۔

سام: جب میں اس کو سوچتا ہوں تو بہت صدمہ ہوتا ہے، وہ عجیب عورت تھی۔

سارہ۔ اور میں بھی عجیب ہی ہوں۔ تجھ سے باتیں کرونگی، اگر تیری ماں ہونگی تو تجھکو پکارونگی اور رات دن تیرے ساتھ رہونگی۔

سام: (شوق سے) یہی میری خواہش ہے کہ تم . . . .

سارہ: کیا تم ......؟

سام: تم چلکر میرے ساتھ رہو۔

سارہ: تو بڑا بیوقوف ہے، اس سے کیا مطلب؟ کیا تو مجھکو شادی کرنے کے لئے کہہ رہا ہے؟

سام: میرا مطلب تم کو ناراض کرنے کا نہیں ہے۔ مسز آرمرڈ۔ مجھے اپنی گفتگو کا افسوس ہے۔ ہمیشہ مجھ سے ایسی غلطی ہو ہی جاتی ہے لیکن مجھکو امید ہے کہ تم چلو گی، میں اپنی ماں کی طرح تم کو رکھونگا۔ تمھاری باتیں اور تمھاری بد دعائیں بھی سنونگا میں ہمیشہ اُس کا کام کیا کرتا تھا لیکن اب شام کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا جب مجھکو اس کا خیال آتا ہے تو کلیجہ منھ کو آتا ہے۔

سارہ: جو کچھ تم کہہ رہے ہو سچ کہہ رہے ہو یا مجھکو بیوقوف بنا رہے ہو؟

سام: میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم جانتی ہو میری شادی تو ہونے سے رہی، لڑکیاں میری طرف نظر اُٹھاکر بھی نہیں دیکھتیں، وہ تو مجھکو بیوقوف کہتی ہیں میں اس سلیٹ کے موافق ہوں جس کا چوکھٹا ڈھیلا ہو گیا ہو۔ غرض اب کبھی میری شادی نہ ہوگی۔ میں نے خیال کیا تھا کہ جو لڑکی تمھارے یہاں موجود تھی ممکن ہے وہ راضی ہو جائے مگر اُس نے جواب دیا کہ میں نے کہنے میں دیر کردی، میں ہمیشہ کا سست و کاہل ہوں، میں نے عرصہ سے اُس سے کہنے کا ارادہ کر رکھا تھا مگر میں نے بہت دیر کردی۔ مسز آرمرڈ میں پیسے خوب پیدا کرتا ہوں مگر کسی جوان عورت سے بات نہیں کرسکتا۔ وہ مجھکو جھڑک دیتی ہیں اور گالیاں اوپر سے دیتی ہیں اور جب پادری نے مجھ سے بتلایا کہ تم ورک ہاؤس جانیوالی ہو تو میں نے خیال کیا کہ میرے لئے اچھا موقعہ ہے چلکر تم سے کہوں اگرچہ میں جانتا ہوں کہ میرا گھر تمھارے گھر سے اچھا نہیں ہے، کیونکہ نہ میرے پاس نفیس پلنگ ہے اور نہ بڑی بڑی کرسیاں ہیں۔ اور نہ تمھارے ایسا اور کوئی سامان ہے لیکن میں تم سے اُسی طرح سے محبت کرونگا جس طرح اپنی ماں سے کرتا تھا اور جب تم مجھکو بیوقوف، احمق بناؤگی تو میں خاموشی سے سُن لونگا، اور جب پکاروگی تو دوڑکر تمھارا کام کرونگا۔ تمھاری وجہ سے میرے گھر میں رونق ہو جائیگی اور مجھکو تمھارے رکھنے کی بہت خواہش ہے۔

سارہ: مجھکو رکھنے کی؟

سام: ہاں ماں کی طرح۔ مجھکو افسوس ہے کہ میں نے اُسکو پہلے صاف صاف لفظوں میں نہ کہدیا میں تم کو ناخوش کرنا نہیں چاہتا۔ (دروازے کی طرف پھر کر)

سارہ: لڑکے تو اس طرح کہہ رہا ہے اگر میں تجھ سے کہوں کہ مجھکو اپنی ماں کے بجائے سمجھ تو تو میرے ساتھ کیا کیا کریگا۔

سام: میں تمھارا بوسہ لونگا، اپنی گود میں اُٹھاکر تم کو پلنگ پر لیجاکر لٹاؤنگا۔ تمھارے لئے نئی توشک بچھادونگا۔ اور ہاتھ باندھے تمھارا کام کرنے کے لئے مستعد رہونگا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس آزاد آ

اظہار جذبات کے لئے مجھے معاف کرو گی۔

سارہ۔ سام! تمھاری نئی توشک کا رنگ کیسا ہے؟

سام: سُرخ اور اُس پر نیلی دھاریاں ہیں۔

سارہ: لیکن تم جانتے ہو کہ میرا وزن ہلکا نہیں ہے۔

سام: میرا صرف دماغ کمزور ہے، بازوؤں میں بڑی قوّت ہے۔ میں تم کو آسانی سے اُٹھا کر لیجا سکتا ہوں

سارہ: اچھا تو پھر سام ہو کس کوشش کرو۔ خدا تمھارے اوپر برکت نازل کرے۔

سام: تم سچ کہہ رہی ہو مسنر آرمرڈ، چلو گی؟ مجھکو سبز باغ تو نہیں دکھا رہی ہو؟

سارہ: نہیں نہیں آؤ مجھکو بوسہ دو، سام میرے بیٹے!

(وہ بوسہ لیتا ہے اور اُس کو اپنی گود میں اُٹھا لیتا ہے)

سام۔ قسم کھا کر کہتا ہوں اب بڑا اچھا ہوا، تمھارے صندوق کے لئے پھر واپس آؤنگا۔

سارہ: مجھکو اچھی طرح سے لیچل بیوقوف۔ میں آٹے کا بورہ نہیں ہوں۔

سام: لیکن مجھکو تمھارا بات کرنا پسند ہے تاکہ تم بالکل میری ماں ہی کی طرح معلوم ہو۔

(اس کو لئے ہوئے دروازے سے جاتا ہے)

جذباتِ اثر

(از خانصاحب مرزا جعفر علیخاں اثر لکھنوی، بی۔ اے)

دل کہاں اور دل کے داغ کہاں — غم کی تعمیر تھا جو باغ، کہاں

تم کہاں جلد باز پروانو — منزلِ شمع کا سُراغ کہاں

دل ہے بیتابیوں کی راہ گذر — اب کوئی گوشۂ فراغ کہاں

اشک مژگاں پہ رہ گیا ہوگا — میرے غمخانے میں چراغ کہاں

خندہ زن تھا جو صبح خنداں پہ — پہلوئے دل میں اب وہ داغ کہاں

تیرے انوار سے جو روشن تھے — وہ دل و دیدہ و دماغ کہاں

فکر میری تھی جن کا گنجینہ — وہ گہر ہائے شب چراغ کہاں

پھول سے رس جو کھینچ لیتی تھی — وہ شبک روحی دماغ کہاں

جو ہو اپنا ہی سوگوار اثر — اس کو اندوہ سے فراغ کہاں

تنقیدِ کتب

سرودِ زندگی[1]

موجودہ زمانہ کے معدودے چند بلند پایہ اور مسلم الثبوت شعرائے باکمال میں مولانا اصغر حسین صاحب اصغر گونڈوی ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ کئی سال ہوئے آپ کا ایک مجموعۂ کلام "نشاطِ روح" کے نام سے شائع ہوا تھا، اب آپ کے اُردو کلام کا دوسرا مختصر مجموعہ "سرودِ زندگی" کے نام سے طبع ہوا ہے۔

ہر چیز کی طرح شاعری بھی رفتارِ زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اصغر صاحب کی طبع خداداد نے رفتارِ زمانہ کا ساتھ دیا ہے جس کی بدولت انھوں نے تغزل کی دنیا میں وہ وہ دلفریب رنگینیاں پیدا کی ہیں کہ سننے والا حیران ہو کر بے تحاشہ کہہ اُٹھتا ہے کہ

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں (اصغر)

قدرت نے اصغر صاحب کو دیدۂ بینا عطا فرمایا ہے جس کی وجہ سے اُنھیں ذرہ ذرہ میں پوری کائنات نظر آتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

مذاقِ سیر و نظر کو کچھ اور وسعت دے   کہ ذرہ ذرہ میں ہے اِک جہانِ نامشہود

اسی طرح ہمارے شاعر کو قطرہ میں دریا نظر آتا ہے، چنانچہ انسان کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:-

قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں ہے تو   اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود کے جلوے دیکھنا ہوں تو ذیل کے اشعار میں ملاحظہ فرمائیے:-

یہ عشق نے دیکھا ہے، یہ عقل سے پنہاں ہے   قطرہ میں سمندر ہے، ذرہ میں بیاباں ہے

پھر گرمِ نوازش ہے ضَو مہرِ درخشاں کی   پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے

یہ دونوں شعر حضرت اصغر کے نقشِ اول یعنی "نشاطِ روح" کی روح تھے، لیکن اب دیکھئے "سرودِ زندگی" میں کس بلند آہنگی سے زمزمہ سنجی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

---

[1] قیمت دو روپیہ مصنف صاحب سے یا دفتر ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد سے طلب فرمائیے۔

وہ نکہت سے سوا پنہاں، وہ گل سے بھی سوا عریاں
یہ ہم ہیں جو کبھی پردہ، کبھی جلوہ سمجھتے ہیں
یہ جلوہ کی فراوانی، یہ ارزانی، یہ عریانی
پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں

کثرتِ مظاہر ہے، دفترِ فنا آموز
نیند آئی جاتی ہے، حسن کے فسانے سے
کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگِ کمال
چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

جذب صادق شرط ہے، عشق حقیقی ہو یا مجازی، بڑھتے بڑھتے کسی دن اس درجہ کمال پر پہونچ جاتا ہے جہاں بیخودی طاری ہوکر دوئی کے پردے اُٹھ جاتے ہیں، اور مقام "من تو شدم تو من شدی" شروع ہوجاتا ہے اس منزل میں پہونچکر منصور نعرہ "انا الحق" اور قیس صدائے "انا لیلیٰ" لگانے لگتا ہے۔ اسی حالت کو اصغر صاحب کس اسلوب خاص سے بیان فرماتے ہیں:-

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

اللہ اللہ حسن و عشق نے حفظِ مراتب کا کس قدر خیال رکھا ہے بیخودی میں تو محبوب کا "دامن" تھا لیکن جب آنکھ کھلی یعنی عالمِ محویت جاتا رہا تو وہی "دامن" اپنا "گریبان" بن گیا!

روزِ آفرینش سے انسان رازِ دہر دریافت کرنے کی فکر میں ہے، اور ہر شخص اپنے اپنے علم و خیال کے بھروسہ پر کچھ نہ کچھ اُسے دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ گتھی آج تک کسی سے سلجھی ہے نہ سلجھے گی اصغر صاحب بھی اس میدان میں جولانیاں دکھاتے ہیں مگر آپ کو تمام کائنات جلوہ گاہ حسن ہی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ اشعار ذیل سے آپ کے نظریہ پر کچھ روشنی پڑتی ہے ؎

آ گئی سامنے اِک جلوۂ رنگیں کی بہار
عشق نے آج دکھادی مری صورت مجھکو
دیدۂ بیخواب انجم، سینۂ صد چاکِ گل
حسن بھی ہے بستائے دردِ پنہاں دیکھئے
نظر اس حسن پہ ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی جو پھول بن جائے کبھی رخسار بنجائے
ردائے لالہ و گل، پردۂ مہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے
کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا
خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں
یہ ذوقِ دید کی شوخی، وہ عکسِ رنگِ مجبوری
نہ جلوہ ہے، نہ پردا، ہم اسے تنہا سمجھتے ہیں
کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگِ کمال
چاہے وہ شمع بنے، چاہے وہ پروانہ بنے
تو بہت سمجھا تو کہہ گذرا فریبِ رنگ و بو
یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے

ترا جلوہ، ترا انداز، ترا ذوقِ نمود اب یہ دنیا نظر آتی نہیں دنیا مجھکو

لیکن بعض اوقات حضرت اصغر حکمائے رواقیئین (Stoics) کے ہم نوا ہوکر دنیا کو محض وہم یا مایا کا جال سمجھنے لگتے ہیں، مثلاً :-

مجاز کیسا، کہاں حقیقت' ابھی تجھے کچھ خبر نہیں ہے یہ سب ہے اک خواب کی سی حالت جو دیکھتا ہو سحر نہیں ہے

چمک دمک پر مٹا ہوا ہے' یہ باغباں تجھکو کیا ہوا ہے فریب شبنم میں مبتلا ہے' چمن کی اب تک خبر نہیں ہے

منجملہ دیگر خوبیوں کے اصغر صاحب بعض اوقات ایسی دلنشین اور پیاری باتیں کہہ جاتے ہیں کہ سننے والے کی زبان سے بے اختیار واہ واہ نکلتی ہے مثلاً :-

متاعِ زیست کیا، ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں جسے سب درد کہتے ہیں اسے ہم دل سمجھتے ہیں

آپ کی دوزخ بھی جنت سے کم نہیں ؎

دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوسِ حسن ہے جو اس سے بیخبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

تسلیم و رضا

تیری ہزار برتری، تیری ہزار مصلحت میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک قصور میں

درس اُولو العزمی :-

قطرۂ تنک مایہ، بحرِ بیکراں ہے تو اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

ہاں سینہ گلوں کی طرح کر چاک دے مر کے ثبوت زندگی کا

کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں اِک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

برگِ گل کے دامن پر رنگ بنکے جمنا کیا اس فضائے گلشن میں موجۂ صبا ہو جا

تو ہے جب پیام اس کا پھر پیام کیا تیرا تو ہے جب صدا اس کی آپ بے صدا ہو جا

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی تو کمالِ زندگی سمجھا ہے مرجانے میں ہے

آپ کے نزدیک انسان کی حقیقت کیا ہے :-

وہ شور تیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے　　　جب مختصر کیا اُنھیں انساں بنا دیا

اصغر صاحب کی نظم "کیا ہوں میں؟" بھی قابل ملاحظہ ہے :-

تمام دفترِ حکمت اُلٹ گیا ہوں میں　　　مگر کھلا نہ ابھی تک کہاں ہوں کیا ہوں میں

کبھی سنا کہ حقیقت ہے میری لاہوتی　　　کہیں یہ ضد کہ ہیولائے ارتقا ہوں میں

یہ مجھ سے پوچھئے کیا جستجو میں لذت ہے　　　فضائے دہر میں تحلیل ہو گیا ہوں میں

ہٹا کے شیشہ و ساغر ہجومِ مستی میں　　　تمام عرصۂ عالم پہ چھا گیا ہوں میں

اُڑا ہوں جب تو فلک پر لیا ہے دم جا کر　　　زمیں کو توڑ گیا ہوں جو رہ گیا ہوں میں

رہی ہے خاک کے ذروں میں بھی چمک میری　　　کبھی کبھی تو ستاروں میں مل گیا ہوں میں

کبھی خیال کہ ہے خوابِ عالمِ ہستی　　　ضمیر میں ابھی فطرت کے سو رہا ہوں میں

کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا　　　خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

کچھ انتہا نہیں نیرنگِ زیست کی میرے　　　حیاتِ محض ہوں پروردۂ فنا ہوں میں

حیات و موت بھی ادنیٰ سی اک کڑی میری　　　ازل سے لیکے ابد تک وہ سلسلا ہوں میں

کہاں ہے سامنے آ مشعلِ یقیں لے کر　　　فریب خوردۂ عقلِ گریز پا ہوں میں

نہ کوئی نام ہے میرا نہ کوئی صورت ہے　　　کچھ اس طرح ہمہ تن دید ہو گیا ہوں میں

نہ کامیاب ہوا میں، نہ رہ گیا محروم　　　بڑا غضب ہے کہ منزل پہ کھو گیا ہوں میں

جہان ہے کہ نہیں؟ جسم و جاں بھی ہیں کہ نہیں　　　وہ دیکھتا ہے مجھے اس کو دیکھتا ہوں میں

ترا جمال ہے، تیرا خیال ہے، تو ہے　　　مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

غرض "سرودِ زندگی" حکیمانہ خیالات، والہانہ جذبات اور پسندیدہ بندشوں کا بیش بہا خزانہ ہے تفنن طبع کے لئے چند مختلف اشعار اور بھی پیش کئے جاتے ہیں جن سے اصغر صاحب کی شاعری کا کافی اندازہ ہو سکے گا۔

ہاں سینہ گلوں کی طرح کر چاک　　　دے مر کے ثبوت زندگی کا

کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں　　　اِک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

سُنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی　　　لگا رکھا ہے سینہ سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

شورشِ عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی — ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

جلوۂ ذوقِ پرستش گرمیِ حسنِ نیاز — ورنہ کچھ کعبہ میں رکھا ہے نہ بتخانہ میں ہے

میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی — تو کمالِ زندگی سمجھا ہے مرجانے میں ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا — وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے
یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری — جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہ مجھ سے سن لے تو رازِ نہاں سلامتی خود ہو دشمنِ جاں — کہاں سے ہو میں زندگی ہو کہ راہ جب پُرخطر نہیں ہے

خیرگیِ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں — اور بھی دُور ہو گئے آ کے ترے حضور میں

قفس ہو دام ہو کوئی چھڑا لے اب یہ ناممکن — ازل کے دن کلیجہ میں بٹھایا تھا گلستاں کو
بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا — کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو

یہ آستانِ یار ہے صحنِ حرم نہیں — جب رکھ دیا ہے سر تو اُٹھانا نہ چاہیئے
خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے — اہلِ تپش کو آتشِ سینا نہ چاہیئے

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی — کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا
ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

اب وہ عدم عدم نہیں پرتوِ حسنِ یار سے — باغ و بہار بن گیا آئینۂ دستِ ناز میں
گم ہے حقیقت آشنا، بندۂ دہر بے خبر — ہوش کسی کو بھی نہیں میکدۂ مجاز میں

اصغر صاحب جو کچھ کہتے ہیں وہ عوام کیلئے نہیں بلکہ خواص کے لئے ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ

کلام میں سلاست کا کہیں پتہ نہیں، یا یہ کہ جس حکیمانہ انداز سے وہ شعر کہتے ہیں اُس کے لئے روزمرہ کی زبان ہلکی پڑتی ہے۔

بغیر فعل کے کوئی فقرہ درست نہیں ہوتا لیکن اصغر صاحب کبھی کبھی پورا شعر بغیر فعل یا فعل محذوف کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً:۔

حیات و موت بھی ادنیٰ سی اک کڑی ہیں گی　　ازل سے لیکے ابد تک وہ سلسلا ہوں میں

اس خوبصورت مجموعہ میں مصنف کا فوٹو اور رائٹ آنریبل سر سپرو و مولانا آزاد کی تقریظیں بھی ہیں۔

علم اور اسلام[1]

مشہور فرانسیسی فلسفی اور سمیٹک زبانوں (Semetic Languages) کے ماہر موسیو ارنسٹ رینان نے پیرس کی ساربون یونیورسٹی میں "علم اور اسلام" کے موضوع پر ۱۸۸۲ء میں ایک لکچر دیکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام علوم اور تمدن کا مخالف ہے۔ جس کی تردید اُسی وقت فرانسیسی رسالہ "ژورنال دیبا" میں مشہور و معروف علامہ شیخ جمال الدین افغانی نے کردی تھی جس کا جواب الجواب موسیو رینان نے "ژورنال دیبا" میں لکھا۔ موسیو رینان کے مضمون کی تردید فرانسیسی زبان ہی میں ایک فرانسیسی موسیو تسمر نے لکھی جو اس زمانہ میں فرانسیسی سفیر متعینہ مصر تھے چونکہ مضمون اسلام کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتا تھا اس لئے ایک مصری عالم یوسف علی مہندس (انجینیر) نے موسیو رینان کے لکچر اور موسیو تسمر کی تردید دونوں کو عربی میں ترجمہ کرکے کتابی صورت میں شائع کردیا۔ اور اپنی طرف سے ایک مختصر سے مقدمہ کا اضافہ کرکے موسیو رینان کے سوانح حیات پر بھی روشنی ڈالی۔ اسی عربی رسالہ سے لیکر ۱۹۲۶ء میں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اعظم گڈھی نے موسیو رینان کے لکچر کا اُردو میں ترجمہ کرکے ریاست منگرول کے رسالہ "زبان" کے تین نمبروں میں باقساط شائع کیا۔ ۱۹۳۲ء میں قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی نے موسیو تسمر کے مضمون کو اُردو میں ترجمہ کرکے دونوں حصوں کو کتابی صورت میں شائع کردیا ہے۔ چونکہ مضمون ریسرچ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کا مطالعہ اسلامی تاریخ کے قدر دانوں کے لئے مفید ہوگا اس کے آخر میں رائٹ آنریبل سید امیر علی کا جواب بھی شامل کردیا گیا ہے۔

---

[1] حجم متوسط تقطیع کے ساڑھے پانچ جز کا رسالہ ہے۔ قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ قاضی احمد میاں اختر قاضی بارہ جوناگڈھ (کاٹھیاوار)

عالم نسواں

حال میں سندھ کی ہندو خواتین نے "سکھی ست سنگ" کے نام سے عورتوں کی ایک زبردست انجمن قائم کی ہے جس کے اغراض و مقاصد تعلیم نسواں، اصلاح معاشرت اور حقوق طلبی وغیرہ ہیں

مسز حامد علی جو ضلع ستارہ کے ایک آئی سی ایس افسر کی اہلیہ محترمہ ہیں، آل انڈیا ویمنس ایسوسی ایشن کی ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے جائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے روبرو شہادت دینے کے علاوہ ہندوستانی خواتین کی طرف سے بین الاقوامی خواتین کانفرنس استنبول میں بھی شریک ہو چکی ہیں اب ہندوستانی عورتوں کی ترجمانی کے لئے ہی انگلستان مدعو کی گئی ہیں۔ آپ کئی سال سے اپنی خواندہ و ناخواندہ ہندوستانی بہنوں کی فلاح و بہبود کی کوشش میں منہمک ہیں۔ چنانچہ آپ کی صدارت میں ضلع ستارہ کی دیہاتی عورتوں کی اصلاح و ترقی کے لئے ایک خاص انجمن قائم کیگئی ہے۔ جو دیہات سدھا کا قابل قدر کام کر رہی ہے۔ ضلع ستارہ میں تیرہ سو دیہات ہیں۔ اس انجمن نے ایک ہزار دائیوں کو تربیت دیکران کو دیہات میں بھیجدیا ہے۔ اس انجمن نے دیہات کی عورتوں کو مندرجہ ذیل باتوں کی تعلیم دینے کا انتظام کیا ہے:-

(۱) کھانا پکانا (۲) سینا پرونا (۳) کپڑے دھونا (۴) پارچہ بانی (۵) صابون سازی (۶) دودھ مکھن کا کام (۷) بڑھئی کا کام (۸) باغبانی (۹) دائی جنائی (۱۰) متعدی امراض کا ابتدائی علاج (۱۱) مویشیوں کی داشت اور ان کی بیماریوں کا علاج کرنا۔ صابون سازی کا کام دو دو سو عورتوں کی جماعتیں بنا کر سکھایا جاتا ہے۔

اگر دوسرے مقامات میں بھی اس قسم کی انجمنیں قائم ہو جائیں تو ہندوستان کی حالت بہت جلد درست ہو سکتی ہے۔

آل انڈیا ویمنس کانفرنس نے ۱۹۵ صفحات کی ایک خوبصورت کتاب شائع کی ہے جسمیں کانفرنس کے نویں سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی کی رپورٹ کے علاوہ اور بھی بہت سی بیش قیمت معلومات درج ہیں۔ اس کے مطالعہ سے آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی قابل قدر خدمات کا پورا حال معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان میں اس وقت لڑکیوں کی تعلیم کے لئے سرکاری اور پرائیویٹ کل دو سو تینتالیس (۲۴۳) ہائی اسکول ہیں جن میں پانچہزار لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ ان کی صوبہ وار تقسیم یہ ہے :-

نام صوبہ	ہائی اسکولوں کی تعداد	لڑکیوں کی تعداد
۱- مدراس	۵۶	۱۱۹۵۷
۲- بمبئی	۴۸	۹۶۸۳
۳- بنگال	۴۲	۹۴۲۱
۴- صوبۂ متحدہ	۲۷	۴۲۶۰
۵- پنجاب	۲۱	۳۶۴۱
۶- بہار و اڑیسہ	۴	۶۱۴
۷- صوبۂ متوسط	۷	۱۸۳
۸- آسام	۵	۱۰۶۳
۹- برہما	۲۳	۶۴۲۳

اس وسیع براعظم کے لئے یہ تعداد کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہی جا سکتی ہے

معذرت

اس نمبر کی اشاعت میں جو غیر معمولی تعویق ہو گئی ہے اس کے لئے ہم ناظرین "زمانہ" سے تہ دل سے خواستگار معافی ہیں۔ اس طرف بعض اتفاقی وجوہ سے دفتر کے معمولی کاروبار میں خلاف دستور فرق آ گیا۔ آخر مئی سے ایڈیٹر رسالہ کو اپنے فرزند دوم کی علالت کی وجہ سے ایک ماہ کے قریب کانپور سے باہر رہنا پڑا اسی اثنا میں دفتر کے دو خاص کارکن بابو رام کشن اور منشی احمد علی کی آنکھیں اس قدر خراب ہو گئیں کہ جون بھر وہ کام ہی نہ کر سکے۔ اور بابو رام کشن (جن پر پچھلے دس سال سے دفتر کے کاموں کا زیادہ تر بار ہے) اس قدر معذور ہو گئے ہیں کہ ۵ جولائی سے وہ لکھنؤ میڈیکل کالج اسپتال میں زیر علاج ہیں اور ڈاکٹر صاحبان مہینہ دو مہینہ سے پہلے صحت کی کوئی امید نہیں دلاتے ہیں۔ "زمانہ" کے کاتب منشی نور الدین بھی چند خاص مجبوریوں سے اپنے فرائض پورے طور سے ادا نہ کر سکے۔ ان سب واقعات کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ مئی کا پرچہ اس قدر تاخیر سے شائع ہو رہا ہے ہم کو اس تاخیر کیلئے از حد افسوس ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوس خادمان اُردو کی بے بسی پر ہے جس کی وجہ سے رسالہ "زمانہ" ابتک اس قابل نہیں ہو سکا کہ غیر معمولی واقعات رونما ہونے پر اسکی اشاعت کا انتظام برابر قائم رہے۔ بہر حال ہم ناظرین "زمانہ" کو یقین دلاتے ہیں کہ اب اس ہرج کی تلافی کی حتی الوسع کوشش ہو رہی ہے اور ہمکو امید ہے کہ ہم عنقریب ہی ناموافق حالات پر حاوی ہو کر موجودہ تاخیر کو رفع کر سکیں گے۔ جون اور جولائی دونوں پرچوں کو جلد سے جلد مطبع بھیجنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ہم کو توقع ہے کہ ہمارے ناظرین اس تاخیر اشاعت کے متعلق ہم کو ہمدردی کا مستحق سمجھیں گے۔

ایڈیٹر

—— یہ ہے جناب!

خاص ہندوستان کی

بہترین

خالِص ترین

نہایت ارزاں

نہایت مفرّح

ندوستانی چائے سے کروڑوں آدمی لطف اندوز ہوتے ہیں، کیا آپ بھی انہیں میں ہیں؟

کھانسی نزلہ۔ زکام سردی
دکھتے ہوئے گلے وغیرہ کو سانس کے ذریعہ
شفا دینے والی حیرت انگیز دوا
حلق سینہ اور پھیپھڑوں کی شکایتوں کیلئے پیپس کی جراثیم کش اور سانس کے ذریعہ آرام پہونچانیوالی ٹکیاں حیرت انگیز دوا ہیں
پیپس کی ٹکیوں سے طاقتور جراثیم کش ابخرے خارج ہوتے ہیں جو ڈھونڈھ ڈھونڈھکر انفلوئنزا اور دیگر متعدی امراض کے جراثیم کو ہلاک کردیتے ہیں پیپس گلے کو تسکین دیتی ہیں اور تنفس کی نالیوں کی نازک جھلیوں کو جو کھانستے کھانستے رنجور ہوجاتی ہیں صحت دیتی ہیں۔
پیپس کی ہر ٹکیہ پر روپہلا ورق چڑھا ہوتا ہے
ہر جگہ کے دوا فروش پیپس کی ٹکیاں ایک روپیہ فی شیشی فروخت کرتے ہیں۔
ایجنٹ میسرز اسمتھ اسٹانسٹریٹ اینڈ کمپنی لمیٹڈ اشالی کلکتہ
PEPS
COUGHS
COLDS
BRONCHITIS
پیپس
PEPS

سکھ سنچارک کمپنی متھرا کا

انگوری منقاؤں سے تیار کردہ

سکھ سنچارک دراکشا سو

جسم کو طاقتور بنانے ۔ گوشت و خون بڑھانے چہرہ پر رونق لانے ۔ دست صاف ہو کر بھوک بڑھانیوالی خوش ذائقہ دوا قیمت چھوٹی بوتل ۱۲ بڑی ۲ ہمارا ہی ایک دراکشا سو ایسا ہے جس کی ۱۵۲ اخباروں نے تعریف لکھی ہے

طلب فرمانے پر نمونہ اور فہرست مفت روانہ کی جاتی ہے

سکھ سنچارک کمپنی متھرا کی

ادویات

سُدھا سندھو

دست ۔ کھانسی ۔ ہیضہ ۔ دمہ ۔ شول ۔ سنگر ۔ اپھارہ ۔ اتیسار وغیرہ کی خوش ذائقہ و خوشبودار دوا قیمت ۸

دورو گج کیسری

داد کی سب سے اچھی دوا قیمت ۴

بال سُدھا

دُبلے لڑکوں بچوں کو طاقتور بنانیوالی دوا قیمت ۱۲

سب دوا فروشوں کے پاس ملتی ہیں

ایک ہزار روپیہ مفت حاصل کیجئے

پہلا انعام تین سو روپیہ ۔ دوسرا انعام ایک سو پچاس روپیہ ۔ تیسرا انعام ۔ ۔ ۔ انعام (پچاس روپیہ) چوتھا انعام ۔ دو انعام (پچیس روپیہ) پانچواں انعام ۔ دس انعام (دس روپیہ) چھٹا انعام ۔ ساٹھ انعام (پانچ روپیہ)

ذیل میں ہندوستان کے آٹھ مشہور شہروں کے نام ترتیبوار حروف سے دئے ہوئے ہیں ۔ ایک ستارہ (*) کے نشان پر صرف ایک حرف لگانے سے شہر کا نام بن جاتا ہے ۔ پہلے نمبر کا حل کراچی ہے ۔ اسی طرح باقی کو حل کیجئے بہت آسان ہے

(۱) ک ا * چ ی ۔ (۲) ر * ک ون ۔ (۳) آ * * ہ ۔ (۴) ک ل * ت ہ ۔

(۵) * ن ک ل ور (۶) ب * ب ئی ۔ (۷) پ * ن ہ (۸) ل ک * ن و ۔

قواعد ۔ (۱) ہر داخلہ ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنا ضروری ہے (۲) حل منی آرڈر کے ہمراہ سادہ کاغذ پر معہ نام و پتہ کے صاف و خوشخط بھیجنا چاہیئے (۳) ایک شخص کئی حل بھیج سکتا ہے مگر ہر حل کے ہمراہ ایک روپیہ بھیجنا ضروری ہے (۴) کئی حل کی داخلہ فیس ایک ہی دفعہ سے بھیجنا ضروری ہے (۵) حل دفتر میں بعد اختتام قبل ۱۵ اگست تک پہونچ جانا چاہیئے (۶) نتیجہ کیلئے ایک آنہ زیادہ آنا چاہیئے (۷) نتیجہ اُن صاحبان کے پاس جو ایک آنہ زیادہ بھیجیں گے ۱۵ اگست کے بعد روانہ کئے جائیں گے (۸) کسی صاحب کو کسی قسم کی خط و کتابت کرنیکی اجازت نہیں ہے (۹) زیادہ صحیح حل آنیکی صورت میں انعام برابر برابر تقسیم کیا جائیگا (۱۰) جوابات کے متعلق تمام تر فیصلہ کرنیکا حق صرف منیجر صاحب کو ہوگا ۔ (۱۱) جو صاحب ان قواعد کے خلاف عمل میں لائینگے وہ مقابلہ میں شریک نہیں کئے جائیں گے ۔

منیجر ایذی ہیرا کمیٹیشن ۔ للت پور (یو ۔ پی)

کسان

(اُس کے افلاس کے وجوہ اور اُن کا علاج)

مصنفۂ

چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم۔ ایل۔ اے۔ ایم۔ ایل سی

مترجمۂ جناب محمود علی خاں صاحب جامعی

قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا، اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی؟ پھر کس طرح رفتہ رفتہ اس کو خوشحالی سے محتاج کیا گیا؟ کس طرح ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا گیا؟ اور کس طرح ایک صنعتی ملک کو زرعی ملک بنا دیا گیا؟ اب کسان کی حالت اتنی دردناک ہے کہ اُسے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھر کھانے کو دو وقت روٹی بھی نہیں ملتی۔ اسکا اصل سبب کیا ہے اور کس طرح کسان پھر خوشحال ہو سکتا ہے؟

ان سب چیزوں کا اگر آپ جواب چاہتے ہیں تو یہ کتاب ملاحظہ کیجئے۔ کسان کی مفلسی ملک کی مفلسی ہے، کسان کی خوشحالی ملک کی خوشحالی ہے لہذا جو لوگ، موجودہ درد کی دوا چاہتے ہیں اُنھیں کسان کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔ یقین ہے کہ اس موضوع پر اُردو میں اس سے بہتر کتاب ابتک پیش نہیں کی گئی ہے۔ کتابت۔ طباعت کاغذ اعلیٰ۔ ضروری ہے کہ ملک کا ہر بہی خواہ اسے بار بار پڑھے اور اس پر عمل کرے تاکہ غریب ہندوستان کے دن دوبارہ پھر جائیں۔ کتاب پریس میں جا چکی ہے اور عنقریب شائع ہو جائیگی۔ فوراً فرمائش بھیجئے۔ ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

قیمت عہ قیمت پیشگی بھیجنے والوں کو محصولڈاک معاف

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی

جملہ حقوق محفوظ ہیں — رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۱۱

مرتبہ: دیا نراین نگم، بی۔ اے

جلد ۶۴ — جون سنہ ۱۹۳۵ء — نمبر ۶

فہرست مضامین

تصویر: ہز امپیریل مجسٹی جارج پنجم قیصر ہندوستان

قیمت فی پرچہ ۸؁

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت سالانہ ممالک غیر سے ہے ششماہی ص۳ ہندوستان کیلئے ششماہی ؏

آپکی اپنی چائے
ہر سال کروڑوں پونڈ دنیا کی بہترین چائے ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے۔ اس میں سے آجکل ایک کروڑ پونڈ سے کم ہندوستان میں استعمال ہوتی ہے بقیہ تمام کی تمام سمندر پار کے ممالک کی فرمائشوں کی تعمیل میں وہاں بھیجی جاتی ہے۔ جہاں ہندوستان کی چائے کی لذیذ خوشبو کی حقیقی معنوں میں قدر کی جاتی ہے۔
تعجب کی بات ہے کہ ہندوستان جو تمام دنیا کو قریباً نصف چائے مہیا کرتا ہے ابھی خود چائے پینے کی عادت ڈالنے میں پس و پیش کر رہا ہے۔ ہمیں اس بات کا بہت کم احساس ہے کہ دنیا کی بہترین خوشبودار اور اعلیٰ قدر چائے میں سے اکثر ہندوستان میں پیدا کی جاتی ہے۔ اور اسکی پیداوار میں ہمارے اپنے بھائی یعنی ہندوستانی مزدور کام کرتے ہیں۔ اب ہمیں دھن پر دھری کا خاتمہ کرنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے استعمال کیلئے ہندوستانی چائے کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اس خوشبودار تندرستی بخش اور تازگی بخش پینے کی شے کو اپنا قومی شربت ہونے کی شے قرار دیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو چاہیئے کہ وہ ہر روز چائے کے چند پیالوں کا استعمال باقاعدگی کے ساتھ شروع کر دے۔ موسم گرما میں چائے جسم کو ٹھنڈا رکھتی ہے۔ چائے کا استعمال کر کے اس حقیقت کو آزمائیے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ چائے ہماری اپنی ہے اور ہمیں اس سے لطف اٹھانے کا اولین حق ہے۔
چائے تیار کرنے کا طریقہ
۱۔ ہمیشہ اچھی ہندوستانی چائے استعمال کیجئے۔
۲۔ اگر ممکن ہو سکے تو ہمیشہ مٹی کا برتن استعمال کیجئے اور اس میں چائے کی خشک پتیاں ڈالنے سے پیشتر اسکو کھولتے ہوئے پانی سے دھو لیجئے۔
۳۔ ہر شخص کیلئے خشک چائے کی پتیوں کا ایک چمچہ ڈالئے۔
۴۔ برتن میں ڈالنے سے پیشتر دیکھ لیجئے کہ پانی زور سے کھول رہا ہے۔ ایسا پانی کبھی استعمال نہ کیجئے جو کچھ عرصہ کھولنے کے بعد نیم گرم ہو گیا ہو۔
۵۔ ہمیشہ پہلے خشک چائے ڈالئے اور بعد میں کھولتا ہوا پانی ڈالئے۔
۶۔ کم از کم ۵ منٹ تک چائے کو اسی حالت میں پڑا رہنے دیجئے اور حسب ذائقہ دودھ و شکر ملا کر نوش کیجئے۔
کروڑہا اشخاص ہندوستانی چائے کا لطف اٹھاتے ہیں کیا آپ بھی ان میں شامل ہیں؟

ہز امپیریل میجسٹی ملک معظم جارج پنجم قیصر ہندوستان

زمانہ

جلد ۶۴ — جون ۱۹۳۵ء — نمبر ۶

سنسکرت اور فارسی قواعد کی مطابقت

(از مسٹر سلیم جعفر)

اسم آلہ

فارسی میں چند ہی لفظ ایسے ملتے ہیں جو اسم آلہ ہیں اور بذریعہ اشتقاق حاصل کئے گئے ہیں یعنی جو لاحقے لگا کر اسم آلہ بنا لے گئے ہیں۔

اس زبان میں اسمائے آلہ دو طرح کے ہیں، (۱) مشتق جنھیں مفرد یا حقیقی کہنا چاہیئے، اور (۲) غیر مشتق جنھیں مرکب یا غیر حقیقی کہنا چاہیئے اور جو اسم و امر کو ترکیب دیکر بنائے گئے ہیں۔

اسم آلہ مشتق میں صرف دو طرح کے لاحقات نظر آتے ہیں، (۱) ہائے ہوّز ماقبل مفتوح اور (۲) نون ماقبل مفتوح۔ اِن میں سے پہلی ترکیب سے بنے ہوئے اسمائے آلہ زیادہ ہیں۔ سنسکرت میں کاف ماقبل مفتوح (अक) لگا کر اسم فاعل ترکیبی بنایا جاتا ہے۔ یہ کاف ماقبل مفتوح موجودہ فارسی میں ہائے ہوز ماقبل مفتوح کی شکل میں لفظ "بندہ" میں پایا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسم آلہ میں جو ہائے ہوز ہے یہ کاف کی بدلی ہوئی صورت ہے اور اسم آلہ فارسی درحقیقت ایک طرح کا اسم فاعل ترکیبی ہے۔ لیکن اس کا نام اسم آلہ اِس مصلحت سے رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ فاعل کا فعل صادر ہوتا ہے۔ سنسکرت میں مادہ تپ (नप्) میں ردّ و بدل کرنے کے بعد اسم فاعل ترکیبی تاپک (नापक) بہ معنی "تپنے والا" بنتا ہے۔ فارسی میں مصدر کوفتن کا مادّہ "کوپ" (कूप्) ہے۔ اس سے اسم فاعل ترکیبی کوپک بنتا ہے۔ یہی لفظ تغیر صوتی کے طفیل

کو بہ بن گیا۔

اَن اور اِن سے بھی سنسکرت میں اسم فاعل ترکیبی بنتے ہیں۔ پَروَیڑیدن سے جو پرویژن نکلا ہے اُس میں اِن دونوں لاحقوں میں سے ایک ضرور ہے۔ ورنہ اگرچہ اسم آلہ حقیقی ہے لیکن یہ عربی کے مادہ وزن سے بنا ہے۔ یہ بھی ایک مزید ثبوت اس امر کا ہے کہ فارسی میں مادہ ہی مخزن اشتقاق ہے اور وہ غیر زبان کے لفظ لے لینے کے بعد انھیں بے تکلف اپنے قواعد کے تحت میں لے آتی ہے۔

اسم اور امر سے جو اسم آلہ بنایا جاتا ہے وہ دراصل اسم فاعل ترکیبی ہے اور اسی کے اصول کے مطابق بنا ہے جس کے مطابق کہ قلعہ دار اور عنبر آگیں بنائے گئے ہیں۔

اسم فاعل ترکیبی

فارسی میں جو طریقے اسم فاعل ترکیبی بنانے کے رائج ہیں وہ ہوبہو سنسکرت کی نقل ہیں، لیکن فارسی کا قواعد نویس ان قاعدوں کی اُس تقسیم سے قاصر ہے جو سنسکرت کے قواعد نویس نے کی ہے مضمون کے شروع ہی میں کہا جا چکا ہے کہ سنسکرت میں مادہ ایک مخزن ہے جس سے اسم و فعل وغیرہ سب کچھ بنا سکتے ہیں۔ فارسی قواعد نویس اس کا قائل نہیں۔ وہ ہر لفظ کو ایک قدیم و سالم لفظ مان کر آگے بڑھتا ہے اور جو کچھ اس سالمے میں گھٹایا بڑھایا گیا ہے اُسے بتاتا ہے۔ اگرچہ اس کی اس لاعلمی سے تحصیل زبان کو بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن طالب علم حقیقت سے دُور رہتا اور ایک ایسی منزل سے ابتدا کرتا ہے جو ابتدائی نہیں بلکہ درمیانی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سنسکرت کے مطابق اسم فاعل ترکیبی کی تقسیم بتائی جائے۔

اسم فاعل ترکیبی بنانے کے دو عام طریقے ہیں:-

(۱) اسم مفرد یعنی وہ اسم جو مادے میں ترمیم کرکے اس کے آخر میں لاحقات لگاکر بنایا جاتا ہے

(۲) اسم مرکب (समास) یعنی وہ اسم جو دو یا دو سے زیادہ اسموں کے ملانے سے بنتا ہے لیکن اس ترکیب سے جو اسم بنتے ہیں وہ ہمیشہ اسم ذات ہی نہیں ہوتے کبھی اسم صفت بھی ہوتے ہیں۔

اسم مفرد دو طرح کے لاحقے لگاکر بنایا جاتا ہے، ایک طرح کے لاحقے (कृत प्रत्यय) وہ ہیں جو مادہ یا اُس کی ترمیم کردہ صورت میں لگائے جاتے ہیں، اور دوسری قسم میں وہ لاحقے داخل ہیں (तद्धित - प्रत्यय) جو مادے یا اس کی ترمیم کردہ صورت میں قسم اول کے لاحقے لگانے کے بعد آتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ کہنا چاہیئے کہ قسم اول میں صرف ایک لاحقہ لگایا جاتا ہے اور قسم

دوم میں دو۔

اسم مرکب کی چھ قسمیں مانی گئی ہیں، لیکن ان سب کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔ آگے چلکر اسم فاعل ترکیبی کے بنانے کے طریقوں کی تقسیم کی جائیگی۔ وہیں یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ کونسا قاعدہ کس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

فارسی میں دونوں قسم کے لاحقے موجود ہیں۔

لاحقات قسم اول: آ (आ) - آن (आन) ور (वर) اُر (ऊर) - آنک[1] (आनक) آر (आर) = دانا - باران - نامور - گنجور - غمناک - خریدار

لاحقات قسم دوم: وند (वत) - مند[2] - مان (मत) - بد[3] (पति) - م (म) = پولادوند - شتربان - ارجمند - پشیمان - سپہبد - یکم۔

(۱) مرکب اسم جو اسم فاعل ترکیبی کا کام دیتے ہیں ان کی کثیر تعداد مرکب تابع شخصی (तत्पुरुष) کے تحت میں آتی ہیں۔ یہ یعنی مرکب تابع = (۱) اسم اور اسم مفعول اور (۲) دو اسموں کے ملانے سے بنتا ہے لیکن اس قسم کی تقسیم بہ لحاظ معنی کی گئی ہے۔ مثلاً اسم اور اسم مفعول سے جو مرکب بنتے ہیں۔

(ا) ان میں بعض اوقات تعلق مفعولی ہوتا ہے۔ یہ تابع مفعولی ہیں جیسے (स्वर्ग प्राप्त:) (وہ شخص جسے جنت مل گئی ہو) اس کی فارسی مثالیں زبان بریدہ۔ عناں گسستہ وغیرہ ہیں۔

(ب) بعض کے تعلق سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدور فعل کا اسم باعث وعلت ہوا ہے، اس کو تابع سببی کہنا چاہیئے۔ مثلاً (लोभ मोहित) (اسیر حرص یا جس کا دل لالچ نے موہ لیا) قحط زدہ - زراندوہ وغیرہ اس کی مثالیں سمجھنا چاہیئے۔

(ج) غرض وغایت بھی یہی مرکب ظاہر کرتا ہے اور اس کو مرکب غایتی کہہ سکتے ہیں: शरणागत (پناہ کے لئے آیا ہوا)۔ یہ مرکب خود سنسکرت میں بہت کم آتا ہے اس لئے اس کی فارسی کی مثالیں الشاذ کالمعدوم کا مصداق ہیں۔

(د) کبھی اس سے انتقال مکان کا کام لیا جاتا ہے۔ اس صورت میں تابع انتقالی اس کا نہایت

---

[1] میرا خیال ہے کہ فارسی کا "ناک" اسی "آنک" کی مسخ شدہ صورت ہے صرف حرفوں کی تقدیم وتاخیر ہے جسکی مثالیں فارسی میں ناپید نہیں ہیں۔ بھیانک اور ہولناک" دونوں پہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "آنک" اور "ناک" دونوں لفظ ایک ہی معنی میں آتے ہیں۔

[2] "وت" اور "مت" دونوں میں "ت" "د" سے بدلی ہوئی ہے اور ان کے پہلے "ن" سنسکرت کے قاعدہ کے مطابق بڑھا ہوا ہے۔ بان - وت سے اور مان - مت سے نکلا ہے۔ سنسکرت میں جن اسموں کے آخر میں "وت" ہوتا ہے بوقت تصریف یہ "وان" اور "مان" سے بدل جاتے ہیں۔

[3] اس لاحقہ سے بنے ہوئے لفظوں کو سنسکرت کے قاعدہ کی رو سے اسمائے مرکب میں داخل کرنا چاہیئے۔

موزوں نام ہے۔ مثال :- राज-भ्रष्ट (سلطنت سے گرا ہوا یعنی معزول)۔ فارسی اس قسم کی ترکیبوں سے کام لیتی ہے تو صرف جر۔ از بڑھا کر ایک مرکب غیر مفید تیار کرتی ہے مثلاً ہوش از سر پریدہ دل از دست رفتہ وغیرہ۔

(ھ) دو اسموں سے بنتا اور دونوں میں تعلق اضافی ظاہر کرتا ہے، اس لئے اس کا نام تابع اضافی رکھنا چاہیئے۔ سنسکرت میں بہ کثرت آتا ہے (जन्म स्थान) (جنم کی جگہ۔ جائے پیدائش)۔

(و) تابع ظرفی وہ مرکب اسما ہیں جو زمان و مکان پر دلالت کریں۔ مثلاً - ग्राम वासी (گاؤں میں رہنے والا)۔ درحقیقت اس قسم کے مرکبات میں ایک لفظ ایسا ہوا کرتا ہے جو مکان یا زمان پر دلالت کرتا ہے۔

(ز) اب تک کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرکبات ناقص یا توابع صرف دو ہی دو لفظوں سے بنتے ہیں، یہ بات نہیں ہے بلکہ کئی کئی لفظ ملا کر بھی بنائے جاتے ہیں، اور ان میں مذکورہ بالا پانچ تعلقات میں سے کوئی سا تعلق ہو سکتا ہے۔ مثلاً : रथमध्यस्थः (رتھ کے بیچ میں کھڑا ہوا)۔

۲۔ مرکبات ناقص کی ایک قسم تابع غیر منصرف بھی ہے۔ (अव्ययी भावः) یہ کسی اسم پر لاحقہ لگا کر بنایا جاتا ہے۔ جیسے प्रतिनिशम् (ہر رات)

۳۔ تابع وصفی (कर्मधारय) جو کسی اسم صفت اور اسم کو ملا کر بنایا جائے۔ یہ صفت خواہ کسی قسم کی ہو جیسے चिरमित्रम् (پرانا دوست)۔ اس تابع وصفی کی ایک خاص صورت اور ہے اور وہ یہ کہ کبھی کبھی ایک اسم کو دہراتے اور دونوں کو اس طرح ملاتے ہیں کہ پہلے جزو کے حرف آخر کو ممدودہ (दीर्घ) کرکے دوسرے جزو کے حرف آخر کے پہلے حرف "اِی" (इ) بڑھا دیتے ہیں۔ اُس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں " آپس کا " - ایک دوسرے کا " مقابل جیسے नरवानरिव (ناخن کے مقابل ناخن)۔

۴۔ سنسکرت میں مرکب عددی (द्विगु) یوں بنایا جاتا ہے کہ اسم سے پہلے ایک اسم عدد لاتے ہیں جیسے त्रिदिनम् (تین دن)۔

اب فارسی کے اسم فاعل ترکیبی دیکھیئے۔

(۱) امر کے آخر میں الف اور نون لگا کر جو اسم فاعل ترکیبی بنائے جاتے ہیں وہ تو اسم حالیہ ہی ہیں اور اسم حالیہ کے تحت میں ان کا ذکر آ چکا ہے۔

(۲) وہ مرکب ناقص جو دو اسموں کے ملانے سے بنتا ہے اور جس میں سے لفظ "شل" اس کی

ترکیب تشبیہی سے محذوف ہوتا ہے جیسے ۔ ماہ رخ ۔ نرگس چشم وغیرہ یہ تابع شخصی کی ایک قسم ہے اس کی مثال سنسکرت میں یہ ہے ۔ चन्द्रा कृतिः (وہ جس کی شکل چاند کی سی ہے ۔)

(۳) فارسی میں سنسکرت کے تابع غیر منصرف کی مثالیں ۔ مالا مال ۔ دوشا دوش ۔ رنگا رنگ ہیں ۔

(۴) سنسکرت میں کار اور کر ۔ دونوں بطور لاحقات استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً घटकारः (گھڑے بنانے والا ۔ کمہار) اور भास्कर: (چمکنے والا یعنی سورج) یہی دونوں لاحقے فارسی میں گار ۔ اور ۔ گر ۔ میں جو خدمت گار اور زرگر میں نظر آتے ہیں ۔

(۵) قلعہ دار ۔ جاندار وغیرہ میں ۔ دار ۔ धार (دھار) کا ہم معنی اور مادہ धृ (بمعنی ۔ رکھنا ۔ پکڑنا ۔) سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ یہ اسم فاعل ترکیبی تابع شخصی کے تحت میں آتا ہے ۔ سنسکرت کی مثال یہ ہے ۔ कर्ण-धार (ملاح)

(۶) بندہ ۔ اسم فاعل کے تحت میں بحث کی جا چکی ہے ۔

(۷) سنسکرت کا "دھان" (धान) جس کے معنی ہیں ظرف ۔ مقام ۔ وغیرہ ۔ فارسی میں آکر ۔ دان ہو گیا ۔ سنسکرت کی مثال अंगारधानी (انگیٹھی) فارسی کی مثال ۔ گلدان ہے

(۸) سرلشکر ۔ نبات ریزہ (قلب اضافت سے بنا ہے ۔) شاہ جہاں (فک اضافت سے) یہ تینوں ایک ہی طرح کے لفظ ہیں ۔ قواعد فارسی میں خواہ مخواہ موشگافی کی گئی ہے ۔ یہ حقیقتہً تابع شخصی اضافی ہے ۔

(۹) ہوش از سر پریدہ وغیرہ تابع شخصی انتقالی کی مثالیں ۔ فارسی میں حرف جر کی مدد سے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے ۔

(۱۰) کہتے ہیں کہ گمراہ ۔ اور ۔ جگر خون میں اسم مفعول محذوف ہے اور اس کی تشریح و توضیح یوں کی جاتی ہے ۔ گم کردہ راہ ۔ خوں کردہ جگر ۔ لیکن جگر خوں ۔ کو تابع شخصی (तत्पुरुष) کی ایک قسم ماننا چاہئیے ۔ کیونکہ سنسکرت میں चन्द्रा कृतिः کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں" وہ جس کا حسن مانند ماہ ہے"۔ اس صورت میں جگر خون کے معنی ہوں گے" وہ جس کا جگر مانند خون ہے" ۔ گمراہ ۔ تابع وصفی (कर्मधारय) کی قسم میں داخل ہے ۔ अल्प शक्तिः (وہ جس کی قوت کم ہے یعنی کمزور) اسی طرح ۔ گمراہ ۔ کے معنی ہونگے وہ جس کا راستہ گم ہو گیا ۔ یا راہ گم کرنے والا ۔

ہوش از سر پریدہ وغیرہ کو اسم فاعل ترکیبی میں شامل کر لیا گیا ہے لیکن ان کو درحقیقت مرکبات ناقص صفاتی (Adjectival phrases) کہنا چاہیئے ۔

ترکیب مفعولی یا صفت

کہا جاتا ہے کہ صیغۂ ماضی مطلق کبھی اسم مفعول کے معنی بھی دیتا ہے مگر اتفاقاً...... جو ماضی کا صیغہ آگیا وہی آگیا۔ اس کے معنی یہ لینا چاہیئے کہ زبان میں ایک اصول موجود ہے جو اب قلیل الاستعمال ہے، ممکن ہے کہ کبھی کثیر الاستعمال ہو۔ اس بنا پر یہ کہنا جادۂ اعتدال سے تجاوز کرنا نہیں کہ اسم اور ماضی کی ترکیب سے جو صفت بنائی جاتی ہے اُسے یا تو ترکیب مفعولی نہیں کہہ سکتے یا ترکیب مفعولی مانیں تو پھر اس ماضی کو اسم مفعول سمجھیں۔ مثلاً خاربست (کانٹوں کی باڑھ) میں "بست" کو "بستہ" کا مرادف تسلیم کرنا چاہیئے۔ اگر یہ خیال قرین صحت ہے تو ترکیب مفعولی کے جتنے قاعدے بتائے گئے ہیں اُن میں سے ایک کم ہوجائے گا۔ اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ "غبار آلود" وغیرہ کو "غبار آلودہ" مانا گیا ہے، اور "آلودہ" میں سے "ہ" محذوف تصور کی گئی ہے۔

"زباں بریدہ" "تابع شخصی" کی مثالوں میں پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ دانستہ کیا گیا ہے کیونکہ اس باب میں قواعد نویس کے خیال میں گنجلک معلوم ہوتی ہے۔ اسم فاعل ترکیبی کے بیان میں کہتا ہے "اسم مفعول کسی جملہ میں ترکیب پایا ہوا مثلاً مرد جہاں دیدہ" اور ترکیب مفعولی یا صفت کے قاعدوں میں ایک قاعدہ یہ بتاتا ہے کہ ایک مفعول مشتق" یا صفت مشبہ اور ایک اسم کی ترکیب دینے سے مثلاً "تیغ جفا خوردہ" قطع نظر اس سے کہ دونوں عبارتوں کے معنی میں کوئی فرق نہیں۔ صرف الفاظ اور اسلوب کلام میں تفاوت ہے" مرد جہاں دیدہ" کا آخری لفظ اپنے محل وقوع کی وجہ سے کوئی خاص بات پیدا نہیں کرتا بلکہ ایک لفظ سے مل کر معنی صفت پیدا کرتے ہیں۔ اصلی قاعدہ صرف یہ ہے کہ" ایک اسم مفعول اور ایک اسم کے ملانے سے معنی صفت حاصل ہوتے ہیں" اور بس۔ پہلی مثال میں اسم "مفرد" ہے اور دوسری میں "مرکب" پہلی میں صفت مشبہ اور موصوف دونوں موجود ہیں اور دوسری میں موصوف" محذوف" اور صفت موجود یعنی اسم مرکب مع مفعول۔ اس کے سوا دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

رُباعی

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

ہر جذبۂ بیدار کو سوتے دیکھا ہنسنے والوں کو تھک کے روتے دیکھا
آخر آخر ہر اک رنگینی کو اپنے ہی لہو میں غرق ہوتے دیکھا

کلامِ جوشؔ

رندوں کی شب قدر

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

کل رات کو ساقی نے عجب دھوم مچا دی
آنکھوں میں جو کھنچتی ہے وہ صہبا میں ملا دی

مے ناز کی، نزدیک سے چھلکا کے دمِ رقص
بُو دُور سے مہکی ہوئی زلفوں کی سنگھا دی

آنے لگیں ہونٹوں پہ تبسم کی جو لہریں
رَو۔ کوثر و تسنیم کی آنکھوں میں دکھا دی

عارض پہ جو حلقہ سا پڑا وقتِ تبسم
تصویر سلیماں کے نگینے کی بنا دی

سر نشے میں تھوڑا سا جھکا اور اٹھی آنکھ
گویا درِ میخانہ کی زنجیر ہلا دی

سینے پہ پڑا سر کے جھکانے سے جو سایہ
اُس سایۂ شبگوں نے مری نیند اڑا دی

سرشارِ جوانی کی وہ بدمست لگاوٹ
لہجے نے چھپا لی تو نگاہوں نے دکھا دی

مستانہ غزل چھیڑ کے بیلا جو اٹھایا
قرباں تری آواز کے، زہرا نے صدا دی

نظروں کو کیا شوخیِ مے نے کبھی آزاد
پلکوں کو حیا نے کبھی زنجیر پنھا دی

آشفتہ مزاجوں کو کبھی ناز سے دیکھا
گستاخ نگاہوں کو کبھی آنکھ دکھا دی

دنیا کا کوئی ساز جسے چھو نہیں سکتا
ہونٹوں پہ زباں پھیر کے وہ دھن بھی سنا دی

انگڑائی جو آئی تو کچھ اس لوچ سے دیکھا
آنکھوں نے کیا شکر، تمنا نے دعا دی

المختصر آنکھوں میں مری ڈال کے آنکھیں
معلوم نہیں، آگ لگا دی کہ بجھا دی

پیمانہ ترا گرم رہے جوشؔ کہ تو نے
رندوں کو شبِ قدر کی تصویر دکھا دی

افسوس کوئی واقفِ منزل نہ ہوا
ناقص ہی رہا ہمیشہ کامل نہ ہوا

نادان پیدا ہوا تھا ناداں ہی مرا
انساں کو کبھی بلوغ حاصل نہ ہوا

مثنوی سحر البیان

(از مولوی حسن یحییٰ عندلیب بی۔ اے علیگ)

اُردو شاعری فارسی شاعری کا چربہ ہے، ہمارے شعرا نے قریب قریب ہر صنف میں ایرانیوں کا اتباع کیا ہے۔ اور یہ کیا با عتبار خیال، اور کیا با عتبار روش، برابر ایرانیوں کی تقلید باعث فخر سمجھتے رہے ہیں۔ اصناف سخن میں غزل کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ فارسی شعرا نے بہت سی باتیں عربوں سے سیکھی ہیں تاہم غزل ان ہی کی ایجاد کردہ صنف ہے چونکہ ہماری شاعری کی اصل بنیاد فارسی شاعری پر رکھی گئی ہے اس لئے ہمارے شاعر اُن کی تقلید کرنے پر مجبور تھے۔ فارسی شعرا غزل میں اپنا مطلوب بجائے عورت کے مرد کو قرار دیتے ہیں۔ ہمارے شعراء نے بھی ان کی تقلید کی۔ اور بغیر یہ خیال کئے کہ مرد سے مرد کا اظہار عشق نہ صرف مضحکہ خیز بلکہ غیر فطری بھی ہے۔ ہندوستانیوں نے غزل پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور زیادہ تر اسی صنف میں مشق سخن کی ہے۔ حالانکہ ایرانیوں نے شاعری کے دیگر اصناف میں بھی کافی زور سخن صرف کیا ہے۔ اور بعض بعض ایسی بیش بہا اور عدیم المثال نظمیں ان کے یہاں موجود ہیں جن کا اقوام عالم کے لٹریچر میں بھی پتہ نہیں ملتا۔ اگر غزل میں اُنھوں نے حافظ و سعدی اور جامی و نظیری جیسے شاعر پیدا کئے تو مثنوی اور قصیدہ میں بھی فردوسی اور خاقانی و انوری جیسے استادانِ باکمال پیدا کئے۔ ہمارے یہاں قصیدہ میں صرف سودا اور ذوق خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کوئی دوسرا شخص ان کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

دوسرے اصنافِ سخن کی طرح مثنوی کا ڈھانچہ بھی ایرانی طرز پر تیار کیا گیا ہے۔ فارسی شاعر بالعموم مثنوی میں ایک عشقیہ افسانہ نظم کرتے ہیں۔ اُردو میں بھی جس مثنوی کو دیکھئے اسمیں عشق کا دفتر بند ہے۔ شاہنامہ اگرچہ ایک مشہور رزمیہ نظم ہے لیکن یہ بھی کہیں کہیں عشق کا پہلو لئے ہوئے ہے تاہم اس کا خاص مضمون عشق نہیں ہے بلکہ قدیم ایرانی سورماؤں کے بہادرانہ کارناموں کا جتلانا مقصود ہے۔ مگر اُردو لٹریچر میں "داستان عشق" کے سوائے کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ نثر میں افسانے لکھے جاتے ہیں تو عشقیہ، مثنوی لکھی جاتی ہے تو عشقیہ، غزل لکھی جاتی ہے تو عشقیہ، جہاں

دیکھئے عشق ہی عشق جلوہ گر ہے۔ نیچرل نظمیں یا قومی نظمیں لکھنے والے ہمارے یہاں بہت کم ہیں
فارسی مثنویاں اگرچہ زیادہ تر عشقیہ ہیں لیکن ان میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے اور ان میں
ہرگز ایسی ہوسناکی نظر نہیں آتی جیسی کہ ہماری مثنویاں جابجا پیش کرتی ہیں۔ بقول مولانا حالی
مثنوی تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہے کیونکہ غزل یا قصیدہ
میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ ہر قسم کے مسلسل
مضامین کی گنجایش نہیں ہوسکتی۔ مسدس۔ ترجیع بند اور ترکیب بند میں بھی اسی قسم کی دوسری
دقتیں سدّراہ ہوتی ہیں لیکن مثنوی میں مسلسل خیالات ادا کرنے کی بہت گنجایش ہے۔ تاریخ
قصہ، اخلاق، تصوف، فلسفہ غرض ہر چیز اس صنف میں ادا ہوسکتی ہے۔ مگر اُردو میں چند
چھوٹی چھوٹی عشقیہ مثنویوں کے علاوہ اخلاق یا تاریخ وغیرہ میں آجتک کوئی چھوٹی بڑی مثنوی
نہیں لکھی گئی۔ ہمارے شعرا نے مثنوی کو بھی غزل کی طرح عشقیہ افسانے لکھنے کے لئے مختص
کردیا ہے[۵]۔

غالباً اُردو زبان میں سب سے پہلی مثنوی میر تقی میر نے لکھی ہے۔ اُنھوں نے کئی مثنویاں
تصنیف کی ہیں جو چھوٹی چھوٹی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ دَور اُردو کا ابتدائی زمانہ تھا اس لئے
اُس وقت اور آجکل کی زبان میں ایک مابہ الامتیاز فرق ہوگیا ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہیں
جو اب متروک ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مثنویاں اب ہم کو زیادہ پسند خاطر نہیں معلوم ہوتیں
میر صاحب مثنوی شعلۂ عشق میں لکھتے ہیں۔

کسی چشم نے تجھ کو جادو کیا　　مرے جامِ عشرت کو "لو ہو" کیا

یہاں "لوہو" کا لفظ بجائے لہو استعمال ہوا ہے۔ ایک دوسری مثنوی میں اُنھوں نے لکھا ہے:۔

کام میں عشق اپنے یکتا ہے　　ہاں یہ نیرنگ ساز یکتا ہے

یکتا بجائے یکتا استعمال کیا گیا ہے۔ الغرض اس قسم کے بہت سے الفاظ میر صاحب کی مثنویوں
میں موجود ہیں جو آجکل غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مثنویوں میں کوئی
دلکشی نظر نہیں آتی۔

میر صاحب کے بعد میر حسن نے مثنوی سحرالبیان لکھی جو اُردو لٹریچر میں آجتک بے نظیر ہے

[۵] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے مثنوی گلزار ابراہیم، میر حسن کی مثنوی رموز العاشقین، شاہنامۂ اُردو
اور [illegible] مصنفین کے منگناے وغیرہ نہیں دیکھے (ا-ز)

میر حسن خود اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

زبس عمر کی اس کہانی میں صرف تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف

مصنف نے اس میں ہرگز کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں کی بلکہ واقعیت کا اظہار کیا ہے۔ میر تقی میر اور میر حسن کا زمانہ قریب قریب ایک ہی ہے۔ لیکن میر حسن نے اپنی مثنوی نہایت صاف اور سلیس عبارت میں نظم کی ہے اگرچہ اس میں بھی بعض جگہ ایسے الفاظ موجود ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ کانوں کو ناگوار ہونا درکنار محسوس تک نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ یہ مثنوی اردو ادب میں لاجواب ہے۔ اس مثنوی کے ساٹھ ستر برس بعد نواب مرزا شوق نے کئی مثنویاں لکھیں اور اُن کے بعد پنڈت دیاشنکر نسیم نے مثنوی گلزار نسیم تصنیف کی لیکن ہر دو اصحاب میر حسن سے زیادہ بہتر اضافہ اُردو ادب میں نہ کر سکے۔ بیشک نواب مرزا شوق کے یہاں بھی زبان کی صفائی اور دلکشی موجود ہے لیکن وہ زیادہ قابل تعریف اس وجہ سے نہیں کہ میر حسن کے ساٹھ ستر سال بعد زبان بہت کافی منجھ چکی تھی۔ لہذا شوق کے لئے اپنی مثنوی کا صاف زبان میں نظم کرنا کوئی دشوار امر نہ تھا۔ برخلاف اس کے میر حسن کو یقیناً دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ سنا گیا ہے کہ میر انیس کا بھی ارادہ تھا کہ ایک مثنوی لکھیں اور اس کو لکھنا بھی شروع کر دیا تھا لیکن درمیان میں خیال آیا کہ دادا جان کی مثنوی دیکھ لینی چاہیئے۔ مثنوی پڑھنے کے بعد یہ رائے قائم ہوئی کہ میں اس سے زیادہ بہتر زبان نہ لکھ سکونگا لہذا وہ ارادہ فسخ کرنا پڑا۔ اور اُن کی مثنوی ناتمام رہ گئی۔ میر انیس مسلّمہ طور پر زبان کی نزاکت اور اشعار کی روانی میں مشہور ہیں۔ لیکن جب انیس جیسے شاعر کی بھی سحرالبیان کے متعلق یہ رائے ہو تو مثنوی کے افضل ہونے میں شبہ کی کیا گنجایش ہو سکتی ہے۔

جیسا کہ سحرالبیان کے قصہ سے ظاہر ہے یہ افسانہ محض فرضی ہے اور ہرگز کوئی اصلیت نہیں رکھتا کیونکہ بعض باتیں اس افسانہ میں ایسی ہیں جو قرین قیاس نہیں لیکن میر حسن نے اپنے زمانہ کے نوابوں اور شاہزادوں کی حالت کا نقشہ نہایت صحیح کھینچا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال سے مسلمانوں پر بالعموم اور شاہزادوں اور نوابوں پر بالخصوص عیش و عشرت کی دیا مسلط تھی۔ ہر طرف محفل رقص و سرود جمی ہوئی تھی۔ سلطنت کے کاموں سے بادشاہوں کو قطعاً سروکار نہ تھا۔ دلّی کے شہزادے اور اودھ کے نواب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ الغرض میر حسن نے اپنی تصنیف میں قوم کی تباہی کا نقشہ کھینچا ہے

جو نہایت خوب ہے۔ اس مثنوی میں میرحسن نے قریب قریب ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے جو بادشاہوں کے یہاں عام طور پر واقع ہوتی تھیں اور اس بات کا بھی خاص اہتمام کیا ہے کہ جو بات ہو برمحل و باموقع ہو جس کی مثالیں جابجا موجود ہیں۔

جب بادشاہ نے فقیری اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو مشیروں اور وزیروں نے نہایت نیک صلاح دی جس کا اثر بادشاہ کے دل پر ہوا

فقیری جو کیجئے تو دنیا کے ساتھ نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ
کرو سلطنت لیکن اعمال نیک کہ تا دو جہاں میں رہے حال نیک
یہ دنیا جو ہے مزرع آخرت فقیری میں ضائع کرو اس کو مت
عبادت سے اس کشت کو آب دو کہ واں جا کے خرمن کو تیار لو
رکھو یاد عدل و سخاوت کی بات کہ اس فیض سے ہے تمہاری نجات

جس وقت بادشاہ کی خدمت میں نجومی حاضر ہوئے اور انھوں نے اس کا زائچہ دیکھا تو کہا:۔

کہا "رام جی کی ہے تجھ پر دیا چندرماں سا بالک ترے ہوئیگا"

اگر اس خیال کو پنڈتوں کی زبان میں ادا نہ کیا جاتا تو نہایت بے لطفی پیدا ہو جاتی۔ اور اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی کوئی پنڈت کھڑا ہوا ہے۔

بادشاہوں کے یہاں سیکڑوں شوخ و شریر کنیزکیں اور لونڈیاں ہوتی ہیں جو عیش و عشرت کے وقت ضرور ایسا کرتی ہونگی ؎

کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں
بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے کہیں واہ وا اور کہیں واچھڑے
کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے کوئی نہر پر پاؤں بیٹھے ہلائے

پرستان میں ہوشیار جب بے نظیر بیدار ہوا تو اس کو ایک نیا عالم نظر آیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ کسی اجنبی مکان میں آ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بارہ سال کی عمر کے بچے کو کسی قدر خوف محسوس ہونا چاہیئے۔ لیکن میرحسن نے اس کا بھی خیال کیا کہ بے نظیر اگرچہ بچہ تھا۔ تاہم وہ بادشاہ کا لڑکا تھا اس لئے اُس کو قطعاً خوفزدہ نہ ہونا چاہیئے تھا بلکہ کسی قدر دلیری اور ہمت کے آثار اس کے چہرہ سے نمایاں ہونے چاہیئے تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

زبس تھا وہ لڑکا تو سہما بھی کچھ ہوا کچھ دلیر اور حیراں بھی کچھ

پھر جب بینظیر نے پری سے دریافت کیا کہ میں یہاں کیسے آیا تو اس نے یہ راز مخفی رکھتے ہوئے کہ وہ خود ہی اس کو لائی تھی تعجب کا اظہار کیا کہ ایک غیر شخص میرے مکان میں بغیر اجازت کیونکر گھس آیا

خدا جانے تو کون یاں ہے کہاں مجھے بھی تعجب ہے ہاں ہے کہاں

بدر منیر کو جب اس کی کنیزوں نے اطلاع دی کہ باغ کے درختوں میں ایک شخص چھپا کھڑا تو وہ کسی قدر سہمتی اور ڈرتی ہوئی بینظیر کو دیکھنے پہونچی۔ میر حسن نے اس وقت کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے :-

خواصوں کے ہاتھوں پہ دھر اپنا ہاتھ عجب اک ادا سے چلی ساتھ ساتھ
کچھ اس خوف سے ہول کھاتی ہوئی دھڑک اپنے دل کی مٹاتی ہوئی

صنف نازک کو فطرتاً شرم کا مادہ کچھ زیادہ ودیعت کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں پہلی ملاقات میں ویسے بھی ایک قسم کی جھجک ہوتی ہے۔ چنانچہ بدر منیر اور بینظیر کی پہلی ملاقات کا ذکر اس طرح پر کیا گیا ہے۔

وہ بیٹھی عجیب ایک انداز سے بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے لجائے ہوئے، شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن کہ جوں شبنم آلودہ ہووے چمن

فیروز شاہ نجم النسا سے جو جوگن کے بھیس میں ملبوس تھی یوں ہمکلام ہوا۔

یہ سمجھا بناوٹ کا کچھ بھیس ہے لگا کہنے "جوگی جی آدیس ہے"
"پڑا تم پہ ایسا کہو کیا بجوگ لیا واسطے کس کے تم نے یہ جوگ"
"کدھر سے تم آئے کدھر جاؤ گے دیا اپنی ہم پر بھی فرماؤ گے"

پس مقصد کہنے کا یہ ہے کہ بات کرنے کے لئے بھی سلیقہ چاہیئے۔ ایک جوگی سے اسی طریقہ پر بات کرنے کی ضرورت تھی۔ اگر فیروز شاہ اس سے ایک عام آدمی کی طرح گفتگو کرتا تو ہرگز لطف نہ آتا۔ حاصل کلام میر حسن نے موقع اور محل کا بے حد خیال رکھا ہے۔ ان کے یہاں ہر چیز میں مناسبت موجود ہے۔

میر حسن نے انسان کی زندگی کا نہایت عمیق مطالعہ کیا ہے اور کائنات کے ذرہ ذرہ کو نہایت غور سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان تمام رموز و حقائق سے واقف ہیں جن کا علم شاعر کے لئے نہ صرف اشد ضروری ہے بلکہ ان کا جاننا اس کا فرض اولین ہے۔ اگر وہ اس حالت سے واقف نہیں

جو انسان پر خوشی کے عالم میں گزرتی ہے تو اُن کے یہ نقشہ بھی پیش نظر ہے جو درد و غم کے وقت ہمارے روبرو ہوتا ہے۔ اگر وہ لمحاتِ یاس سے باخبر ہیں تو اُمید کی گھڑیوں سے بھی آگاہ ہیں۔ اگر وہ لذت وصل سے لطف اندوز ہوئے ہیں تو ہجر و فراق کے صدمات بھی سہہ چکے ہیں۔ الغرض اُنھوں نے ہر چیز کا مشاہدہ غور سے کیا ہے۔ اور اُن کے کلام کی مقبولیت کی یہی وجہ ہے۔ کیونکہ جب وہ کسی چیز کا نقشہ کھینچکر دکھاتے ہیں تو اُن کے یہاں ہرگز کوئی ایسی شے نہیں ہوتی جو اُن کے نقشہ کو اَن نیچرل یا غیر فطری بنا دے۔ میر حسن نفسیاتِ انسانی کو خوب سمجھتے ہیں۔ اُنھوں نے بینظیر کے فراق میں جو حالت بدرِ منیر کی ظاہر کی ہے وہ نہایت نیچرل ہے اور ایسی باتیں اِن حالتوں میں اکثر واقع ہوتی ہیں:-

دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی — درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی — دُرِ اشک سے چشم بھرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی — بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ — اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا — نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے — محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کہا گر کسی نے کہ "بی بی چلو" — تو اُٹھنا اُسے کہہ کے "ہاں جی چلو"
جو پوچھا کسی نے کہ "کیا حال ہے" — تو کہنا "یہی ہے جو احوال ہے"
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی — یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ "کچھ کھائیے" — کہا "خیر بہتر ہے منگوائیے"
کسی نے کہا "سیر کیجے ذرا" — کہا "سیر سے دل ہے میرا بھرا"

. . . .

چمن پر نہ مائل نہ گل پر نظر — وہی سامنے صورت آٹھوں پہر
نہفتہ اُسی سے سوال و جواب — سدا روبرو اس کے غم کی کتاب

انسان کا کسی کے ہجر میں دیوانہ ہو جانا ۔ ایک خاص جگہ اس کی جستجو کرنا ۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا بہنا ۔ زندگی سے بیزار ہو جانا ۔ سونے کے بہانے اُس کا تصور کرنا ۔ تنہائی میں بیٹھکر رونا ۔ طبیعت کی شگفتگی کا جاتا رہنا ۔ کھانے پینے سے قطعی سروکار نہ ہونا ۔ جہاں بیٹھ جانا گھنٹوں

سی جگہ بیٹھے رہنا، کسی نے سوال کیا تو جواب دے دیا ورنہ خاموش بیٹھے رہنا۔ الغرض تمام باتیں میر حسن نے ایسی لکھی ہیں جو عام طور پر ان حالتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہیں

میر حسن کی مثنوی کی اس مثال سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ میر حسن نفسیات انسانی اور انسان کی زندگی سے کس حد تک واقف ہیں۔ اب ہم ایک دوسری چیز لیتے ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق شاعری مصوری ہے۔ چنانچہ اس پہلو سے بھی سحرالبیان لاجواب ہے۔ ہر ورق پر ایسے اشعار موجود ہیں جن کو صفحۂ قرطاس سے جامۂ تصویر پر منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اگر شاعر تصویر کھینچنے سے عاری ہے تو یقین جانیئے اس کی شاعری ناتمام ہے۔ محاکات میں جامی کا یہ شعر اکثر پیش کیا جاتا ہے

لغزش مستانہ در رفتار و جام مے بکف　　رخصت اے تقویٰ کہ یار آمد بسامانِ دگر

واقعی شعر نقشہ کشی کے اعتبار سے نہایت مکمل ہے۔ اردو میں میر انیس کو یہ کمال حاصل ہے کہ جس سماں کا نقشہ کھینچتے ہیں وہ ہو بہو نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن میر حسن خود بھی فن مصوری میں یدطولیٰ رکھتے ہیں اور یہ سمجھ میں بھی نہیں آ سکتا کہ جس شخص کا پوتا اس فن میں کامل ہو تو کیا وہ خود بالکل ہی ناواقف ہو گا۔ باغ کا نقشہ کھینچتے ہوئے میر حسن لکھتے ہیں:-

چمن سے بھرا باغ گل سے چمن　　کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا　　کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشاں　　مدن بان کی اور ہی آن و باں
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار　　جدی اپنے موسم میں سب کی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں　　سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
عجب چاندنی میں گلوں کی بہار　　ہر اک گل سفیدی میں مہتاب وار
کہیں زرد نسریں کہیں نسترن　　عجب رنگ کے زعفرانی چمن
گلوں کا لب نہر پر جھومنا　　اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر　　نشے کا سا عالم گلستان پر
چمن آتش گل سے دہکا ہوا　　ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
خوشی سے گلوں پر کریں بلبلیں　　تعشق کی آپس میں باتیں کریں

اس قسم کی تصویر جیسی میر حسن نے باغ کی یہاں پر کھینچی ہے نسیم کے یہاں اسکا نام بھی نہیں۔

چکبست صاحب بھی میر حسن کے اس جوہر کو مانتے ہیں۔ جو مقدمہ انھوں نے گلزارِ نسیم کے ساتھ شائع کیا تھا اسمیں اس طرح رقمطراز ہیں " میر حسن کے اشعار کا اثر بجلی کی طرح دل میں دوڑ جاتا ہے جو حالت وہ بیان کرتا ہے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے" میر حسن سخن آفریں ہیں، انکی زینت حسنِ صورت سے ہے: ہم اپنے دعوے کی تصدیق میں ایک اور مثال پیش کرتے ہیں میر حسن شب ماہتاب کی تصویر کھینچتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:-

وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر — وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت — اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتّے چمکتے ہوئے — خس و خار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور — گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور
نظر جو کہ پڑتی تھی بوٹی جڑی — سو وہ عالمِ وجد میں تھی کھڑی
درختوں سے لگ لگ کے بادِ صبا — لگی وجد میں بولنے واہ وا

میرے خیال میں باغ اور شبِ ماہتاب کی جو تصویریں میر حسن نے کھینچی ہیں وہ نہایت جامع اور مکمل ہیں۔ اس سے زیادہ بہتر تصویر کھینچنا ممکن نہیں۔ بدر منیر جس وقت بنیظیر کو دیکھنے درختوں کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی تو اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:-

سَرَکنے کی واں سے نہ جاگہ نہ ٹھاؤں — دیے حیرتِ عشق نے گاڑ پاؤں
گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل — نظر سے نظر، جی سے جی، دل سے دل

تشبیہ بھی بعض لحاظ سے شعر کی جان ہوتی ہے۔ اس صنعت سے یہ فائدہ ہے کہ جو بات دو سطروں میں بیان نہیں ہوسکتی وہ دو لفظوں میں ادا ہو جاتی ہے۔ لیکن تشبیہ ہرگز دور از قیاس نہیں ہونی چاہئیے۔ سحر البیان میں میر حسن نے بعض تشبیہات نہایت عمدہ پیش کی ہیں۔ چکبست کے خیال کے مطابق میر حسن صرف محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں اور استعارہ و تشبیہ نسیم کا حصہ ہے لیکن یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ ہزارہا مثالیں سحر البیان میں موجود ہیں جو اس رائے کی تردید کرتی ہیں۔ وہ نہ صرف محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں بلکہ عمدہ تشبیہات کا اپنے کلام میں داخل کرنا ان کا خاص جوہر ہے۔

وہ جُھک جُھک کے گرنا خیابان پر — لُٹنے کا سا عالم گلستان پر

بادِ بہاری سے پھولوں کے گر جانے کے منظر کو اس سے بہتر تشبیہ نہیں دی جاسکتی کہ تمام گلستان

پرستی کا عالم طاری ہے یا سواری کی آہستہ خرامی کو اس سے زیادہ بہتر طریقہ سے ادا نہیں کیا جا سکتا

غرض اس طرح سے سواری چلی کہے تو کہ باد بہاری چلی

یا چاندنی کی تشبیہ دریائے سیماب سے دینا نہایت قابل تحسین ہے۔

عجب لطف تھا سیر مہتاب کا کہے تو کہ دریا تھا سیماب کا

درختوں کے ایک دوسرے سے ملنے کو میر حسن یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

تھے اک طرف گنجان باہم درخت کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت

نہانے کے بعد انسان کی صورت اور بدن صاف ہو جاتا ہے، اسکی صفائی کی تشبیہ یوں دیگئی ہے۔

نہانے سے نکلا عجب اس کا روپ نکل آئے بدلی سے جسطرح دھوپ

ایک اور جگہ میر حسن تشبیہ سے حیرت کی تصویریں یوں کھینچتے ہیں۔

کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

میر حسن واقعی زبان کے بادشاہ تھے، وہ اپنے خیالات نہایت شستہ اور صاف زبان میں ادا کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے ان کو اس بات کا ملکہ ہے کہ جس شخص کی زبان کا چربہ اتارنا چاہتے ہیں نہایت کامیابی کے ساتھ اتار سکتے ہیں۔ مثلاً اگر نسائی زبان میں لکھنا چاہتے ہیں تو ان کی زبان، ان کے محاورات، اور اُن کی استعمال نہایت عمدہ طور پر اپنے اشعار میں باندھ دینگے۔ یا اگر کسی نیچے درجہ کے آدمی کی زبان کا استعمال اپنے اشعار میں چاہیں تو اس کو نہایت خوبی سے استعمال کرینگے۔ یا اگر کسی جوگی یا پنڈت کی زبان سے اپنے خیالات ادا کرنا چاہتے ہیں تو اُسی کے انداز میں نہایت عمدگی سے ادا کریں گے۔

عورتوں کی توہمات پرستی مشہور ہے، جس وقت بے نظیر درختوں کی آڑ میں چھپ گیا تو بدر منیر کی خواصوں میں دو چار جو وہاں موجود تھیں اُنھوں نے اس کو دیکھا اور اُن کے دماغ میں عجیب عجیب خیالات آئے جس کا اظہار میر حسن نے اِن اشعار میں کیا ہے:۔

کسی نے کہا کچھ نہ کچھ ہے بلا" کسی نے کہا "چاند ہے یاں چھپا"
کسی نے کہا "ہے پری یا کہ جن" کسی نے کہا "ہے قیامت کا دن"
لگی کہنے ماما کوئی اپنا کوٹ "ستارا پڑا ہے فلک پر سے ٹوٹ"
کسی نے کہا "دیکھیو اسے لوا!" کھڑا ہے کوئی صاف یہ مردوا"
کسی نے کہا "، تو دلدار ہے کسی نے کہا "کچھ یہ اسرار ہے"

اس موقعہ پر میر حسن نے اِن تمام خیالات کو جو عورتوں کے دماغ میں ایسے وقت آسکتے تھے نہایت خوبی کے ساتھ اُنہی کی زبان میں ادا کیا ہے۔ اسی طرح بدرِ منیر کا بے نظیر کو دیکھکر کہنا:۔

یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں

نظم کیا ہے۔ علاوہ اس کے میر حسن نے جس خوبی سے بہت سی جگہ عورتوں کی کہاوتوں کو اپنے اشعار میں باندھا ہے وہ اس مثال سے واضح ہو سکتی ہے ۔

مری سمت ٹک دیکھ تو ہائے ہائے مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے

عورتوں کی زبانِ رشک کو جس خوبی سے انھوں نے نبھایا ہے وہ ان اشعار سے ظاہر ہے:۔

مرو تم پری پر وہ تم پر مرے بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے
میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں
عبث تم سے دل کو لگاوے کوئی بھلے چنگے جی کو جلاوے کوئی

یا

یہ اُڑتی سی اس کی خبر سُن پری کہا "دیکھے پاؤں اسکو ذری"
تو کھا جاؤں کچا اسے موت ہو "لگی ہے مری اب تو وہ سوت ہو"

ذری کا لفظ قابلِ غور ہے، یہ لفظ آج بھی لکھنؤ کی عورتوں میں مستعمل ہے، اسی طرح کچا کھا جاؤں کا محاورہ بھی ہماری عورتیں اکثر بولتی ہیں۔ الغرض میر حسن نے اپنی مثنوی میں اس بات کا خاص طور پر خیال کیا ہے کہ جو بات کہی جائے وہ روزمرہ اور محاورہ کے مطابق ہو اور جس قدر سادے الفاظ میں خیالات کا اظہار کیا جا سکے، کیا جائے۔

میر حسن کا زمانہ وہ تھا جو آجکل کی سی لامذہبیت سے کوسوں دُور تھا۔ ہر مسلمان راسخ العقیدہ ہوتا تھا اور اسی طرح میر حسن بھی اپنے مذہب کے پکے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی اس مثنوی میں مذہبی رنگ کی جھلک کہیں کہیں بالکل صاف نمایاں ہے۔ مسلمانوں کا یہ عام عقیدہ ہے کہ انسان پر خواہ کتنی ہی مصیبت کیوں نہ پڑے لیکن خدائے تعالیٰ سے کبھی امید منقطع نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کو اپنے بندوں پر فضل و کرم کرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چنانچہ یہی خیال انھوں نے اپنے اِس شعر میں ظاہر کیا ہے۔

نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو کہ قرآں میں آیا ہے لاتقنطو

یہ خیال کہ جو قسمت میں ہوتا ہے اُس کا پُورا ہونا لازمی ہے۔ انسان کی تدابیر بھی قضا و قدر

کے مقابلہ میں کچھ کارگر نہیں ہوتیں۔

سخن مولوی کا یہ سچ ہے قدیم — کہ آگے قضا کے ہو احمق حکیم

فلسفۂ ہستی کا مطالعہ ہر انسان کے لئے ضروری ہے، اور میر حسن نے اس کا مطالعہ بہت کافی کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی نام ہے راحت و رنج کے مجموعہ کا۔ ان کے نزدیک زندگی میں رنج وغم اور عیش وراحت برابر وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کا اظہار اس طریقہ پر کرتے ہیں۔

ہوئی کچھ خوشی شہ کو اور کچھ الم — کہ دنیا میں توام ہیں شادی وغم

میر حسن اس راز سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ ہر چیز کا تعلق دل کی خوشی سے ہے اور جب دل آماجگاہِ رنج والم ہو تو اچھی خاصی زندگی تلخ ہو جاتی ہے لہذا وہ کہتے ہیں :۔

سبب یہ کہ دل سے تعلق ہے سب — نہ ہو دل تو پھر بات بھی ہے غضب

گیا ہو جو اپنا ہی جیوڑا نکل — کہاں کی رُباعی کہاں کی غزل

مثنوی سحر البیان کے مصنف نے اس بات کا خوب مشاہدہ کیا ہے کہ جب بچھڑے ہوئے دو آدمی ایک جگہ مل جاتے ہیں تو وہ اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ نیند کوسوں بھاگ جاتی ہے اور یہ عام طور پر دیکھنے میں آیا بھی ہے کہ جب کوئی پرانا دوست مل جاتا ہے جس سے مدت سے ملاقات نہ ہوئی ہو تو اس کی باتوں میں کسی بات کی بھی سدھ بدھ نہیں رہتی حتی کہ نیند بھی خواب وخیال ہو جاتی ہے۔ اپنے اس تجربہ کو میر حسن یوں ظاہر کرتے ہیں :۔

جو ملتے ہیں بچھڑے ہوئے ایک جا — انھیں نیند باتوں میں آتی ہے کیا؟

میر حسن ایک سچے مسلمان کی طرح دنیا کی ہر چیز کو فانی سمجھتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

یہاں موت ہے اہلِ عرفان کو — کہ جانا ہے اک دن یونہی جان کو

جیسا کہ ہم شروع میں لکھ آئے ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میر حسن نے اپنی مثنوی میں وہ الفاظ استعمال نہیں کئے جو اب متروک ہو گئے۔ خیر میر حسن کو تو مثنوی لکھے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا ہے لیکن خود شوق اور نسیم کے یہاں بھی بعض ایسے الفاظ ہیں جو آجکل استعمال نہیں کئے جاتے مگر اس میں کوئی قصور میر حسن کا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ زبان کچھ عرصہ کے بعد بدل جاتی ہے لہذا بہت سے الفاظ متروک ہو جاتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جن الفاظ کو آج ہم نہایت فصیح سمجھکر بولتے ہیں ان میں سے اکثر سو سال بعد متروک نہ ہو جائیں گے۔ یہ باتیں زبان کے تدریجی ارتقا کے ساتھ وابستہ ہیں

پس ایسے الفاظ میں جو اب متروک ہوگئے ہیں ہم کسی مصنف یا شاعر کو خطاوار نہیں ٹھہرا سکتے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ بعض متروک الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو کانوں کو ناگوار گزرتے ہیں مثلاً میر کی زبان میں اور موجودہ زبان میں بہت زیادہ فرق ہوگیا ہے۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا احساس کم ہوتا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ میر حسن کی مثنوی میں ایسے الفاظ بہت ہی کم محسوس ہوتے ہیں

وہ آنکھیں کہ کرتی تھیں جیدھر نگاہ — اودھر "غش" میں آتے تھے سب بھول و کاہ

بس اب کچھ خوشی کی کرو گفتگو — خدا پھر نہ تم کو رولاے "کبھو"

کنیزان مہ رُو کی "ہر طرف" ریل — چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل

کچھ آئی جو اس مہ کے جی میں ترنگ — کہا آج کوٹھے پہ "بچھے" پلنگ

کہا ماہرخ نے کہ تھے تیرے بخت — کہ بخشا تجھے میں سلیماں کا تخت

مندرجہ بالا اشعار میں خط کشیدہ الفاظ آجکل متروک ہیں۔ ہم نے یہ مثالیں اس لئے دی ہیں تاکہ میر حسن کے زمانہ کی زبان اور آجکل کی زبان میں جو فرق ہے اس کا آسانی سے پتہ چل سکے۔

یہاں پر مثنوی سحرالبیان کے بعض نقائص کو نظرانداز کرنا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ مغربی اُصولِ تنقید کے مطابق ناقد کا فرض ہی ہے کہ مدح وستائش بھی کرے اور عیوب شماری بھی۔ لہذا اس فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے ہم کو سحرالبیان کے تاریک پہلو پر بھی نظر کرنی ہوگی۔

شعرا کے یہاں عام طور پر مبالغہ کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک وہی شعر اچھا ہے جس میں مبالغہ زیادہ ہو، مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ بیشک ایک زمانہ تھا جب کہ شاعروں کو زیادہ مبالغہ کرنے سے فائدہ پہونچتا تھا کیونکہ درباری شعرا جو قصیدہ بادشاہ کی شان میں لکھتے تھے اس میں انعام حاصل کرنے کے خیال سے ضرورت سے زیادہ اس بادشاہ کی تعریف کی جاتی تھی۔ بادشاہ بھی اس شعر کو زیادہ پسند کرتے تھے جس میں اُن کی تعریف زیادہ ہوتی تھی اور اسی شاعر کو انعام و اکرام سے مالامال کرتے تھے جو اُن کی تعریف حد سے زیادہ کرتا تھا۔ الغرض ان کی تعریف جھوٹ اور غلو پر مبنی ہوتی تھی۔ ان قصائد میں تمام باتیں جھوٹی ہوتی تھیں۔ صرف دو چار ایسی باتیں ہوتی تھیں جو صحیح ہوتیں اور باقی تمام از سرتاپا غلط۔ مگر اب وہ زمانہ ختم ہوگیا ہے کیونکہ اب نہ وہ بادشاہ ہیں اور نہ کوئی قصیدے لکھتا ہے۔ اس کے علاوہ طبائع بھی اب پہلے سے بدل گئی ہیں، جھوٹ اور غلو کو اب کوئی پسند نہیں کرتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جھوٹ اور مبالغہ سے شعر کی تاثیر قطعاً جاتی رہتی ہے۔ قصہ لکھنے میں تو اس بات کی حتی المقدور کوشش کرنی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو

چھوٹی اور غیر ممکن باتوں سے احتراز کیا جائے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ پڑھتے وقت یہ معلوم ہو کہ یہ واقعہ ہے۔ لیکن میرحسن نے بعض جگہ دوسرے شعرا کی طرح بہت کافی مبالغہ سے کام لیا ہے۔ قلعہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

کہوں قلعہ کی اس کے میں کیا شکوہ　　گئے دب بلندی کو دیکھ اسکی کوہ

جو بات میرحسن نے اس شعر میں بیان کی ہے وہ نہ صرف بعید از قیاس ہے بلکہ قطعاً غیر ممکن ہے۔ قلعہ خواہ کتنا ہی مرتفع اور شاندار کیوں نہ ہو یہ ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتا کہ پہاڑ سے زیادہ بلند ہوگا۔ انھیں باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کوئی قلعہ نہیں تھا بلکہ محض گھڑی ہوئی بات ہے۔

رہے واں کے حجروں کا جو در کھلا　　تو دنیا کے باجوں کی آئے صدا

وگر بند کر دیجئے ایک بار　　تو جوں ارغنوں ساز نکلیں ہزار

یہ دونوں اشعار بھی پہلے شعر کی طرح مبالغہ سے پُر ہیں۔ یہ تو ممکن بھی ہے کہ حجروں کے در کھولنے پر کہیں اور سے باجے کے بجنے کی آواز آجائے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ دروازہ بند کرنے پر کیونکر ہزارہا قسم کے راگ اس میں سے نکل آئیں گے۔

شرابوں کے شیشے چُنے طاق میں　　گزک وہ کہ نکلے نہ آفاق میں

اس شعر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر گزک ایسی تھی کہ آفاق میں نہیں مل سکتی تو آخر وہاں کیسے موجود تھی۔ لیکن ہم ایسے مبالغہ کو جائز سمجھتے ہیں کیونکہ مبالغہ محاورہ کا جز ہے۔ ہم عام طور پر گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں چیز دنیا میں نہیں مل سکتی یا اس قسم کی اور بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں جن میں بظاہر مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن روزمرہ اور محاورہ کے اعتبار سے انکا استعمال جائز ہے۔ داغ کے اس شعر میں بظاہر مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن عام طور پر یونہی بولا جاتا ہے اور شاعر زبان کی شستگی کے خیال سے یہاں پر یہ محاورہ استعمال کرنے پر مجبور تھا۔

گیا تھا کہکے اب آتا ہوں قاصد کو تو موت آئی　　دلِ بیتاب واں جا کر کہیں تو بھی نہ مر رہتا

میرحسن کسی لڑکی کے رخساروں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

وہ رخسارِ نازک کہ ہوجائے لال　　اگر اس پہ بوسہ کا گزرے خیال

شاعر تعریف تو کر گیا لیکن اس کو یہ خیال نہ رہا کہ یہ قطعاً ناممکن ہے۔ محض اس خیال سے رخسار کا سُرخ ہوجانا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اسی طرح یہ دو شعر بھی حد درجہ مبالغہ کی مثال ہیں:۔

وہ کھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے | وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے
اس اندھیر کو کیا لکھوں اب میں آہ | قلم کے نکلتے ہیں آنسو سیاہ

گو میر حسن نے بعض بعض مقام پر حد سے زیادہ مبالغہ کیا ہے لیکن وہ اس زمانہ کی روش سے مجبور تھے تاہم ان کے مبالغہ سے مثنوی کی فضیلت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ان کی مثنوی سحر البیان میں سب سے زیادہ قابل اعتراض چیز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی مثنوی میں ایک باب ایسا بھی داخل کر دیا ہے جو بہت رکیک اور مبتذل ہے چنانچہ ایسے ہی ابواب پڑھکر مثنوی سے نفرت ہوجاتی ہے۔ مگر ایک لحاظ سے وہ اس باب کو شامل کرنے پر مجبور تھے، تاہم آجکل اس باب کے اشعار پڑھتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔

ایک نوجوان تنقید نگار نے جنھوں نے سحر البیان کے اس پہلو پر کافی غور کیا ہے میر حسن کی اس لغزش کو بہت کچھ قابل تحسین بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر سحر البیان کے اس باب کو نکالدیا جائے تو اس کی اہمیت بہت کم ہوجاتی، بلکہ اس کا اصلی منشا ہی فوت ہوجاتا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سحر البیان کے اس باب کو داخل نہ کیا جاتا تو کیونکر تمام مثنوی کا اصل منشاء فوت ہوجاتا

بہرحال میر حسن کی مثنوی اپنے زمانہ کے رسوم و توہمات کا آئینہ ہے، وہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ جب عیش وطرب کی اُمنگیں گرم خون کی طرح ہر فرد کی رگوں میں دوڑتی پھرتی تھیں"۔ لیکن عیش وطرب کی اُمنگیں کسی زمانہ کے لئے مخصوص نہیں۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جب انسان نے عیش وطرب کو چھوڑ کر رنج وتعب خوشی سے قبول کرلیا ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ ضروریات کے احساس نے کرب وبلا جھیلنے کے لئے انسان کو مجبور کر دیا ہو اور چار و ناچار وہ اس کے لئے مستعد ہوگیا ہو۔ آج بھی ہماری طبائع عیش وعشرت کو پسند کرتی ہیں اور ہم یہی چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو اپنی زندگی نہایت آرام سے گزاریں۔

بہرحال میر حسن کی مثنوی کا یہ پہلو بہت رکیک ہے، اصل میں اس قدر تفصیل میں جانے کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ مثنوی میں کہیں کہیں دو چار شعر اور بھی ایسے ملتے ہیں جو بہت عُریاں ہوگئے ہیں۔ مثلاً:۔

نکیلی وہ اُٹھی ہوئی چھاتیاں ....

ان اشعار کو عورتوں کے پڑھنے کا کیا ذکر خود مردوں کو ان کے پڑھنے سے عار ہوگا۔ اور آجکل جب تعلیم نسواں کا اس قدر چرچا ہے اور لڑکیوں کو پڑھنے کا شوق پیدا ہو رہا ہے اس قسم کے اشعار کی

اشاعت کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ مثنوی اُن مثنویوں کے مقابلہ میں جو شوق نے بعد کو لکھی ہیں نسبتاً کم رکیک ہے۔ لیکن شوق کی مثنویاں خلاف تہذیب ہونے کے باوجود روزمرہ اور محاورہ کی صفائی، ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی کے اعتبار سے نہایت عمدہ ہیں۔ بہر نوع سحر البیان میں اگر ایک باب کسی قدر رکیک ہے تو یہ اس کی دوسری خوبیوں کو روپوش نہیں کر سکتا۔ اس باب کو نکال دیا جائے تو باقی ماندہ مثنوی نہایت قابل قدر اور لاثانی ہے۔

اِس مثنوی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے لئے میر حسن نے وہ بحر انتخاب کی ہے جسمیں اکثر مثنویاں لکھی گئی ہیں اور جس میں موسیقی کے زیر و بم کا پورا پورا احساس ہے اور گلزار نسیم کی بحر میں کوئی موسیقیت نہیں ہے۔

جذبات اثر

(خانصاحب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی، بی۔ اے)

درد فراق کہنے کے قابل نہیں رہا
اِک دشنۂ زخم ریز ہے اب دل نہیں رہا

اے ذوق ہرزہ کوش ترا دھیان ہے کدھر
لیلےٰ کہاں جو پردۂ محمل نہیں رہا

میں اور تجھ سے عرضِ تمنا، نہیں نہیں
مدت ہوئی وہ نشۂ باطل نہیں رہا

اے وہم غیر تو نے ستم کیا کیا کہ میں
خود اپنے اعتبار کے قابل نہیں رہا

سو انقلاب ہو گئے دنیائے عشق میں
وہ گوشۂ نگاہ جو مائل نہیں رہا

تو سر بسر جمال، تو آئینۂ جمال
کیا ہے اگر نظر کے مقابل نہیں رہا

اپنا کنار آپ ہوں گرداب کی طرح
میرے محیطِ شوق کا ساحل نہیں رہا

محشر میں جذبِ عشق کی معجز نمائیاں
آلودہ خوں سے دامنِ قاتل نہیں رہا

جب تک سنائے مژدہ غریبوں کو ناخدا
دھندلا سا ایک نقش تھا ساحل نہیں رہا

اے دل غریب دل مِرے حسرت نصیب دل
کچھ خونِ آرزو کا بھی حاصل نہیں رہا

تڑپائے گا تجھے بھی خدارا نہ اب ستا
دل اپنے اضطراب کی منزل نہیں رہا

ہمت نے راہ ترک طلب اختیار کی
جب اور کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

آغوشِ جلوہ باز ہے اُس کے لئے اثر
اپنی صفائے دل سے جو غافل نہیں رہا

عالمپور میں

(از مولانا شاہد صدیقی اکبرآبادی)

یہ ہوائیں، یہ فضائیں، یہ مناظر، یہ زمیں،
ہر طرف اک حیرت افزا بیخودی چھائی ہوئی
بہہ رہی ہے ایک ندی پیچ و خم کھاتی ہوئی
تیز رو ندی کی موجیں دے رہی ہیں اک پیام
دور تک ہے اک سہانی روشنی پھیلی ہوئی
اک طرف ویراں کھنڈر ہیں نوحہ خوانِ زندگی
ایک جانب کچھ منادر اپنی عظمت کے گواہ
دیکھ اے ناداں! کیوں گردابِ مدہوشی میں ہے
درمیاں میں اک بزرگِ باکرامت کا مزار
کہہ رہا ہے داستانِ اتحادِ اولیں
اپنی آنکھوں سے مذاہب کی محبت دیکھ لے
اِس جگہ انسانیت کی روح محوِ خواب ہے
اس جگہ ملتی ہے تعلیم خلوص و اتفاق
اِس جگہ ہے آسمانی دیوتاؤں کا گزر
اِس جگہ اک مردِ کامل اک ولیِ پارسا
درسگاہِ ارتباطِ ہندو و مسلم ہے یہ

آئے اور آکر محبت سیکھ لے کوئی حسیں
سازہائے زندگی پر خامشی چھائی ہوئی
غافلوں کو زندگی کا راز سمجھاتی ہوئی
اور ساحل سے کچھ و کر رہے ہیں کچھ کلام
ہے زمیں پر آسمانی روشنی پھیلی ہوئی
اک طرف آباد کوچے داستانِ زندگی
جنکی حالت دیکھکر حیرت میں پڑجائے نگاہ
عہدِ ماضی کا فسانہ ان کی خاموشی میں ہے
دورِ موجودہ کی عقل آرائیوں پر اشکبار
جس کا اس دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں
دیکھ لے ناداں! آثارِ قدامت دیکھ لے
یاں جو ذرہ ہے کتابِ عاشقی کا باب ہے
جس کو پاکر بھول جانا چاہیئے درسِ نفاق
جن کی عظمت تک نہیں پہنچی ہے انسانی نظر
سو رہا ہے بے نیازِ کشمکش ہائے فنا
یعنی دنیائے نشاطِ ہندو و مسلم ہے یہ

زندگی پیدا ہوئی شاہد دلِ رنجور میں
اک عجب عالم نظر آیا ہے عالمپور میں

اُردو اور ہندی

ایک اہم تجویز

(مسٹر حامد اللہ افسر. بی. اے)

اب سے چار پانچ سال پہلے میں نے ایک تجویز الہ آباد کے مشہور انگریزی روزانہ اخبار "لیڈر" میں شائع کی تھی جس کا مقصد اُردو ہندی کے قضیہ کو ہمیشہ کے لئے طے کر دینا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ صوبہ متحدہ کے ہائی اسکولوں کے امتحان میں اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کو لازمی قرار دیدینا چاہئے۔ اس وقت ہندوستانی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کی تعلیم ہائی اسکول کے امتحان میں لازمی ہے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ یو پی کے باشندوں کے لئے اُردو اور ہندی دونوں زبانیں لازم رہیں اور ان کی تعلیم کا معیار یہی رہے جو اس وقت ہائی اسکول کی جماعتوں میں اُردو اور ہندی کا ہے۔

اس تجویز پر ایک مدت تک اخبار مذکور میں بحث جاری رہی موافقت میں بھی مضامین شائع ہوئے اور مخالفت میں بھی، خود "لیڈر" نے ایک اڈیٹوریل نوٹ میں اس تجویز پر بہت ہمدردانہ لہجہ میں اظہار خیال کیا، لیکن جیسا کہ ہمارے سب کام ہوتے ہیں کچھ عرصہ تک جوش رہتا ہے پھر ٹھنڈا ہو جاتا ہے وہی حال اس تجویز کا ہوا۔

اس عرصہ میں مجھے تجویز مذکور پر مختلف پہلوؤں سے غور کرنے کا موقع ملا اور میں نے اپنے خیال میں اس کو ہر طرح نہایت مفید پایا۔ جب سے ہماری مادری زبان کو ہمارے مدرسوں میں تعلیم کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے مختلف مضامین پڑھانے والے ماسٹروں کو ایک بڑی دقت یہ آپڑتی ہے کہ اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لئے جب وہ سیاہ تختہ کو استعمال کرتے ہیں تو ان کے لئے اس امر کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جو کچھ انھیں لکھنا ہے وہ کس زبان کے حروف میں لکھیں جماعت کے طلباء میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو صرف اُردو جانتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو صرف ہندی جانتے ہیں۔ اگر ٹیچر سیاہ تختہ پر اُردو میں لکھتا ہے تو ہندی جاننے والے لڑکے نہ سمجھ سکیں گے۔ اور اگر ہندی میں لکھتا ہے تو اُردو جاننے والے محروم رہیں گے۔

اصل میں اسی مشکل کو حل کرنے کے لئے اس تجویز کا خیال پیدا ہوا۔ اگر ہندی اور اُردو دونوں کو مساوی معیار پر لازمی قرار دیدیا جائے گا تو پھر ٹیچر کو آزادی ہوگی کہ وہ جس رسم خط میں چاہے سیاہ تختہ پر اپنا مطلب واضح کرے، دوسری زبان کی حیثیت سے اب بھی اُردو اور ہندی دونوں زبانیں ثانوی جماعتوں میں پڑھائی جاتی ہیں لیکن اُن کا پڑھانا نہ پڑھانا برابر ہے، نہ ماسٹر ہی اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہ طلباء۔

ہائی اسکول کی جماعتوں تک اُردو اور ہندی دونوں کو مساوی معیار پر لازمی قرار دینے کا سب سے اہم فائدہ یہ ہوگا کہ طلبا کو ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے دونوں زبانوں میں اچھا خاصا دخل ہو جائے گا، اور جب وہ اسکول اور کالج کے حدود سے نکل کر بہ حیثیت ایک شہری کے زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہوں گے تو ہندوؤں کو اُردو سے اور مسلمانوں کو ہندی سے نفرت نہ ہوگی، جیسا کہ بہ استثنائے چند اس وقت ہے، کیونکہ ہندو اور مسلمان سبھی دونوں زبانوں سے واقف ہوں گے۔

اس وقت ہندی زبان ایک بڑی حد تک ہندوؤں کی مذہبی، معاشرتی اور تمدنی روایات کی سرمایہ دار ہے اور اُردو زبان زیادہ تر اسلامی روایات سے لبریز ہے۔ دونوں زبانوں کے لازمی قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان حضرات ہندوؤں کے روایات اُن کے معتقدات اور اُن کے رسم ورواج سے آگاہ ہو جائیں گے اور ہندو اصحاب مسلمانوں کی روایات اُن کے معتقدات اور اُن کے رسم ورواج سے واقفیت حاصل کر سکیں گے، اور یہ آگاہی اور واقفیت دونوں فرقوں میں اتحاد واتفاق پیدا کرنے کا بڑا اچھا ذریعہ ہوگی۔

اس وقت ہمارے صوبہ میں دو زبانیں رائج ہیں ایک اُردو اور دوسری ہندی، اُردو کے بہی خواہ اس کوشش میں ہیں کہ اُردو کاروباری زندگی، سیاسیات، تمدنی اور معاشرتی ضروریات میں ہندی سے بازی لے جائے اور ہندی کے خیر طلب یہ چاہتے ہیں کہ اگر بس چل سکے تو اُردو کو نیست و نابود ہی کر دیں تاکہ زندگی کے کسی شعبہ میں اس کا نام ونشان نہ رہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک معتدل گروہ ایسا بھی ہے جو دونوں زبانوں کو ایک زبان بنا دینے کیلئے سرگرم کار ہے، لیکن یہ سب کوششیں فضول اور بیکار ہیں، نہ اُردو کے بہی خواہ ہندی کو نیست و نابود کر سکتے ہیں اور نہ ہندی کے پرستار اُردو کو مٹا سکتے ہیں اور نہ دونوں زبانیں ایک ہو سکتی ہیں۔ اُردو نے بہ حیثیت ایک مستقل زبان کے بہت کافی ترقی کر لی ہے۔ اسیطرح ہندی نے بھی بحیثیت

ب جداگانہ زبان کے جڑ پکڑ لی ہے، دونوں کے راستے بالکل جدا جدا ہیں اور دونوں کا ادب
برترقی کر رہا ہے، گویا ہمارے صوبہ کی دو مستقل زبانیں ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دو مختلف
روہوں میں تقسیم ہو گئے جو ایک دوسرے سے برابر دور ہٹتے جاتے ہیں۔ اور اتحاد و اتفاق کے
ب بڑے مضبوط ذریعہ سے ہم محروم ہیں۔

اگر ہمارے صوبہ کے تمام تعلیم یافتہ حضرات اُردو اور ہندی دونوں زبانوں سے آگاہ ہو جائیں
یسا کہ اس تجویز کا مقصد ہے تو اس سے ایک اہم فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی میں
ایک خلیج پیدا ہو گئی ہے وہ دور ہو جائیگی اور ہم ایکدوسرے کی صحبت سے محظوظ ہو سکیں گے، دوسرا
ئدہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ ہمارے صوبہ میں صرف ایک زبان رہ جائیگی۔ اسلئے کہ جب ہم دونوں زبانوں سے
گاہ ہونگے تو ہم تحریر و تقریر میں قدرتی طور پر وہ زبان استعمال کریں گے جو شائستہ تر ہے، جسمیں مفہوم
یادہ وضاحت کیساتھ اور زیادہ خوبصورتی سے ادا ہو سکتا ہے جو تہذیب یافتہ سوسائٹی کی ضروریات
بکماحقہٗ پورا کر سکتی ہے جسکے الفاظ میں ایک قسم کا وقار ہے، متانت، سنجیدگی، پاکیزہ شوخی اور لطیف ظرافت ہے،
ظاہر ہے کہ ابھی دونوں زبانیں (اُردو اور ہندی) محتاج ترقی ہیں اسوقت ہم سب یکجہتی کیساتھ
میں سے کسی ایک زبان کو ترقی دینے کیلئے تیار نہیں ہیں، لیکن جسوقت ہمارے صوبہ کے باشندوں کی
ثیر تعداد دونوں میں سے کسی ایک زبان کو کاروباری اور معاشرتی ضروریات کے لئے منتخب کریگی تو اس
تخب شدہ زبان میں جو خامیاں ہیں اُنکی بھی آسانی سے اصلاح ہو جائیگی۔ اور اسطرح رفتہ رفتہ تقریبًا
پچاس سال کے اندر ہمارے صوبہ میں صرف ایک زبان رہ جائیگی، اور وہی زبان بہترین زبان
ہوگی کیونکہ وہ کسی بیرونی کوشش یا مصنوعی ذریعہ سے ہم پر مسلط نہیں کیجائیگی بلکہ ہم خود
سکو منتخب کرنے پر مجبور ہونگے اس لئے وہی قدرتی طور پر ہماری مادری زبان ہوگی۔

نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہندی ہوگی یا اُردو جس طرح میرے نزدیک وہ زبان اُردو ہی ہو سکتی
ہے جس کو ہمارا صوبہ منتخب کریگا اسی طرح ممکن ہے آپ کو یہ یقین ہو کہ وہ زبان ہندی کے سوا اور
وئی نہیں ہو سکتی، دونوں میں سے کونسی زبان منتخب کیجائیگی اس کا فیصلہ زمانہ کرے گا۔

یہی منزل جس پر تیز روی کے اس دور میں اپنی تجویز کے ذریعہ میں پچاس سال کے اندر پہنچنا چاہتا
وں بالآخر ہمارے صوبہ کے ہر راہرو کی نظر میں ہوگی، کیونکہ زبان کا مسئلہ کسی مصنوعی ذریعہ کا محتاج نہیں
ہوتا بلکہ زبانوں کی ترقی اور ترویج قطعًا فطری ہوتی ہے، ہو نہیں سکتا کہ کسی زمانہ میں ہمارے سارے صوبہ کی
یک ہی زبان ہو جائے یہ دوسری بات ہے کہ وہ زمانہ دو صدی میں آئے یا چار صدی میں۔

اب ایک نظر ہمیں ان مشکلات پر بھی ڈال لینی چاہئے جو اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں سدراہ ہونگی، "لیڈر" میں جسقدر اعتراضات میری اس تجویز پر ہوئے تھے انمیں میں سے کوئی ایک اعتراض بھی تجویز کے معقول اور مناسب ہونے پر نہ تھا بلکہ ہر معترض نے اسکو چند در چند وجوہ سے ناقابل عمل قرار دیا تھا، جہانتک مجھے یاد ہے تمام اعتراضات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسوقت جبکہ ہائی اسکول تک ہمارے تعلیمی نصاب میں لازمی اور اختیاری مضامین کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے ایک اور مضمون کا نصاب تعلیم میں اضافہ کر دینا مناسب نہ ہوگا، اس طرح طلبا پر ناقابل برداشت بار ہو جائے گا۔

یہ اعتراض ایک حدتک صحیح ہے لیکن اس اعتراض نے جس مشکل کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس سے گھبرا کر ہم ایک ایسی تجویز کو ترک کرنے پر کیوں مجبور ہو جائیں جس سے صدہا فائدے یقینی طور پر رونما ہونگے۔

بے شک اسوقت ہمارے نصاب تعلیم میں مضامین کی تعداد بہت ہے لیکن اگر نصاب تعلیم پر ایک غائر نظر ڈالی جائے تو ہم اس بار کو ہلکا کر سکتے ہیں، مثلاً میرے نزدیک ہائی اسکول میں ریاضی کا نصاب اسوقت ضرورت سے زیادہ ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ جو طلبا انجینیرنگ وغیرہ میں جانا چاہتے ہیں اُن کے لئے موجودہ نصاب ضروری ہے اس مشکل کا حل اسطرح ہو سکتا ہے کہ ریاضی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

۱۔ ریاضی

۲۔ مزید ریاضی

میتھمٹیکس (ریاضی) لازمی مضمون قرار دیدیا جائے اور ہایر میتھمٹیکس (مزید ریاضی) اختیاری مضمون ہو، جو طلبا خاص طور پر ریاضی سے ذوق رکھتے ہو یا جنکو کسی مخصوص پیشہ کیلئے ریاضی کی ضرورت ہو وہ ہایر میتھمٹیکس کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، اسی طرح میرے نزدیک تاریخ اور جغرافیہ کے نصاب کو بھی ہلکا کیا جا سکتا ہے۔

پھر جب اُردو اور ہندی دونوں زبانیں لازمی قرار دی جائینگی تو وہ ہائی اسکول کی جماعتوں میں پہنچکر اک دم تو لازمی نہیں کر دی جائیں گی بلکہ ابتدائی جماعتوں سے دونوں زبانیں لازمی ہونگی، اسلئے ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے طلبا کیلئے دونوں زبانیں کافی آسان ہو جائیں گی۔

بہرطور میرے نزدیک یہ تجویز ہر حیثیت سے ہمارے صوبہ کیلئے نہایت مفید تجویز ہے، میں خصوصاً اپنے صوبہ کے ماہرین تعلیم سے اور عموماً تمام صاحبان غور و فکر سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس تجویز پر غور فرمائیں اور اگر یہ قابل عمل ہو تو ارکین ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ بورڈ میں سے کوئی صاحب اس تجویز کو بورڈ میں پیش فرما دیں،

محبّت کی پہلی شکست

(از جناب فطرت واسطی)

عہدِ طفلی! تیری باتیں مجھکو کچھ کچھ یاد ہیں — تیری دُنیا کے فرشتے کس قدر آزاد ہیں
بیخبر یکسر تھا میں پابندیوں سے دہر کی — کمسنی میں ہوتی ہے اُف کس بلا کی سادگی
تیری رخصت کا زمانہ وقتِ فکر و غور تھا — ارتقائے ذہنیت میں کشمکش کا دَور تھا
اب دماغ و دل کی قوت بھی ترقی یاب تھی — اب نمایش گاہِ عالم، محفلِ اسباب تھی
اب تو محسوسات میں بجلی کی رَو آنے لگی — دہر کی ہر چیز پر غائر نظر جانے لگی
رفتہ رفتہ خود مجھے محسوس یہ ہونے لگا — رہنمائے دل ہوں میں، یا دل تھا میرا رہنما
سیرِ گلشن میں نئی لذت مجھے آنے لگی — خود بخود غنچوں کی جانب اب نظر جانے لگی

سَیر کو اِک بار اپنے گھر سے نکلا شام کو — تھا میں آہستہ خراماں، جلوہ گاہِ عام کو
اِک حسیں خاتون کو دیکھا کنارِ جوئبار — اُسکا وقتی مشغلہ تھا، موجِ دریا کی شمار
اُس کے جلووں کا تماشا، منظرِ امید تھا — دل کی دنیا پر فروزاں حُسن کا خورشید تھا
حُسن کی سادہ شعاعوں میں جوانی کا نکھار — مایۂ حُسنِ دو عالم، صد گلستاں درکنار
دعوتِ نظارہ دیکر، ہوگئی محوِ حجاب — ایک ادائے پرسکوں جو بنگئی صد اضطراب
یا مری بے ساختہ نظروں سے وہ شرما گئی — یا اداؤں سے وہ اپنی آپ ہی گھبرا گئی
بجلیاں لاکھوں تمنّاؤں پہ برسانے لگی — زیرِ لب کچھ مُسکرا کر اِک طرف جانے لگی

بس طلسمِ حُسن پر حیرت زدہ خاموش تھا — میں بقیدِ ہوش تھا اور دل مرا بیہوش تھا
سینۂ لرزاں میں دل تھا، دل میں دردِ مستقل — اشک ریزی کے لئے آنکھیں تھیں میری مشتعل
کچھ نہ سمجھا میں، ذرا بھی کیا سے کیا یہ ہوگیا — جاگ اُٹھے جذبات دل کے، دل مرا کیوں سوگیا
دیکھ چکا ہے دل مرا اب موردِ صد اضطراب — تیری آمد کے کرشمے تھے یہ اے عہدِ شباب

آرزوئیں وہ کہاں ہیں وہ اُمنگیں اب کہاں — منزلوں میں عشق کی، دل ہو مرا بے کارواں
ابتو اتنا یاد ہے اک خواب دیکھا تھا ضرور — ہاں دماغ و دل میں جسکا اب بھی باقی ہے سرور
یاد ہے وہ بازیٔ عشق و محبت کی شکست — یا دلِ ناآشنائے درد کی پہلی شکست
ہوگیا ہے خاتمہ فطرت دلی جذبات کا
نوجوانی کرگئی ہے، خون محسوسات کا

الوداع

(از منشی تلوک چند محروم بی۔اے)

الوداع اے کنارِ آبِ رواں — اے فضائے دیارِ آبِ رواں
اُف! یہ نیرنگیٔ بہارِ شفق! — گل بدامن نگارِ آبِ رواں
اب نہ دیکھے گی چشمِ شوق اپنی — جلوۂ لالہ زارِ آبِ رواں
پھر کہاں ہم، کہاں یہ شامِ وطن — پھر کہاں یہ بہارِ آبِ رواں
طبعِ شاعر کو تھی عزیز بہت — صحبتِ سازگارِ آبِ رواں
تھی دلِ خاکسار کو مرغوب — پستیٔ رہگذارِ آبِ رواں
چمنستاں کو کب ہوا حاصل — منظرِ خوشگوارِ آبِ رواں
ثمر و شاخ نذرِ موج و حباب — سبزہ و گل نثارِ آبِ رواں
اس کو بہلاؤ گے تم اے اشکو! — دل کہ ہے بے قرارِ آبِ رواں
لے چلے ہیں وطن سے ہم محروم
اشکِ غم یادگارِ آبِ رواں

٭ ہمارے دوست محروم صاحب پچھلے سال اپنے سرحدی وطن سے تبدیل ہو کر راولپنڈی تشریف لے آئے ہیں یہ نظم دلنشیں جواب ہوئیہ ناظرین زمانہ ہو رہی ہے ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے روانگی کے وقت قلمبند ہوئی تھی۔

سیّد عبدالوالی عزلت

ابتدائی حالات | ان کا نام سید عبدالوالی اور تخلص عزلت ہے۔ حضرت سید سعداللہ سورتی کے بیٹے ہیں۔ تاریخ پیدائش کسی تذکرے میں درج نہیں، البتہ اُن کے دوسرے حالات سے صرف ایک قیاسی زمانہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی زندگی کے متعلق مختلف تذکروں سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں اُن کی نوعیت اس طرح کی ہے:-

(۱) میر صاحب لکھتے ہیں "تازہ وارد ہندوستان کہ عبارت از شاہجہاں آباد است، شدہ اند، نسبت تمام بہ سخن دارند۔"

(۲) قائم نے لکھا ہے "در عہد سلطنت مرزا احمد بہ دارالخلافت تشریف داشت ....."

(۳) "راقم سطور ہر گاہ کہ بہ حیدر آباد رفت ربط ازاں جناب پیدا کرد، چنانچہ ہر روز بلا ناغہ بخدمت می رسید، و آں جناب ہم اکثر گاہ بہ غریب خانہ قدم رنجہ می فرمودند ...... الحال سلسلۂ ترسیل مراسلات از جانبین گرم است....."

(۴) ....بعد مراجعت سفر بیت اللہ در بندر سورت ملاقات او اتفاق افتاد...... از بندر سورت روانہ شدہ بعد از طے ارض راہ بستم جمادی الاول سنہ (۱۱۶۴ ہجری) آں بلدہ (شاہجہاں آباد) فاخر شدہ تا وقت ہماں جاست" (سرو آزاد)

(۵) "در زمان دولت نواب محمد علی وردی خاں مہابت جنگ مغفور وارد مرشد آباد و مورد مہربانی نواب مذکور گردید و بعد از انتقال نواب بہ دکن رفت"۔ (گلزار ابراہیم)

(۶) "دلی سے مرشد آباد گئے...... نواب (نواب مرشد آباد) کے مرنے کے بعد دکن گئے، اور اورنگ آباد میں بود و باش اختیار کی۔ نواب ناصر جنگ نظام الدولہ بہادر کا زمانہ تھا...... ان کی شہادت کے بعد حیدر آباد گئے....." (گل رعنا)

(۷) "در ایام آصف جاہ نظام الملک بہ خجستہ بنیاد آمدہ . . ." (گلشن گفتار)

عزلت کے متعلق ہمارے پاس صرف یہ سات بیانات ہیں جن سے اُن کی زندگی کے حالات

ہ روشنی پڑتی ہے، اگر ان بیانات کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے ہم کسی نتیجہ پر پہونچنا چاہیں تو وہ
ہو سکتا ہے :-

عزلت ۱۱۶۲ھ میں سورت سے شاہجہاں آباد گئے، نکات الشعرا کی تالیف کے وقت وہ وہیں
جود تھے (۱۱۶۴ ہجری) جب آزاد نے سرو آزاد لکھا اُس وقت بھی اُن کی موجودگی وہیں کی
ئی ہے۔ لیکن مخزن نکات (۱۱۶۸ ہجری) کی تالیف کے وقت وہ دہلی کو چھوڑ چکے تھے۔ جس وقت
زار ابراہیم لکھا گیا (۱۱۹۷ یا ۱۱۹۸ ہجری) اُس وقت وہ مرشد آباد سے دکن آچکے تھے، بلکہ اس سے بہت
لے چمنستان شعرا کی تالیف کے وقت وہ دکن میں موجود تھے۔ جس وقت شفیق نے اُن کے حالات
ے ہیں (۱۱۷۵ ہجری) اُس وقت دونوں میں خط و کتابت ہوتی تھی۔ گل رعنا کے بیان کے مطابق اُن
عمر کا آخری حصہ حیدر آباد میں گذرا، اور شفیق نے یہی لکھا ہے کہ وہ اُن سے حیدر آباد ہی میں جا کر
، اس لئے خیال ہے کہ ۱۱۷۵ہجری میں وہ حیدر آباد ہی میں تھے

ان سب بیانات میں تو ربط پیدا ہو جاتا ہے لیکن گلشن گفتار کا بیان ایسا ہے جو اس سلسلہ
درہم برہم کر دیتا ہے۔ اُس میں ہے کہ آصف جاہ نظام الملک کے زمانہ میں حیدر آباد آئے۔ یہ نہیں
لوم کہ کس سنہ میں لیکن یقین ہے کہ ۱۱۶۰ہجری سے پہلے۔ اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے
وہ دہلی جانے اور علامہ آزاد کو سورت میں ملنے سے پہلے ایک مرتبہ حیدر آباد آچکے تھے

ان سب باتوں کے بعد یہ پتہ لگانا کہ وہ کب پیدا ہوئے کسی قدر دشوار ہے، لیکن ہاں میر
اد۔ فتح علی اور خواجہ حمید نے اُن کا ذکر جیسے لفظوں میں کیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ
ن کی عمر ان تذکروں کے لکھے جانے کے وقت کافی ہوگی۔ میر اور آزاد کا بیان ۱۱۶۵ہجری کا
، اور موخر الذکر تذکرہ نویسوں کا ایک سال بعد کا، لیکن ان میں سے ہر ایک انھیں ادب اور
ترام کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ اس وقت اُن کی عمر تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ سال کی
گی، اس طرح پیدائش ۱۱۳۰ہجری کے قریب ہو سکتی ہے۔ وفات کا سن گل رعنا میں ۲۱۔ رجب ۱۱۸۹ھ

---

۵ مؤلف گل رعنا نے ان کے والد کو سلونی لکھا ہے۔ میں نے چمنستان شعرا، نکات الشعرا، مخزن نکات، گلشن گفتار، گلزار
اہیم، تذکرہ ریختہ گویاں، تحفۃ الشعراء اور سرو آزاد میں دیکھا تو سوائے گردیزی کے سب متفق ہیں کہ وہ سورت کے باشندے
اور اُس نے بھی سلون کا نہیں سورت کا لکھا ہے اور قائم نے نام بجائے سعد اللہ کے عزیز اللہ لکھا ہے۔ سرو آزاد
، سلونی سورتی، لکھا ہے جس کے کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے۔

۵ نکات الشعرا صفحہ ۹۷ ۵ مخزن نکات صفحہ ۹۵

۵ چمنستان شعرا صفحہ ۲۲۶

درج ہے لیکن کوئی حوالہ نہیں۔

علمیت | عزلت کے علم و فضل کا ذکر ہر تذکرہ نویس نے بڑے طمطراق سے کیا ہے:۔

(۱) "فضل و کمال ایشاں از تحریر و تقریر بیرون است"

(۲) "ہیچ احدے از فضلا و علمائی توانست کہ بہ بحث علم تقابل ایشاں دم زند" .. (گلشنِ گفتار)

(۳) "مردے فاضل و عالم" (مخزن نکات)

(۴) "جامع اقسام فضائل است" (تحفۃ الشعراء)

(۵) "در معقولات حیثیتے خوب بہم رسانیدہ" (سرو آزاد)

(۶) "درویش وضع، عالم فاضل" (نکات الشعرا)

اِن سب بیانوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک جیّد عالم تھے، علوم منقول کے علاوہ معقولات میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ اس سے بھی اُن کی عمر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک نو عمر شخص اتنا عالم و فاضل ہرگز نہیں ہو سکتا کہ علامہ آزاد اور میر جیسے نازک مزاج اُس کی اتنی تعریف کریں۔

شفیق نے تو ان کی اتنی تعریف کی ہے کہ کوئی حد ہی نہیں۔ اگر ان کے بیانات کو مبالغہ نہ سمجھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عزلت سے بڑھکر کوئی دوسرا عالم ہی اُس زمانہ میں نہیں تھا۔

شاعری | ہر تذکرہ نویس نے لکھا ہے کہ عزلت فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، لیکن انھیں زیادہ شوق اُردو ہی میں کہنے کا تھا۔ اور اُن کا اُردو کا کلام ایسا ہے کہ میر صاحب تک نے اُس کی تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں "بنسبتے تمام سخن وارند، از اسالیب کلام شاں واضح می گردد کہ بہرہ بسیارے از دردمندی دارند۔" علامہ آزاد۔ شفیق۔ قائم۔ خواجہ حمید سب نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ اتنی تعریف کے مستحق ہرگز نہیں ہیں جتنی لوگ کرتے ہیں۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہیں تو ان کے کلام پر کچھ لکھنے اور اُسے عام نظروں کے سامنے لانے سے فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ مظہر، میر، سودا، درد اور یقین کی شاعری نے شمالی ہند میں اپنا سکہ جا رکھا ہے۔ اور اُس کے آگے لوگ دکن کے شاعروں کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے، حالانکہ اُن میں سے بعض ایسے ہیں جن کا کلام بیحد بامزہ ہے۔ ایسے ہی شاعروں میں عزلت بھی ہیں۔ ان کے کلام میں میر اور درد کی سی درد بھری باتیں نہ ہوں لیکن ایسے گئے گذرے بھی نہیں کہ آبرو، یکرنگ اور ناجی جیسے شاعروں کا ذکر تو لوگ جی کھول کر کریں اور ان کا نام تک نہ لیں۔

عزلت کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے ایسے زمانہ میں جب کہ فارسی

شاعری اور اُس کے صوری و معنوی اثرات اُردو پر اپنا گہرا اثر جما رہے تھے اپنے کلام کو مُلکی خصوصیات سے مالا مال رکھا، اور بارہ ماسہ۔ پہیلی۔ کبت۔ جھولنہ اور مکرنیوں کے علاوہ جا بجا اپنی غزلوں میں بھی ملکی روایات اور خصوصیات کو نظم کیا۔

بارہ ماسے میں جہاں جا بجا فارسی کے انداز میں شعر نظم کئے ہیں وہاں دوسری طرف بالکل ہندی کے رنگ میں ڈوب کر ہر مہینہ کی خصوصیات بھی ملکی روایات اور کیفیات کو نظر میں رکھ کر نظم کی ہیں۔

اساڑھ کا مہینہ:۔ جھلاتی ہوں میں جھولا سانس کا ہائے ٭ جو پی آویں تو دل کا ملغ سُکھ پلائے

صرف ایک شعر میں جھولے کا ذکر کرکے ہندوستان کی برسات کی کیفیتوں کی یاد تازہ کی ہے۔

ساون:۔ یہ ساون کال سن بھادن میں آیا   مرے رونے نے سُکھ کا گھر ڈُبایا

ہندوستان کی عورتیں ہندی شاعری میں ہمیشہ اس خصوصیت کے ساتھ یاد کی جاتی ہیں کہ ساون آیا اور اُنھوں نے "پی" کی یاد میں آنسو بہانے شروع کر دیئے۔ عزلت نے بھی اُسی خیال کو ذہن میں رکھکر یہ شعر نظم کیا ہے۔

بھادوں:۔ اُٹھے ہے ہوک۔ جب کوئل اُٹھے کوک   ہلگتی ہوں کمک کو موڑ دے ہُوک

اِسی طرح کنوار۔ کاتک۔ اگھن۔ پوس۔ ماگھ۔ پھاگن۔ چیت۔ بیساکھ کے ذکر کے ساتھ مقامی رنگ میں ڈوب کر بڑے مزے مزے کے شعر کہے ہیں۔

اُردو میں مکرنیوں کا رواج نہیں، اس کی ابتدا امیر خسرو کے وقت سے ہوئی اور یہ روش خسرو ہی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ عزلت نے اس یاد کو پھر تازہ کیا۔ صرف ایک مکرنی سنیئے:۔

دامن بھیگا بھی سنگار   موتی بھاگ جگاؤں ہار
سو سر چڑھ ہو پی لاگے نیکا   ارے کوئی ساجن نا سکھی ٹیکا

اسی طرح اُنھوں نے بہت سے دو سخنے بھی کہے ہیں۔

غزلوں میں عزلت نے مختلف مقامات پر ان چیزوں کو نئے نئے انداز میں نظم کیا ہے کہیں ہولی اور اُس کی خصوصیتوں کا ذکر ہے، کہیں بسنت کی رنگینیاں یاد آگئی ہیں کہیں دیوالی کی روشنی سے کلام میں حسن قبول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، دو ایک شعر ملاحظہ ہوں:۔

ہے گلال ابر کہ میں دوبارا رنگیلا سانولا   لالہ اور مہتاب پر ٹلے ہیں دل ہولی کی رات
نفیروں سے نہ ہو بے رنگ لالا فصل ہولی میں   ترا جامہ گلابی ہے تو میرا خرقہ بھگوا ہے

اُڑانا خاکساروں کا غبار آتنا خوش آتا ہے — دھلینڈی کھیلیں کے دن وہ بے پروا مچاتا ہے

زاہدوں پر نہ ڈال لال گلال — چاہیئے پاس شرع اپر کہ سے

چلی ہے موسم ہولی میں بلبل اُس گل بن — کوئی گلاب کی پچکاری بھر کے مارے اُسے

جنون اور اُس کی کیفیتیں

ہر شاعر اپنے ملئے کچھ خاص مضامین مخصوص کر لیتا ہے اور جب اُس رنگ میں ڈوب کر شعر کہتا ہے تو اُس کی روش دوسرے شاعروں سے بالکل جدا گانہ ہو جاتی ہے ۔یقینؔ کے دیوان میں جنون کے متعلق جو شعر کیے گئے ہیں اُن میں کچھ عجب کیف و سرمستی ہے ۔عزلتؔ پر یقینؔ کا خدا جانے کیوں آتنا گہرا اثر پڑا کہ اُن کی اکثر غزلیں یقینؔ کی زمینوں میں کہی گئی ہیں، اُن کا مفصّل ذکر یہاں بیکار ہے، البتہ عزلتؔ کے ایسے شعر جب مختلف موقعوں پر مثال کے لئے پیش کئے جائیں گے تو اُسی وقت یقینؔ کی غزلوں کا بھی ذکر کر دیا جائیگا۔لیکن یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ یقینؔ اور عزلتؔ میں اس مماثلت کے علاوہ دوسری خاص مماثلت ایسے موقعوں پر ہے جہاں اُنھوں نے جنون کی مختلف کیفیتوں یا جنون کا ذکر کیا ہے ۔موازنہ بے کیف سی چیز ہے۔اس لئے صرف عزلتؔ کے ایسے شعر حاضر ہیں :-

جیوں گھولا ہوں میں طوفانِ جنوں کا گرداب — سر کہیں، ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں۔ راہ کہیں

طرزِ بیان میں کس قدر بے تکلفی اور روانی ہے۔

عقل کی تدبیر کیا مجنونِ سودائی کے تئیں — باغباں درکار کب ہے نخلِ صحرائی کے تئیں

اِس شعر میں درد اور مجبوری کی اُس کیفیت کا اظہار ہے جس سے فرزانے بے بہرہ ہیں۔

کھلا کے دل جیسے پالا سو ہے مرا والی — جناب پاک جنوں مدظلہ العالی

زورِ کلام کے ساتھ جذبات کی گہرائی کا کس قدر مکمل مرقع ہے۔

جنوں سے ربط ہے جوں موج آب آتا مرے جی کو — کہ نقش زندگی مٹ جانہ پھاڑوں گر گریباں کو

اِس مضمون کو کس قدر شاعرانہ انداز میں نظم کیا ہے۔

اس جنون وحشت اثر کی بزم رنگین آبادی میں نہیں ویرانہ میں جمتی ہے اس لئے جنوں کے دیوانے دوسروں کو بھی اُسی طرف بلاتے ہیں ؎

بیاباں کے گلوں سے بوئے رنگ درد آتی ہے ارے بلبل چمن سے دل اُٹھا، آ بول صحرا میں

اب یہاں کے واحد حکمراں مجنوں کا نام جنوں کی جن لذتوں میں ذوقِ حسن پیدا کرتا ہے اُس کا ذکر سنیئے ؎

نہ بوجھو یہ بگولا ہے مرا ہم تول صحرا میں یہ قبر حضرتِ مجنوں ہے ڈانواڈول صحرا میں

یا ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو، شاعرانہ اعجاز کی کیف آگیں لذتیں اُس کے ہر لفظ میں سحر پیدا کرتی ہیں

میں وہ مجنوں ہوں کہ آباد نہ اُجڑا سمجھوں مشتِ خاک اپنی اُڑا کر اُسے صحرا سمجھوں

جنونِ فتنہ پرور کی کیفیتوں کو بیان کرنے میں جو شعر عزلت نے کہے ہیں اُن میں کہیں درد ہے اور کہیں اثر۔ کہیں زور کلام ہے اور کہیں شاعرانہ اندازِ بیان کی لطافت۔ اِن چیزوں کے دیکھنے سے عزلت کی شاعرانہ فطرت کا اندازہ رفتہ رفتہ ہونے لگتا ہے لیکن اُن کے کلام کے متعلق زیادہ صحیح رائے قائم کرنے سے پہلے اُس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر ڈال لینے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اُن کے چند ایسے شعر پیش کئے جاتے ہیں جن میں صفائی زبان کے علاوہ شاعرانہ اندازِ بیان اور جوش و سرمستی نے نئے نئے کرشمے دکھائے ہیں یقین کی ایک غزل ہے ؎

نہ مرتا میں اگر صدقہ ترے جانے کے کام آتا گرسنہ ناز کا تھا گالیاں کھانے کے کام آتا

عزلت نے بھی ایک غزل اسی زمین میں کہی ہے۔ دو شعر سنیئے ؎

عبث توڑا مرا دل ناز سکھلانے کے کام آتا یہ آئینہ تھا تجھ خود بیں کے اترانے کے کام آتا

اس کا مقطع خوب کہا ہے ؎

لئے عزلت کے موئے سر بیاباں کے بگولوں نے جو بچتا یہ چنور جاروب ویرانے کے کام آتا

کس قدر شاعرانہ کیف و سرمستی ہے۔

یقین نے ایک اور غزل کہی ہے جس کا مطلع ہے ؎

گرا میں آنکھ سے تیرے جہاں کے ہاتھ کیا آیا مجھے پٹکا زمیں پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا

عزلت کا ایک شعر اسی زمین میں ملاحظہ ہو:۔

کیا ویراں مرا دل دلبروں کے ہات کیا آیا یہ بیت اللہ توڑے سے بتوں کے ہاتھ کیا آیا

یقین کی مشہور غزل ہے ؎

تری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سے کیا نسبت نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت

عزلت پر اس غزل کا بھی جو اثر پڑا اُس کا عکس ملاحظہ ہو ؎

وہ زلفوں سے نہ گذرے لیکہ اپنے جی سے ٹل جاوے کہو میرے دل صد چاک کو شانے سے کیا نسبت

غیر آہ سرد نہیں داغوں کے جانے کا علاج جز صبا کیا ہے چراغوں کے بجھانے کا علاج

اچھا شعر ہے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ یقین کی غزل اس زمین میں بھی موجود ہے۔

یقین کی غزل کا مشہور مطلع ہے ؎

دل نہیں کہکر چلا تھا اپنے جانے کی خبر پھر نہ دی ہمکو کسو نے اُس دوانے کی خبر

عزلت کا مطلع بھی دیکھیے معلوم ہوتا ہے سامنے رکھکر کہا ہے ؎

ہم رکھتے تھے پر نہ دل کے جانے کی خبر آہ نے اُڑنے سے کچھ کہی اس دوانے کی خبر

یقین کی غزلوں میں ایک مضمون کئی جگہ نظم کیا گیا ہے اور اُس میں ہر جگہ نیا لطف ہے ایک آدھ شعر سن کر اس کا اندازہ کیجئے۔

مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالاں نے نہیں معلوم میرے بعد ویرانے پہ کیا گذرا

رکھا ہے گھیر ان شہری غزالاں نے مرے دل کو جینا ہوں اب تو بستی میں یہ ویرانے سے کہیو

عزلت نے اسی کیفیت کا اثر لے کر ایک ایسا ہی شعر کہا ہے، بہت مزیدار ہے ؎

غنیمت بوجھ لیویں میرے درد آلود نالوں کو یہ دیوانہ بہت یاد آئیگا شہری غزالوں کو

دو ایک شعر اور سن کر اس داستان کو ختم کیجئے ؎

برس مت ابر مٹ جاگا مجھو لا خاک مجنوں کا خدا کے واسطے دشت جنوں کی ناک رہنے دے

تنہا چلا میں یوں طرف وادی جنوں زنجیر پاؤں پڑکے مرے ساتھ ہو گئی

متقدمین کے کلام کی ایک خصوصیت جو قریب قریب سب شاعروں میں موجود ہے، درد و اثر ہے جس زمانہ میں اس شاعری کی پرورش ہوئی عام طور پر سیاسی بے چینیاں تھیں اور ان کا اثر افراد پر بھی پڑا۔ شاعر اپنی سوسائٹی کے جذبات و خیالات کے ترجمان ہیں اس لئے اُن کے شعر اسی درد کی تصویریں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جس شاعر کا دل خود اس چوٹ کے درد سے آشنا ہوا اُس کے یہاں زیادہ سوز و گداز ہے اور جو خود اس کا شکار نہیں ہوا بلکہ اُس نے دوسروں کی تکلیفیں دیکھیں اُس کے یہاں اس درد و اثر، سوز و گداز میں آپ بیتی کا لطف نہیں۔ عزلت کے کلام میں بھی درد کی چاشنی ہے۔ لیکن میر یا درد کی سی تڑپ نہیں۔ البتہ ایک بات نئی ہے اور وہ یہ کہ اُن کے اس

ختم کے شعروں میں عموماً درد کے ساتھ طعن و طنز ضرور ہے اور اس طرح اُنھوں نے اپنا رنگ اپنے ہم عصروں سے کسی قدر الگ کرلیا ہے۔

پھیر کر منہ ہم سے کہتے ہو بُلاتا ہوں تمھیں ہائے مت باتیں بناؤ ہم سے ہو بیزار تم

اِس شعر میں بیکسی اور درد ضرور ہے لیکن دوسرے مصرعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا ضبط کے حدود سے باہر ہو چکا ہے اور اب اُس کے درد اور تکلیف کا احساس ایسا نہیں کہ وہ اُسے آسانی سے برداشت کرسکے۔

مرنا بھلا۔ کہ بھلی۔ محشر بھی صلح ہے بے درد سے کسی کو نہ حق آشنا کرے

یہ شعر بھی ایسے ہی شخص کی زبان سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے جو اپنے تلخ تجربات سے بحد عاجز آچکا ہے اور اب اُن کی پرورش اُس کے اختیار میں نہیں۔

بسے ہے تجھ میں دل پر دل کے تو جلنے کو کیا جانے شرر پر جو گذرتی ہے سو پتھر کی بلا جانے

ہوش و دل لے کر ہمارا اب نہیں لیتا سلام بے جواب اے بے مروت ہم نے تیرا کیا کیا

مت جھٹک ہم جلوں اُپر دامن بات سُن راکھ لے اُڑا مت دے

مجھکو گُھرو نے خموشی سے کیا قتل سو کیوں بلبلو تم کہو کیا منہ میں زباں ہے کہ نہیں

یقین کی ایک غزل ہے ع ہم ہوئے ایسے بُرے وقت میں آزاد کہ بس۔ عزلت کی بھی غزل اس زمین میں ہے، ایک شعر سنیئے:-

نیم بسمل ہوا میں تیغ نگہ تب رکھ لی کس بھلے وقت بُرا ہو گیا جلاد کہ بس

دنیا کے تلخ تجربوں سے عاجز آکر مرتے وقت زبان سے یہ نکلتا ہے کہ ؎

چشم رکھتا ہوں، کوئی یک پل نہ رو دے میرے بعد آپ کو جوں شمع میں مرنے سے آگے رو چکا

عزلت کے شعروں میں سے ایسے بھی بہت سے ہیں جن میں طنز کا جذبہ اِس سے کسی قدر زیادہ نمایاں ہے لیکن اُس میں مومن کے ادبی طنز کا لطف نہیں ؎۔

نخل اُمید بے وفاؤں سے دل سلامت پھرے تو پھل پایا

عزلت کے کلام کی ایک دلچسپ خصوصیت اُن کی شوخی ہے۔ کبھی کبھی یہ شوخی اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ اُسے صرف ظرافت ہی کہکر پکارا جاسکتا ہے۔ چند شعر سُن کر اس کا اندازہ کیجئے جرأت اور داغ کے رنگ کی کس قدر مکمل ابتدا ہے ؎

گرد سے چہرہ بھرے آئے چمن میں دوڑتے
میں نے منہ چوما تو کہتے ہیں تمھارے منہ میں خاک

اسی رنگ کا ایک دوسرا شعر ہے جس میں اس مخصوص رنگ کی جھلک کم ہے ؎

جلد مر گئے تری حسرت میں ہم
پہ ترا دیر کا آنا نہ گیا

ہنستے کیا ہو مرے رونے پہ اے دلدار بہت
تم سلامت رہو بندے کے خریدار بہت

اکثر شعرا ایسے ہیں جن کی شوخی میں یہ تیکھا پن اور لگاوٹ نہیں، لیکن جرأت اور داغ کے رنگ کی جھلک ضرور ہے ؎

عشق گورے حسن کا، عاشق کے دل کو لے چلا
سانولوں کے عاشقوں کا دل ہے کالا کولا

بستہ جو ہنسے ترے دہن پر تو چبا جاؤں
دم مارے جو عناب ترے لب سے تو کھا جاؤں

جیسا کہ ایسے رنگ میں کہنے والوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، عزلت کے یہاں اس شوخی اور ظرافت کا نتیجہ ہوا کہ بعض بعض جگہ اس قدر بد مذاقی پیدا ہوگئی کہ تعجب ہوتا ہے۔ ایسے شعروں میں سے صرف ایک ایسا شعر لکھتا ہوں جس میں اس بد مذاقی کا پر تو ذرا کم ہے، اسے پڑھکر اندازہ ہوجائیگا کہ عزلت نے اس سے آگے چلکر کیا کیا کہا ہوگا ؎

بہت منہ پر وہ زلفیں آج بکھرا تا ہے اے عزلت
وہ گالوں پر کسی کا زخم دنداں ہے لگا شاید

عزلت کے یہاں خمریات میں بھی اکثر شعر ہیں اور وہ پُر کیف بھی ضرور ہیں۔ یہ کیفیت بھی بیدِ خمخانۂ یقین سے اُڑائی گئی ہے۔ یقین قدما میں خمریات کے بادشاہ ہیں اور اس رنگ میں جو کچھ کہہ گئے ہیں اس کی مثال ہمارے دور میں ریاض کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی۔ عزلت کے یہاں بھی کہیں کہیں وہی مزا ہے ؎

حشر میں قبر سے کہتا ہی اُٹھے گا مے کش
کہ کہاں مے ہے کہاں جام کہاں ہے شیشہ

تو جو پوچھے اُن کی نہ ہو کیوں نہ رہی مے خواری
چشم سے جام و دل بادہ کشاں ہے شیشہ

عزلت کے کلام کا ایک پُر لطف حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے حقائق دنیا کا ذکر کیا ہے
یا جہاں شاعرانہ انداز میں کسی اخلاقی نکتہ کی تعلیم دی ہے، یہ تعلیم ایک زاہد خشک جیسی نہیں
اس میں ہر جگہ شاعرانہ انداز جلوہ گر ہے اور اس لئے وہ اُسے پُر کیف بناتا ہے ؎

سیہ روزوں میں میری قدر کو احباب کیا جانیں — اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہے گا

مقامِ زندگی سے کوچ کر گئے جلد یار اپنے — وہ منزل پہنچے اور ہم باندھتے رہ گئے ہیں بار اپنے

دنیا کی نا قدری کی کتنی اچھی تاویل ہے ؎

جہاں کی آنکھ سے جوں اشک جو گرا ہووے — تو اس کا غیب سے طالع کا عقدہ وا ہووے

انسان کو ہر حال میں خوش رہنا چاہیئے ؎

جنونِ گلرخاں میں مثل لالہ خوش رہا کریئے — جگر پر داغ کھا کر خونِ دل پی کر ہنسا کریئے

غالب کا مشہور قطعہ ہے :۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

بے ثباتیٔ دنیا کی اس سے مکمل تصویر اردو شاعری میں نہیں۔ عزلت نے غالب سے ایک صدی
پہلے اسی مضمون کو بالکل اسی انداز میں نظم کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی تخئیل کا مرکز بھی
عزلت ہی کا قطعہ ہے۔ سنیئے لطف سے خالی نہیں ؎

گیا میں فصل گل میں، سیکڑے عشرت کے ساماں تھے — اِدھر تو زمزمے قلقل کے اُدھر شور یاراں تھے
نہ تنہا سبحہ گرداں گھنچے تھے دورِ ساغر سے — کہ ساجد چوطرف سے قبلہ گاہ خم کے مستاں تھے
سُنا جب میں نے یعنی محتسب کا پھر گیا اک دن — تو کیا دیکھوں کہ جاروں گوشے میخانے کے ویراں تھے
بھر آئی چھاتی میری دیکھ وہ عشرت کدہ خالی — کہا میں کیا ہوا کیدھر گئے وہ یاں جو مہماں تھے
گریباں پھاڑ رو رو کر کہا صحبت کو گلابی نے — یہاں پیالے وہاں شیشے یہاں خم تھے سبو واں تھے

اس قدر پُر تاثیر قطعہ ہے۔ محاکات کا لطف ایک ایسا سماں ہماری نظروں کے سامنے پیش کر دیتا ہے
کہ ہم اُسے پڑھتے ہیں اور جھومتے ہیں۔ قطعہ کا آخری شعر درد اور اثر سے مملو ہے اور عزلت کی
شاعرانہ فطرت پر دال ہے۔

عزلت کے کلام کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی۔ لیکن ہم نے اُن کے جتنے شعر پڑھے

اُن سے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ ازل سے ایک شاعرانہ فطرت لے کر آئے تھے اور ہر موقع پر اُسے کام میں لائے۔ اُن کے کلام میں صفائی اس درجہ ہے کہ ذرّہ برابر بھی شبہ نہیں ہوتا کہ وہ دکنی شاعر تھے۔ باوجود اس کے بعض بعض جگہ اس قدر بد مذاقی سے کام لیا ہے کہ ایک عالم فاضل آدمی سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اکثر شعر پھیکے اور بے مزہ ہیں۔ اس کی وجہ میرے نزدیک اُنکی پرگوئی ہے۔ اس کا اندازہ لچھمی نراین شفیق کے ایک بیان سے ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک ساقی نامہ کہا ہے جس میں تین ہزار اکتیس شعر ہیں اور وہ سب کے سب ایک ہی دن میں کہے گئے ہیں[1]۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس طرح ممکن ہے اس کے ساتھ ساتھ شفیق کے بیان کو غلط سمجھنے کی بھی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے دو ایک شعر سن کر عزلت کے ذکر کو ختم کیجیے۔

جو ایمان ہے درد کا دے تو جام — کہ ترسا فانے سے ہے ترسا کا کام

بھلانا مجھے تجھ کو یاد آئے گا — مرے بعد مل ہاتھ پچھتائے گا

مرے پر مری خاک دے گی صدا — ارے ئے پلا۔ ئے پلا۔ ئے پلا

کوئی وجہ نہیں کہ ایسا شاعر ہر اس موقعہ پر یاد نہ کیا جائے جہاں دکن کے شعری کارناموں کا ذکر ہو۔

انتظار کی گھڑیاں

(از جناب رام جیداس وکیل ایبٹ آباد)

کیا بتاؤں کہ کیسا حال رہا — رات بھر آپ کا خیال رہا

جھوٹے وعدے پہ اعتبار کیا — آپ کی ہاں نے مجھکو خوار کیا

دونوں ہاتھوں سے دل دبائے رہا — بے قراری کو یوں چھپائے رہا

راہ تک تک کے رہ گئیں آنکھیں — اِک مصیبت تھی سہ گئیں آنکھیں

صبح تک محوِ انتظار رہا — کوستا خود کو بار بار رہا

رات کیا اس طرح بسر نہ ہوئی — "تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی؟"

---

[1] چمنستان شعرا صفحہ ۴۴۷

"زمانہ"

(از پنڈت اندرجیت صاحب شرما)

گیتی کے فسانوں میں ہے میرا ہی فسانہ — ہر ساز سے میرا ہی نکلتا ہے ترانہ
ہر رنگ میں پاؤ گے مرا نقش یگانہ — ہے نام مرا وقت لقب میرا زمانہ

مطلب ہی نہیں مجھکو یہاں آج سے کل سے
ہے یوں ہی مرا سکہ رواں روز ازل سے

مفلس کو بنایا کبھی شاہوں کو بگاڑا — اس گھر کو بسایا کبھی اس گھر کو اجاڑا
بزدل کو ابھارا کہیں رستم کو پچھاڑا — گیدڑ کو کیا شیر تو شیروں کو لتاڑا

اس دست عنایت میں کرامات یہی ہے
نیرنگیوں میں میری ہر اک بات یہی ہے

آتا ہے فلک کو بھی مرے نام سے چکر — گردش میں زمیں ہی نہیں دن رات برابر
چھایا ہے عجب رعب مرا شمس و قمر پر — خدمت سے مری ہو نہیں سکتے کبھی باہر

رہتی ہے حکومت مری ہر بحر میں بر میں
یکساں ہے نشانہ مرا بس خشک میں تر میں

ہنگامۂ ہستی میں ہے میرا ہی تلاطم — سیاروں میں موجود ہے میرا ہی تبسم
ہستی کو بھلادے جو وہ میرا ہے ترنم — خاموش جہاں کو کرے میرا وہ تکلم

مدہوش مرے جام کو پی کر ہوئے انساں
گمراہ مری راہ میں آ کر ہوئے ناداں

پائے گا مرے بحر کا کوئی نہ کنارا — ملنے کا کسی کو نہیں اس گھر میں سہارا
نیرنگیوں کا یہ مری ہوتا ہے اشارا — کھا جائے نہ دھوکا کوئی انسان خدارا

کہتا ہوں یہ للکار کے ہے جال غضب کی
جو پھنس گیا اسمیں یہ نکلنے نہیں دیتی

کچھ مجھکو تعلق ہے فنا سے نہ بقا سے اِس دل میں کہاں خوف ہو پھر روزِ جزا سے
پوچھو تو حقیقت کو مری جا کے خدا سے اِک لاگ سی رہتی ہے مجھے قبلہ نما سے
کھلتا جو کسی پر نہیں وہ راز ہے میرا
انجام ہے میرا نہ کچھ آغاز ہے میرا

یہ وقفِ خزاں میرا چمن زار نہیں ہے یہ دورِ طرب گردشِ پرکار نہیں ہے
اس بزم میں غم کا کوئی اظہار نہیں ہے یہ رنگِ سخن اور ہے بیکار نہیں ہے
ہے شیشۂ دل میں یہاں اِک اور ہی عالم
ہوتا ہی نہیں جس کا کبھی جوشِ جنوں کم

ہے ذاتِ مقدس مری توحید کا جلوا ہستی بھی مری شاہدِ مطلق ہے سراپا
اِک راز ہوں کونین کا میں بہرِ تماشا فطرت کا کرشمہ ہے ہر اک میرا کرشمہ
روشن ہیں سیہ خانے مری جلوہ گری سے
ہیں کعبہ و بت خانے میں میرے ہی تماشے

خالی جو نہ ہوئے سے وہ میخانہ ہے میرا دُنیا کے لئے دُور میں پیمانہ ہے میرا
کاشانۂ دل بھی تو جلو خانہ ہے میرا دیوانہ خدا کا ہے جو دیوانہ ہے میرا
گنجینے ہیں قدرت کے نہاں سینے میں میرے
فطرت کے ہیں اسرار اس آئینے میں میرے

جس نے مجھے ہر آن میں دل سے نہ بھلایا جس نے مری درگاہ میں سر اپنا جھکایا
جس نے کہ مری خاک کو آنکھوں سے لگایا اُس نے ہی مری ذات سے کچھ فیض اٹھایا
برگشتہ ہوا مجھ سے جو ٹھوکر اُسے چھوڑا
ساحل پہ سرِ شام ڈبو کر اُسے چھوڑا

موجودہ تعلیم نسواں پر ایک نظر

(از شریمتی شوکماری دیوی دختر حضرت جگر بریلوی)

آج کل ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جارہی ہے اس کا طبقۂ نسواں پر کیا اثر پڑ رہا ہے اس پر بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہوگی۔ اسکی پہلی وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کچھ ایسی کشمکش کی زندگی ہے جو ایسے نازک مسئلوں پر غور و خوض کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ اس کشمکش میں سخت ترین عنصر کسب معاش کا ہے جس کے باعث ہر شخص ہر وقت مصروف، متفکر اور پریشان رہتا ہے۔ آج میں اس تعلیم پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اور چونکہ کسی معاشرتی مسئلہ پر تنقید کرنے سے پہلے ایک معیار تنقید قائم کرنا لازمی ہوتا ہے اس لئے تعلیمی مسئلہ پر بحث کرنے کیلئے بھی ہمیں ایسا کرنا ہوگا۔

ہندو دھرم میں انسان کا سب سے بڑا نصب العین روحانی ترقی ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق ہمارا تعلیمی معیار اور زندگی کے اصول قائم کئے گئے ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں آجکل مغربی طریقوں اور اصولوں پر تعلیم دیجاتی ہے جو مغرب کے نصب العین کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس نصب العین کے اعتبار سے وہی شخص سب سے زیادہ کامیاب ہے جو بہت دولتمند ہے اس کے مطابق انکی تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ روحانی ترقی کے اعتبار سے اہنسا، تیاگ، خدمت، پرُدپکار، میا اوستی دھرم وغیرہ تعلیم کے نتائج ہونے چاہئیں۔ اس کے خلاف مغرب کہتا ہے "بخور و خوش باش" یعنی (Eat, drink & be merry) پہلے کا مطلب نفس کشی ہے اور دوسرے کا نفس پروری۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہندوستانی روز ازل سے ہی ان اصولوں پر عمل کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو میں ہندو دھرم کے جزئیات منتشر ملیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ ان جزئیات میں بعض ایسی باتیں داخل ہوگئی ہیں جو غیروں کو مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں جس کا باعث ہندو دھرم نہیں بلکہ ہماری جہالت ہے۔ یہ برائیاں مغربی تعلیم سے دور نہیں ہوسکتیں اور نہ یہ تعلیم ہماری قدرتی افتاد طبع و تربیت کے موافق ہوسکتی ہے کیونکہ ہماری عظیم الشان روحانی و اخلاقی روایات، ہمارا ماحول اور ہماری قدیم زندگی کے اثرات اب تک غیر محسوس طریقہ پر ہمارے دل و دماغ کی نشو و نما کرکے کسی اور ہی منزل کیطرف کھینچتے ہیں اور مغربی تعلیم کسی دوسری طرف مائل کرتی ہے۔ نتیجہ باطنی

کشمکش اور بے اطمینانی ہوتا ہے۔

دوسرا اہم فرق مغربی اور مشرقی آدرشوں (Ideals) میں ازدواجی زندگی کے متعلق ہے۔ شاستروں میں عورت کو "اردھانگنی" یعنی مرد کا نصف جسم کہا گیا ہے۔ عورت و مرد کے باہمی تعلقات کا اس سے زیادہ پُرمعنی اور صحیح تخیل دوسرا نہیں ہوسکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عورت و مرد کا مشترکہ وجود ہی ایک فرد انسان کہا جا سکتا ہے۔ اس کے رو سے باہمی زندگی ایک دوسرے کی رفاقت و محبت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اس زندگی کی تکمیل کے لئے ایک کو دوسرے کا جزو حقیقی سمجھنا اسکی محافظت و خدمت کرنا اور ایک کو دوسرے پر اعتماد رکھنا لازمی ہے۔ عورت کمزور ہے مرد طاقتور۔ عورت کا فرض مرد کی خدمت اور محبت ہے، اور مرد کا محبت و محافظت۔ محافظت میں جسمانی محافظت اور کسب معاش دونوں داخل ہیں۔ میں نے عورت کے فرائض میں خدمت کو بھی شامل کیا ہے۔ اس پر بعض نئی روشنی کی تعلیم یافتہ بہنیں ناک بھوں چڑھائیں گی مگر خدمت کے بغیر محبت کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ انسان کا دوسرا اہم فرض انسان کی خدمت ہے۔ سب سے پہلے ہم پر ہمارے والدین کا فرض ہے اُس کے بعد سوسائٹی کا اس کے بعد ہمارے ملک کا، اس آخری فرض کو ادا کرنا موجودہ زمانہ میں بچے بچے پر لازم ہے۔ بچوں کا سب سے پہلا مکتب آغوش مادر ہے۔ اگر ماں ہی اصول خدمت سے بیگانہ ہے تو بچے کیا ماں باپ کی، کیا سوسائٹی کی، اور پھر کیا ملک کی خدمت انجام دے سکیں گے۔ اسی لئے عورتوں کا سب سے پہلا دھرم اصولِ خدمت کو سیکھنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔

مغربی اصول کے مطابق ازدواجی زندگی ایک سماجی (Social Contract) معاہدہ ہے اس اعتبار سے ازدواج زندگی کا کاروباری پہلو ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے سمجھوتہ میں بے لوث محبت کی چنداں گنجائش نہیں ہوتی۔ میری مراد اس محبت سے ہے جو روحانی مسرت کا مخزن اور روحانی ترقی کی معاون ہوتی ہے۔ مغرب والے بھی عورت کو مرد کا (Better Half) یعنی "نصف بہتر" مانتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ مغرب میں عورت و مرد اپنا الگ الگ وجود رکھتے ہیں۔ اور اپنے اپنے طرز عمل میں بالکل آزاد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ "بخور و خوش باش" بھی شامل کر لیجئے تو مرد و عورت جداجدا ہمہ تن خود پرستی و خودغرضی کا مجسمہ نظر آئیں گے۔ اور انکی زندگیاں عشرت پرستی و خود آرائی کی تفسیریں ہیں۔ ایسی زندگی میں محبت نہیں پیدا ہوسکتی اور خدمت کا تو ذکر ہی کیا۔ جن لوگوں کا ربط ضبط انگریزی سوسائٹی سے ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انگریز عورت سے اگر اُس کا دوست ملاقات کر رہا ہے تو اس کا شوہر اس تنہائی کی صحبت میں ہرگز مخل نہیں ہوسکتا کیا کوئی ہندوستانی مرد اس بات کو گوارا کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں جس دن ایسا ہوگا ہندوستانی ہندوستانی نہ رہیں گے۔ اُن کی فطرت ہی بدل جائیگی مگر یہ

ناممکن ہے۔ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق۔ انگریز مرد جب بیمار پڑتا ہے تو اس کی بیوی سکے تمام فرائض مریض کو وقت پر دوا دینے اور دو چار تشفی آمیز کلمات کہہ دینے تک محدود رہتے ہیں ہندوستانی جب بیمار پڑتا ہے تو وہ صرف یہی نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی ہر وقت اس سکے پاس موجود رہے بلکہ خود عورت اس کے پاس موجود رہنے اس کی تیمارداری میں ہمہ تن مصروف رہکر سخت سے سخت تکلیف جھیلنے میں اپنی زندگی کی غایت سمجھتی ہے اور اس میں دونوں کو وہ راحت حاصل ہوتی ہے جس کا بدل دنیا کی کسی مسرت میں موجود نہیں۔ یہ وہ اثرات ہیں جو کبھی ہندوستانی دل سے محو نہیں ہو سکتے۔ سیتا اور ساوتری کے تصورات و اثرات ہندوستان پر چھائے ہوئے ہیں جو کبھی مٹ نہیں سکتے مگر تعلیم دور کرانا چاہتی ہے۔ نتیجہ وہی یعنی اطمینانی اور بے چینی اور ایک دوسرے سے بیگانگی و بے اعتنائی اور زندگی کی کشمکش میں اضافہ ہوگا۔

ہندوستانی عورت کا سب سے بڑا جوہر عصمت و حیا ہے۔ عصمت کے معنی سب جانتے ہیں۔ اور حیا عصمت کا جزو لاینفک ہے۔ حیا کے معنی جذبۂ شرم ہی کے نہیں بلکہ اُس میں جسم کو ڈھانکنا بھی شامل ہے۔ جو لوگ انسان کو حیوانی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور حیا سوز آزادی کو روا رکھتے ہیں اُنکے خیالات اُنھیں کو مبارک ہوں۔ مگر جس ملک نے روحانی ترقی میں اپنا ثانی نہیں رکھا وہ ان خیالات کو کبھی روا نہیں رکھ سکتا۔ جب میں اپنی کسی بہن کو اسٹیشن یا کسی دوسری جگہ اس طرح دیکھتی ہوں کہ نصف رانوں تک گھٹنا اور وہیں تک فراک منڈھے، ہاتھ پاؤں سب کھلے، سر ننگا، چوٹی کھلی پشت پر پڑی بل کھاتی ہے تو مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے کہ آزادی کی یہ تعلیم و تہذیب غریب ہندوستانیوں کو کس گھاٹ لگائے گی۔ پردہ دور کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عریانیوں کو اُن کی جگہ پسند کیا جائے اس قسم کا پہناوا سراسر بے شرمی اور بے حیائی نہیں تو اور کیا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں اور سر کھلا رہنے سے صحت اچھی رہتی ہے وہ دیدہ و دانستہ اپنے ضمیر کو دھوکا دیتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیہاتی لڑکیاں اُن کی لڑکیوں سے کہیں تندرست و توانا ہوتی ہیں مگر وہ اتنی کوتاہ لباس نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جسمانی مشقت کرتی ہیں اور تازہ ہوا میں سادہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہ مانا کہ شرم و حیا ایک دلی کیفیت ہے لیکن یہ وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو بغیر سیکھے یا سمجھائے ہوئے پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ بغیر ظاہری عمل کے قائم رہ سکتا ہے۔ اب اس کا ظاہری عمل اگر وضع و لباس نگاہ و زبان سے متعلق نہیں ہے تو کس سے متعلق ہے۔ وضع و لباس میں بے پردائی اور بدن کی عریانی، بے حیائی نہیں تو کیا ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ محض غلامانہ

تقلید کے اثر سے کرتے ہیں۔ جس خطۂ زمین پر عورتوں کے جسمانی حُسن کی نمائش منعقد کی جائے وہاں شرم و حیا کا وجود باقی رہ سکتا ہے؟ وہاں کے تعلیمی طریق و اصول اپنی ہی جیسی بے غیرت دنیا کی طرف رہنمائی کریں گے۔ اس تعلیم کی عورت کا تصور فیشن کا نمونہ یعنی گٹا پارچہ کا نیم عریاں کھلونا، ایک ہاتھ میں ٹینس کا ریکٹ دوسرا ہاتھ پیانو پر۔ ابھی تک مردانہ کھیل تماشوں کے ساتھ گانا بھی عورت کی تعلیم کا جزو سمجھا جاتا تھا مگر اب سمند ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا یعنی ناچنے کی بھی تحریک شروع ہو رہی ہے اور سخت افسوس کا مقام ہے کہ بعض مقتدر اخبارات اُس کی تائید میں خامہ فرسائی کرنے میں مصروف ہیں۔ گانا ہمارے ملک میں عبادت میں شامل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ گانے سے جو روحانی کیف و سرور حاصل ہوتا ہے اور جو تہذیب نفس اِس سے ہوتی ہے وہ اس بات کی مقتضی ہے کہ اُسے عبادت کا ایک جزو سمجھا جائے۔ مگر گانا اسی طریقہ پر ہو جو عورت کے حُسن باطنی میں اضافہ کرے نہ اس کو ایک تفریحی کھلونے کی صورت میں پیش کرے۔ کیا اسی مقصد سے گانے کی موجودہ تعلیم دی جاتی ہے؟ ہرگز نہیں؟ اب ایک طرف تو مکمل آزادی کی تعلیم خود پرستی سکھاتی ہے دوسری طرف فیشن کی تقلید خود آرائی کی تعلیم دیتی ہے۔ غیرت و حیا سے اگر کچھ واسطہ رہتا ہے تو محض زبانی اور لفظی۔ اس پر گانا بجانا لازم، مزید براں ناچنا بھی ہوا تو پھر ہندوستان کی عورت کیا ہو جائیگی؟ اسکے تصور سے روح لرزتی ہے۔ مغربی تہذیب میں عورت کی جو حالت ہے اسکے متعلق والد صاحب[1] کی ایک نظم "ترغیب غیب" سے چند اشعار یہاں درج کرتی ہوں۔

[1] نئی محفل نئے آئین ترتیب — ہوئیں عریانیاں معراج تہذیب
زن و شو میں کوئی رشتہ نہیں ہے — فقط پابندیٔ نفس لعیں ہے
اُڑی ہے طبقۂ نسواں سے غیرت — مزاجوں میں ہے بیباکی سفاہت
مدارِ زندگانیٔ زن و شو — وفادارانہ ربط و لطفِ دل جو
وہ جانِ حُسن انداز نسائی — غیورانہ وہ نازِ دلربائی
وہ روحِ زیست ایثار و محبت — محبت میں وہ روحانی مسرت
خراب حسرت مردانگی ہیں — مکدر سارے لطف خانگی ہیں
ہوس کی عشق پر ہے حکمرانی — چلے ہیں ازدواج امتحانی
مسلط ہے بلا حیوانیت کی — پریشاں روح ہے انسانیت کی

[1] حضرت جگر بریلوی

اس کے بعد ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ موجودہ طریقہ تعلیم ہندوستانیوں کی مالی حالت کے کہاں تک مناسب ہے؟ ہندوستانیوں کا افلاس ماتم کرنے کے قابل ہے۔ یہ اس کا محتاج ہے کہ تعلیمی درسگاہیں جھونپڑوں میں قائم کی جائیں اور اُستاد طلبا یا طالبات کو ٹاٹ پر بٹھا کر تعلیم دیں۔ جسقدر روپیہ آجکل تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اُس کو وہی والدین جانتے ہیں جو رات دن محنت و جانفشانی سے روزی کماتے ہیں۔ یہ مسئلہ بذات خود ایک جداگانہ بحث کا محتاج ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ بہرحال یہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس قدر گراں تعلیم کا بار دو چار فیصدی متمول حضرات کے سوا عام ہندوستانی برداشت نہیں کر سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے اعلیٰ دماغ، مقتدر اور ذی اثر رہنمایانِ قوم ان تمام باتوں کو مدنظر رکھکر پرانے آدرشوں اور قومی و ملکی ضروریات و روایات کے مطابق نصاب تعلیم مرتب کریں۔

تعلیم نسواں بہرحال ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ موجودہ تعلیم کے زہریلے اثر کو کسطرح دور کیا جائے یا یوں ہی بے پروائی سے اسے پھیلنے دیا جائے حتیٰ کہ مرض لاعلاج ہو جائے۔ قبل اس کے کہ کوئی موثر تدبیر سوچی جائے، ہر شخص کو، خصوصاً تعلیمیافتہ گھرانے کی مستورات کو، یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اس قسم کی تعلیم سخت مُضر ہے۔ اور اُن کو اپنے بچوں کے دلوں میں اپنی تربیت سے ہندوستان کے رفیع الشان آدرش اس طرح نقش کر دینا چاہیئے کہ زمانہ کی مخالف ہواؤں کا اُن پر کچھ اثر نہ ہو سکے۔ جب تک یہ نہو گا اس معاملہ میں کسی قسم کا غم و غصہ بیکار ہے اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ ہندوستانی بہروپیے بنتے جائیں گے۔ ان کی ظاہری و باطنی زندگی میں کبھی ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکے گی۔ اور وہ حقیقی مقصد حیات سے روز بروز دور تر ہوتے جائیں گے۔

رُباعی

کیا تم سے بتائیں عمر فانی کیا تھی بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی، وہ ہوا کا جھونکا اک موج فنا تھی زندگانی کیا تھی

حضرت رواں مرحوم

داراشکوہ کا قتل

(از وکرما دیتہ سنگھ نگم ایم۔اے، ایل ایل۔بی وکیل لکھنؤ)

شاہجہاں کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑے لڑکے کا نام داراشکوہ، دوسرے کا شجاع، تیسرے کا اورنگ زیب اور چوتھے یعنی سب سے چھوٹے کا نام مراد بخش تھا۔ بڑی لڑکی کا نام جہاں آرا اور چھوٹی کا روشن آرا تھا۔ یوں تو شاہجہاں اپنے سبھی بچوں کو دل وجان سے چاہتا تھا مگر دارا و جہاں آرا کو سب سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ یہاں تک کہ دارا کو ہمیشہ اپنے ساتھ دلی و آگرہ میں رکھتا تھا اور باقی تینوں لڑکوں کو مختلف صوبوں کا صوبیدار بنا دیا تھا۔ اِس طرح اورنگ زیب دکن کا، شجاع بنگال کا اور مراد گجرات کا صوبہ دار تھا۔ شاہجہاں دارا کو اتنا چاہتا تھا کہ اپنے بعد دلی کے تخت پر اُسی کو بٹھانا چاہتا تھا۔ دارا بھی خود کو باپ کا لاڈلا بیٹا سمجھتا تھا اور شاید اسی وجہ سے وہ سب بھائیوں کی شکایتیں باپ سے کیا کرتا اور جو کچھ اُن کے خلاف چاہتا باپ سے کرا لیتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب نیز دوسرے بھائی دارا کو نیچا دکھانے کی ہمیشہ سازش کیا کرتے تھے۔

اتفاق سے ۱۶۵۷ء میں شاہجہاں یک بیک اتنا بیمار ہو گیا جس سے دربار در کنار جھروکے پر بھی بیٹھنا بند ہو گیا۔ اس سے تمام آگرہ میں یہ افواہ اڑ گئی کہ بادشاہ فوت ہو گئے ہیں۔

یہ افواہ سنتے ہی دوکانداروں نے اپنی اپنی دوکانیں بند کر دیں اور تمام شہر میں کئی دن تک ہڑتال رہی۔ تمام رعایا شاہجہاں کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھی۔ ادھر جب اورنگ زیب و شجاع و مراد نے یہ افواہ سنی تو فوراً اپنی اپنی فوجیں تیار کر کے آگرہ کی طرف چل دیئے۔ اگرچہ تینوں بھائی دارا کے یکساں مخالف تھے، مگر آپس میں بھی یہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکتے تھے۔

تینوں میں اورنگ زیب سب سے زیادہ چالاک و شاطر تھا، جس نے اپنی حکمت عملی سے مراد کو اپنی طرف ملا لیا اور دونوں اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ آگرہ کی جانب چل دیئے۔ ادھر سے شجاع بھی اپنی فوج لیکر آگرہ کی طرف بڑھا۔ جب دارا کو یہ خبر ملی تو اُس نے کہلا بھیجا کہ والد

ابھی زندہ ہیں اس لئے تم لوگ اپنی اپنی جگہ واپس جاؤ۔ مگر ان لوگوں کو دارا کی بات پر اعتبار نہ آیا اور وہ آگرہ پر چڑھ آئے۔ یہ دیکھکر دارا نے بھی اپنے بڑے لڑکے سپہر شکوہ کو ان کے مقابلہ کے لئے بھیجا چنانچہ اُس نے شجاع کو شکست دیکر بھگا دیا۔ اس کے بعد دارا خود اورنگزیب و مراد کے مقابلہ کے لئے گیا سامو گڑھ کے میدان میں بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی مگر فتح اورنگزیب کے ہاتھ رہی۔ فتحیاب ہوتے ہی اورنگزیب نے آگرہ کے قلعہ کو گھیر لیا اور اپنے بڈھے باپ کو قید کر کے خود تخت کا مالک بن بیٹھا۔ غریب دارا اپنی جان بچا کر اُسی دن رات کو اپنی بیوی دو لڑکیوں اپنے لڑکے سپہر شکوہ اور چند وفادار سرداروں کے ساتھ اجمیر کی طرف بھاگ گیا۔ یہ خبر سنتے ہی اورنگزیب نے جے سنگھ کو دارا کے تعاقب کے لئے بھیجا۔ جے سنگھ ایک بڑا ہوشیار اور بہادر سردار تھا اُس نے فوراً سروہی، پالن پور، کاٹھیاواڑ، کچھ و گجرات وغیرہ کے حاکموں کو لکھ بھیجا کہ جہاں کہیں بھی دارا ملے اُسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ یہ خبر پاتے ہی گجرات کے افسروں نے دارا کے سردار سید محمد بخاری کو احمدآباد میں گرفتار کر لیا۔ دارا کے جاسوسوں نے فوراً بخاری کی گرفتاری کی خبر دارا کے پاس بھیجدی جو اُس وقت گجرات کے صدر مقام سے اڑتالیس میل کے فاصلہ پر تھا۔ یہ خبر سنتے ہی دارا کے ہوش اُڑ گئے اور اُس کے بیوی بچے رونے لگے کیونکہ جے سنگھ نے چاروں طرف سے اُس کا راستہ بند کر دیا تھا۔ اُس وقت اُس کے پاس ایک گھوڑا ایک بیل گاڑی، پانچ اونٹ اور کچھ خچر تھے، اور وہ خود معمولی ململ کا کرتا پاجامہ اور ایک آٹھ آنے والا جوتا پہنے ہوئے تھا۔ ایسی مصیبت میں اُس کے ایک سردار فیروز نے بھی اُس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اورنگزیب سے جا ملا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد دارا ہندوستان کی سرحد پر درۂ بولان کے قریب پہونچا اور ایران جانے کا ارادہ کیا مگر اُس کی بیوی مانع ہوئی۔ خوش قسمتی سے اُسی وقت دادر کے زمیندار ملک جیون سے دارا کی ملاقات ہوئی۔ یہ زمیندار وہی شخص تھا جس کی دارا نے جان بخشی کرائی تھی جب شاہجہاں نے اُسے ہاتھیوں سے کچل ڈالنے کا حکم دیدیا تھا۔ ایسے دوست کو پاکر دارا کو بڑی تسکین ہوئی۔ مگر بدقسمتی سے اُسی وقت اُس کی بیوی نادرہ بانو بیمار ہو کر تین دن کے اندر فوت ہو گئی جس سے دارا کو بڑا صدمہ پہونچا۔ اس پر بھی اُس نے صبر و استقلال سے کام لیا۔ اور اُس کی لاش کو تجہیز و تکفین کے لئے چند وفادار سرداروں کے ساتھ لاہور بھیجدیا۔ یہ سخت غلطی تھی کیونکہ اب دارا کے ساتھ کوئی وفادار سردار باقی نہ رہا تھا۔ بہرکیف دارا تین دن تک دادر کے زمیندار کے پاس رہکر ایران کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن راستہ ہی میں ملک جیون نے اُسے دھوکا دیکر گرفتار کر لیا۔ اس وقت

دارا کے پاس ایسے بہادر سپاہی بھی نہ تھے جو اس زمیندار کا مقابلہ کرتے۔ حالانکہ اُس کے لڑکے سپہر شکوہ نے حتی المقدور مقابلہ کیا مگر بے سود۔ چالاک ملک جیون نے فوراً دارا کی گرفتاری کی خبر جے سنگھ و بہادر خاں کے پاس بھیجدی جو اس وقت دریائے سندھ کے کنارے مقیم تھے، وہ فوراً وادر پہونچے اور ملک جیون نے دارا، اُس کی دونوں لڑکیوں اور اُس کے لڑکے سپہر شکوہ کو اُن کے حوالے کر دیا۔ بس یہیں سے دارا کی زندگی کا آفتاب غروب ہونا شروع ہوگیا جے سنگھ اور بہادر خاں دارا کو ۲۳۔ اگست ۱۶۵۹ء کو دلی لے آئے اور اُسے اورنگزیب کے خاص غلام نظر بیگ کے سپرد کر دیا۔

اُسی روز بدنصیب دارا اور اُس کے پیارے بیٹے سپہر شکوہ کو جو اس وقت صرف چودہ سال کا تھا ایک چھوٹے سے ہاتھی پر جس پر گدی کے سوائے اور کچھ نہ تھا، بٹھا کر تمام شہر میں گھمایا گیا۔ یہ نظارہ بڑا دردناک تھا۔ وہی دارا جو شاہی محل میں بڑے ناز و نعم سے پالا گیا تھا جسے کبھی خواب میں بھی کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی تھی اُسی دارا کے پیروں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں، میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا، سر پر ایک معمولی پھٹی ہوئی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ گلے میں جواہرات کے بجائے اسیری کا طوق پڑا ہوا تھا۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ سر پر پڑ رہی تھی اور وہ دلی کی گلیوں میں گھمایا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ نظر بیگ ہاتھی پر بیٹھا تھا اور اُس کے چاروں طرف اورنگزیب کے سپاہی ننگی تلواریں لئے ہوئے چل رہے تھے۔ دارا مارے شرم کے اپنا سر نیچے کئے ہوئے تھا۔ راستہ میں ایک فقیر نے چلّا کر کہا کہ "اے دارا جب تو شہزادہ تھا مجھے کھانے کو دیتا تھا لیکن آج تیرے پاس میرے دینے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔" یہ سنتے ہی دارا کی آنکھ میں آنسو بھر آئے اور اُس نے فوراً اپنی پگڑی اُتار کر اُس کے آگے پھینک دی۔

جس طرف سے دارا کی سواری گذرتی تھی گھروں سے رونے چیخنے کی آواز سنائی دیتی تھی کیا بچہ، کیا بوڑھا اور کیا جوان، کیا مرد کیا عورت سبھی رو رہے تھے۔ برنیر (Bernier) ایک طالوی سیاح نے جو اس وقت دلی میں موجود تھا لکھتا ہے کہ دلی کے ہر گھر سے مرد عورت اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی ایسی دلدوز آوازیں سنائی دیتی تھیں گویا تمام شہر پر کوئی مصیبت نازل ہوئی ہے۔ مگر دارا کو کون بچا سکتا تھا جو زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا اور اورنگزیب کے سپاہی ننگی تلواریں لئے ہوئے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔

ادھر اورنگزیب نے ملک جیون کی غداری سے خوش ہو کر اُسے ایک ہزار سواروں کا سردار

بنا دیا اور بختیار خاں کا خطاب بھی دیا۔

کہتے ہیں کہ ایک دن جب ملک جیون دلّی کی سڑکوں سے گذر رہا تھا تو لوگوں نے اُسے پہچان لیا اور خوب گالیاں دیں اور اُس پر اینٹیں پھینکیں، اور عورتوں نے اوپر سے کوڑا کرکٹ پھینکا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس پر لاٹھیاں برسنے لگیں، اور وہ اور اُس کے ساتھی خوب پیٹے گئے۔ اتنے میں اورنگزیب کے سپاہی موقع پر پہونچ گئے اور اُسے بچا لیا ورنہ غریب جان ہی سے مار ڈالا جاتا

اس کے بعد اورنگزیب نے دارا کو سزائے موت کا فتویٰ دینے کے لئے بڑے بڑے ملاّؤں کو اپنے دربار میں بُلایا اور اس معاملہ پر بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی، آخر یہ طے پایا کہ دارا کو سزائے موت دیجائے۔ دانشمند خاں کی رائے تھی کہ اس کو قتل نہ کیا جائے، مگر شائستہ خاں، محمد امین خاں، بہادر خاں، اور حکیم داؤد ان سبھوں نے سزائے موت کے حق میں رائے دی۔ اور دارا کو نہ صرف سلطنت کا باغی بلکہ اسلام کا دشمن اور کافر قرار دیا۔ غرض یہ فیصلہ ہوگیا کہ دارا کو قتل کیا جائے۔

جب دارا کو اس کی خبر ملی تو اُسے بڑا افسوس ہوا اور اُس نے خود اپنے ہاتھ سے اورنگزیب کو ایک خط لکھکر بھیجا کہ "اے میرے مہربان بھائی اور شہنشاہ، مجھے قتل نہ کرو میں بیگناہ ہوں، میری جان بخشی کردو۔ تمھیں میرے ساتھ ایسا ظلم نہ کرنا چاہیئے کیونکہ آخر تم میرے بھائی ہو، مجھے کسی دُور افتادہ گوشہ میں رہنے کی اجازت دیدو تاکہ میں وہیں خدا کی عبادت کر کے شب و روز تمھارے لئے دعا مانگا کروں۔"

اِس خط کو دیکھتے ہی اورنگزیب کو بڑا غصہ آیا اور اُس نے فوراً اس کا یہ جواب لکھ بھیجا۔

"تو نے والد کے ساتھ ہوکر میرے حق میں بڑے مظالم کئے ہیں اور میری شکایتیں کر کے اُن کے دل کو میری طرف سے منحرف کر دیا ہے، اور میرے دشمنوں کو اچھی اچھی جگہیں دیں، اور ہر طرح سے میرے کاموں میں رکاوٹیں ڈالی ہیں، اپنے لڑکوں کو والد سے انعام و اکرام دلوائے، مگر میرے لڑکوں کی خبر تک نہ لی میں سب حرکتوں کو پچھلے سولہ سال سے برداشت کر رہا ہوں۔ اب مجھے تجھ سے بدلہ لینے کا موقع ملا ہے، اور موقع پاکر انسان کو چُوکنا نہ چاہیئے۔"

یہ خط پاکر دارا کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ غریب پاگل سا ہوگیا، مگر قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ اورنگزیب نے فوراً دارا کے قتل کا حکم دیدیا۔ رات کو قریب ۹ بجے ظالم نظر بیگ اور اُس کے ساتھی غلام اپنی اپنی برہنہ تلواریں لئے دارا کے قید خانہ میں پہونچ گئے جب یہ لوگ کمرے کے اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھا کہ دارا پڑا ہوا رو رہا ہے۔ اِن لوگوں کو دیکھتے ہی دارا اُن

کے قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا کیا تم لوگ مجھے قتل کرنے آئے ہو؟ اس پر غلاموں نے جواب دیا کہ "نہیں ہم لوگ صرف تمہارے لڑکے کو تمہارے پاس سے علیحدہ کرنے آئے ہیں" یہ سُن کر دارا اور بھی رونے لگا اور اُس کا لڑکا سپہر شکوہ بھی غلاموں کے قدموں پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مگر بے رحم غلاموں کو ذرا بھی ترس نہ آیا اور اُنھوں نے ڈانٹ کر کہا کہ "اُٹھ کھڑا ہو! اتنے میں سپہر شکوہ اپنے باپ کے پیروں سے لپٹ کر رونے لگا اور باپ بیٹے دونوں لپٹ لپٹ کر خوب روئے۔ دارا نے رو رو کر غلاموں سے التجا کی کہ اورنگزیب سے جا کر کہو کہ وہ کم از کم میرے بیٹے کو میرے پاس ہی رہنے دے" ان موذیوں نے ایک نہ سنی اور سپہر شکوہ کو زبردستی گھسیٹ کر ایک دوسری کوٹھری میں بند کر دیا۔ اور دارا کے قتل کی تیاری کرنے لگے۔ اسی دوران میں دارا نے بھی ایک پیش قبض جو اُس نے تکیہ میں چھپا رکھا تھا نکال لیا اور جب غلام اُسے قتل کرنے آئے تو اُس نے اُن کا اس سے مقابلہ کیا۔ اور لات گھونسے مارے مگر بے سود۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن غلاموں نے دارا کے سر کو بیدردی کے ساتھ کاٹ کر تن سے جُدا کر دیا۔ اس طرح دارا ہمیشہ کے لئے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کا سر کاٹ کر یہ غلام اورنگزیب کے پاس لے گئے جس سے اُسے دارا کے قتل کا پورا یقین آ گیا۔ اُس نے فوراً حکم دیا کہ اُس کی لاش سارے شہر میں ایک بار پھر گھمائی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور دارا کی لاش ایک ہاتھی پر رکھکر سارے شہر میں گھمائی گئی۔ آخر لاش کو بلا غسل کرائے اور بلا کسی قسم کے مذہبی مراسم ادا کئے ہمایوں کے مقبرہ کے پاس دفنا دیا گیا۔

غزل

(از لالہ نو ہریا رام صاحب درد)

نالہ ہوتا ہے آہ ہوتی ہے
کیا بُری چیز چاہ ہوتی ہے

جب وہ جلوہ طراز ہوتے ہیں
ہر طرف واہ واہ ہوتی ہے

توبہ کر کے اگر ندامت ہو
ایسی توبہ گناہ ہوتی ہے

جب وہ ترچھی نگاہ کرتے ہیں
ایک دنیا تباہ ہوتی ہے

ان بتوں سے ہمیں امید وفا
ہوتی ہے خواہ مخواہ ہوتی ہے

ہوتا ہے سر بسجدہ عشق جہاں
حُسن کی بارگاہ ہوتی ہے

عالم حُسن و عشق میں اے درد
آہ ہوتی ہے واہ ہوتی ہے۔

شکوۂ آسماں

(زلزلہ کوئٹہ)

(از مسٹر بخشی رام بھایا ساحر سابق ایڈیٹر آرجن ومدیر اعزازی "کہکشاں"۔ امرتسر)

طلوعِ صبحِ محشر ہے، بڑا بیداد گر تو ہے   نہ کوئی شام ہو جس کی وہ ظلموں کی سحر تو ہے
نہیں احساس ہمدردی جسے وہ بیخبر تو ہے   کوئی ہے کاملِ فنِ ستمرانی اگر تو ہے
یہ تیرا بے وفا و سنگدل ہونا کھلا آخر
یہ تیرا رازِ کینہ پروری افشا ہوا آخر

گرا کر بجلیاں قہر و ستم کی خاک کر ڈالا   جلا کر خرمنِ راحت کو خاکستر بنا ڈالا
چراغِ زیست کو بادِ تظلم سے بجھا ڈالا   عدم کی نیند بیدارانِ ہستی کو سلا ڈالا
ہوس کیا اور تجھے اے چرخ ناہنجار باقی ہے
بتا اب کس لئے تو بر سرِ پیکار باقی ہے

عماراتِ فلک رفعت کو مٹی میں ملایا ہے   مقیمِ اوج تھے جو اُن کو پستی میں گرایا ہے
ہزاروں خانماں آباد کو بے گھر بنایا ہے   ہزاروں بیگنہ کو خاک میں تونے سلایا ہے
چمن جو غیرتِ فردوس تھا۔ صحرا بنا ڈالا
نمونہ خلد کا اِک آن میں تو نے مٹا ڈالا

دریغا مٹ گئی وہ کوئٹہ کی شان تھی جتنی
ہوئی ہے آہ ملیامیٹ اسکی آن تھی جتنی

گلدستۂ عشرت
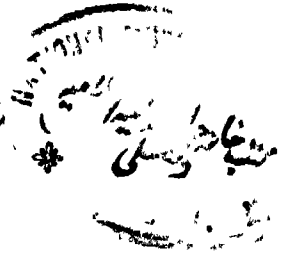
عزیز القدر برج نراین جی نگم کی شادی خانہ آبادی کے متعلق ذیل کے دو سہرے بھی شکریہ کے ساتھ درج رسالہ ہیں :-

از فکر حضرت نازش بدایونی

لیجئے خیر سے پروان چڑھا ہے سہرا — آرزوؤں کے لئے دستِ دعا ہے سہرا
رنگ ریبوں پہ ہے آمادہ گلستاں کی بہار — رخِ شفق گوں ہے۔ ہم آغوشِ صبا ہے سہرا
شکر صد شکر کہ ہے برج نراین نوشاہ — زیبِ تن سرخ قبا سر پہ بندھا ہے سہرا
ماں کی آنکھوں میں طراوت ہی انھیں پھولوں سے — باپ کا نورِ نظر بن کے سجا ہے سہرا
رہو پھل پھل کے۔ یہ کہتے ہیں لڑی کے موتی — بھائیوں کیلئے الفت کی فضا ہے سہرا
جامِ گل چاہتی ہیں جھومنے والی شاخیں — چشمِ عارف میں حقیقت کی بنا ہے سہرا
بانگِ غنچہ میں سری کشن کے نغموں کا ظہور — برج کی گوپیوں میں جلوہ نما ہے سہرا
گدگدی دل میں ہو اس طرح چلے بادِ نسیم — ہنس پڑیں پھول کہ اک شوخ ادا ہے سہرا
آنکھ رکھتا ہے گہر اس میں اشارہ کیسا — غنچہ لب بستہ ہے، پھر کیا کہے، کیا ہے سہرا
مسکراتی ہوئی کلیوں سے الگ ہے انداز — جگمگاتی ہوئی لڑیوں سے جدا ہے سہرا
عرقِ رخ ہے مسرت کے لئے آبحیات — باعثِ عیش ہے سامانِ بقا ہے سہرا
رخِ روشن کی تجلی ہے نمودِ اقبال — پاؤں پڑنے کی تمنا میں بڑھا ہے سہرا
حسن پر چاندنی راتوں کا تبسم صدقے — دیدۂ انجمِ رقصاں کی ضیا ہے سہرا
رخِ شاداب سے ہیں اسکی بہاریں قایم — حسن کی آب سے پھولا ہے پھلا ہے سہرا

شعر میں سادہ بیانی بھی ہے رنگینی بھی
نازشِ سحر زباں خوب کہا ہے سہرا

(از جناب چھوٹے لال گپتا)

زیب وہ برجِ نراین کے جو سر ہے سہرا　چمنِ حسن کا مرغوبِ نظر ہے سہرا
بھائیوں بہنوں کا مرغوب نظر ہے سہرا　باپ کا دل ہے تو مادر کا جگر ہے سہرا
رام اور شیام کی کرپا ہے، نراین کی دیا　اور کنھیا کی دعاؤں کا اثر ہے سہرا
دیکھکر جس کو کھلے جاتے ہیں کیتان نگم　کیا پسندیدۂ اربابِ ہنر ہے سہرا
دیکھکر خوش ہیں سری اور کشن نارائن　دیدۂ راج نراین کی نظر ہے سہرا
فرحتِ قلب و جگر، قوتِ جاں، راحتِ روح　اور آنکھوں کے لئے نورِ نظر ہے سہرا
نظرِ ہر کس و ناکس سے حفاظت کے لئے　رخِ نوشہ پہ نقابِ گلِ تر ہے سہرا
بوستاں جس پہ نثار، اور بہاریں قرباں　وہ مہکتا ہوا عقدِ گلِ تر ہے سہرا
بڑھتے بڑھتے نہ چھپا لے کہیں کل قامت کو　نگہِ شوق ابھی تا بہ کمر ہے سہرا
واہ رے گل کی مہک، واہ رے کلیوں کی چمک　گلشنِ حسن کی جاں، کانِ گہر ہے سہرا

کیا پھڑکتے ہوئے اشعار لکھے ہیں گپتا
لائقِ ہدیۂ اربابِ نظر ہے سہرا

جذبات فرحت

(از بابو گنگا دھر ناتھ فرحت کاپھدی بی۔اے۔ایل ایل۔بی)

بیتابیوں کو تاب کہاں ہے حجاب کی　ہر ہر ادا ہے برقِ بلا اضطراب کی
عہدِ شباب اور یہ مستی شباب کی　ہم خواب دیکھتے ہیں یہ باتیں ہیں خواب کی
پابندیِ عمل ہے چراغِ رہِ حیات　پروا نہیں ہے مجھ کو عذاب و ثواب کی
بیجا نہیں تغافلِ جاناں کبھی کبھی　روح نے نشاط ہے تلخی شراب کی
حسرت کی چھیڑ چھاڑ سے اتنی ابھر گئی　مجکو ستا رہی ہے تمنا عذاب کی
ایسے گناہگار کی قسمت کو کیا کہوں　جسکو عذاب ہی میں ہو لذت ثواب کی
بیخود بنا دیا مجھے کیفِ جمال نے　مستی میں یاد بھی تو نہ آئی شراب کی
کیوں بڑھ رہی ہیں دستِ تمنا کی شوخیاں　یہ بھی ہے اک ادا کرمِ بے حساب کی
بے سود شرحِ رازِ تمنا و آرزو　وہ بھی تھی اک امنگ جوانی کے خواب کی
مشقِ ستم کو پردۂ الفت سمجھ لیا　کیا سادگی ہے فرحت ناکامیاب کی

علمی نوٹ اور خبریں

سوبۂ متحدہ کی سالانہ انتظامی رپورٹ بابتہ ۱۹۳۳-۳۴ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اخباروں اور رسالوں کو چھوڑ کر پچھلے
اس صوبہ میں تین ہزار چھ سو بارہ کتابیں شائع ہوئیں، اس سے پہلے سال کی مطبوعات کی تعداد تین ہزار تین سو پچاس تھی
وسو باسٹھ کتابوں کی ترقی ہوئی۔ اس سال کی کتابوں میں دو ہزار دو سو چالیس یعنی ۶۲،۲ فیصدی ہندی اور تین سو اٹھتر
۴،۱۰ فیصدی اردو اور ایک سو اٹھائیس سنسکرت کی تھیں۔ اردو کی کتابیں نہ صرف تعداد بلکہ دیگر لحاظ سے بھی بہت
لی درجے کی تھیں۔ اس کے برعکس ہندی کے مصنفین کی سرگرمیاں قابل داد ہیں۔ ہندی کتابیں سائنس، بیطاری، فن تالیم
عامہ، فلاح دیہات، فن زراعت اور سوانح عمری وغیرہ کے متعلق تھیں۔ مگر جہاں تک اخباروں اور رسالوں کا تعلق ہے اردو
دو سو پینسٹھ اور ہندی میں دو سو تینتیس پرچے شائع ہوئے۔ پچھلے سال کے مقابلہ میں اس سال چھتیس کا اضافہ ہوا۔
ں سے ۵۳ فیصدی اخبارات کے اڈیٹر ہندو، ۴۱ فیصدی کے اڈیٹر مسلمان اور پانچ کے اڈیٹر عیسائی تھے۔ اشاعت
ب کی تعداد وغیرہ کے لحاظ سے صوبہ کے مختلف شہروں کا درجہ حسب ذیل رہا:۔ (۱) الہ آباد (۲) لکھنؤ (۳) کانپور
، بنارس (۵) آگرہ (۶) میرٹھ۔ زیادہ تر اخباروں اور رسالوں کی اشاعت محدود ہے۔ اردو اور انگریزی کے
ٹ گیارہ پرچوں کی اشاعت چار چار ہزار سے زیادہ ہے ہمارا خیال ہے کہ ہندی اخباروں کی اشاعت اردو پرچوں
ںیں زیادہ ہے۔ انگریزی اخبارات میں غالباً ہمعصر لیڈر الہ آباد کی اشاعت سب سے زیادہ ہے۔ اس نامور روزنامہ
قائم ہوئے پچیس سال ختم ہو چکے ہیں۔

بنگال کے مشہور ڈرامہ نویس مسٹر ہریشچندر رکار آجکل ہندوستان کے تمام علاقوں کی دیہاتی نظمیں اور گیت جمع
نے میں مصروف ہیں۔ آپ نے ۔۔۔ دہ بنگال کی پرانی نظمیں اور گیت جمع کر لئے ہیں اور اب دوسرے صوبوں میں تحقیقات
رہے ہیں۔

ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب اورچھا نے ہندی زبان کے شعرا کی حوصلہ افزائی کیلئے ہر سال کی بہترین منظوم تصنیف
، دو ہزار روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔

افسوس کہ ۱۵ جون کو تعلیم نسواں کے زبردست حامی اور دار الاشاعت پنجاب کے بانی رسالہ "پھول" اور "اخبار تہذیب نسواں"
ے مالک شمس العلما مولانا سید ممتاز علی صاحب کا قلب کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی شروعات
پ ہی کی کوششوں سے ہوئی۔ پنجاب میں اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے آپ نے تمام عمر جو شاندار خدمات انجام دیں وہ آپ اپنی
ظیر ہیں۔ آپ سر سید کے رفیق کار اور شمس العلما آزاد کے شاگرد رشید تھے جس حسن عقیدت۔ قابلیت عرقریزی اور دلسوزی
ے ساتھ آپ نے "دربار اکبری" کی اشاعت کا انتظام کیا وہ پچھلی صدی کا ایک بہترین ادبی کارنامہ ہے۔ آپ کی
ات گرامی بہت سے اوصاف حمیدہ کا مجموعہ تھی۔ آپ کی وفات سے اردو زبان کو ناقابل تلافی صدمہ ہوا ہے۔ گو
، بات تسلی بخش ہے کہ آپ کے لائق فرزند سید امتیاز علی تاج آپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، اور ایک مدت سے آپکی
ہدایت و نگرانی میں تصنیف و تالیف اور اشاعت کا کام کر رہے ہیں، اور آپ ہر طرح سے اس قابل ہیں کہ آپ کی تمام علمی
خدمات کو ترقی کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔

بالوں کا طلسم

"استری کا موہنی" اور "بالوں کا طلسم" ڈاکٹری قاعدہ کی رو سے بنے ہوئے سپر فائن ہیر آئل اور پدمنی ہیر واش کے استعمال سے بیسوں گنا بڑھ جاتا ہے۔ اول الذکر تیل ناریل وغیرہ کے نباتاتی مرکب تیل سائینٹفک حکمت سے شدھ کرکے بنتا ہے۔ اس سے کپڑے چکنے نہیں ہوتے تو بھی بال ملائم رہتے ہیں اسکی خوشبو دیرپا ہے اس کے اندر خاص ترکیب سے جو ادویات ملائی جاتی ہیں انکی تاثیر سے جلن۔ بفا وغیرہ بیماریاں رفع ہو کر بال ہر آفت سے محفوظ رہتے ہیں۔

پدمنی ہیر واش۔ بالوں کی جڑوں سے زہریلا مادہ اور میل صاف کرکے انھیں خوب نکھارتا اور چمکاتا ہے۔ دونوں کے سحر سے گنج رفع اور بال گرتے بند ہو جاتے ہیں۔ برسوں کے اترے ہوئے بال جمانے میں بیحد موثر اور استریوں اور لڑکیوں کے بال کمر تک بڑھانے، بدرنگ ہوتے بال چمکانے اور دلفریب اور آبنوس ایسے بنانے میں جادو صفت۔ چھوٹی عمر میں سفید بال رونما نہیں ہو سکتے۔ پدمنی تیل اور پدمنی پوڈر کی قیمت الگ الگ۔ ایکروپیہ فی بوتل بلا محصول

بڑھاپے میں جوانی کے مزے۔ گو زبان سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں آسکتی۔ مگر جوانی کے نشہ میں کھوئی ہوئی طاقتیں بحال ہو سکتی ہیں۔ اگر آپ حیرت انگیز راجندر نروٹانک کام میں لائیں۔ یہ ساٹھا پاٹھا کا بیمہ اور اعضاء رئیسہ کو تحریک و جولانی بخشتی ہے۔

بچہ کی ولادت۔ محرقہ وغیرہ سے پیدا شدہ ناتوانی رسوداوی شکایات اور ادھیڑ عمر کی حمایۃ تکالیف اور ہر قسم کے درد ریح میں اکسیر اعظم ہے۔ دماغی مشاغل کے شوقینوں اور بیٹھ کر کام کرنے والوں کیلئے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ سستی۔ پست ہمتی۔ دھڑکن اور نظام اعصاب کی کمزوری کا بیخطا علاج حافظہ اور ہاضمہ کو جولانی دیتی ہے۔ یہ خوشگوار اور مفرح قلب ہے اسکے سحر سے بڑے جوانی کی چستی اور توانائی دوبارہ حاصل کرتے ہیں اسکا اثر دیرپا اور ہر موسم میں مفید ہے قیمت فی بوتل ڈھائی روپے بلا محصول۔

پدمنی پمپل کریم۔ جوانی کی پھنسیوں کیلئے۔ کالے بھورے داغوں کیلئے اکسیر۔ جھائیں۔ چھیپ۔ ہر قسم کے زہریلے پھوڑے پھنسی۔ زخم۔ گرمی دانے۔ کھجلی اور بچوں کے سر منہ اور بدن کی پھنسیوں کا حکمی علاج۔ شروع میں لگانیسے داد۔ چنبل جڑ نہ پکڑ سکیں گے اگر چنبل یا کسی اور بیماری سے جلد بدنما اور کھرکھری ہو جائے تو اس سے صاف اور خوشنما ہو جاتی ہے مچھر پسو کے کاٹے کا پختہ علاج اور جلد کی سطحی شکایات کیلئے از حد مفید ہے۔ مجرب اس اکسیر سے ناآشنا ہے قیمت فی بوتل ایکروپیہ علاوہ محصول۔

راجندر ٹوتھ پوڈر۔ منہ کی بدبو۔ دانتوں میں پانی لگنے۔ مسوڑھوں سے خون بہنے اور ریح دندان کے لئے اکسیر ہے۔ پایوریا کے لئے نافع۔ دانتوں کی پلاہٹ اور سیاہی رفع کرکے انھیں چمکاتا اور جملہ شکایات سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ اٹھارہ سال کا مجرب ہے۔ قیمت فی بوتل ایک روپیہ علاوہ محصول ہے

یہ سب چیزیں رجسٹرڈ ہیں۔

المشتہر

ڈائرکٹر پدمنی ٹائلیٹری۔ گوالمنڈی۔ لاہور

شائع ہوگیا ہے

ہز ہولی نس صاحب جی مہاراج کی

شہرہ آفاق تصنیف

یتھارتھ پرکاش

حصہ سوم

جس کے پہلے دو حصوں نے سال گذشتہ میں مذہبی دنیا میں ہلچل پیدا کردی تھی چھپکر شائع ہوگیا ہے۔ اِس حصہ میں آریہ سماجی۔ سناتن دھرمی وسکھ مذہب کی دھرم پستکوں سے سیکڑوں حوالجات پیش کرکے پیروان رادھا سوامی مت کی اُن مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے جن کی وجہ سے وہ اِن بھائیوں کے ہم خیال بننے سے قاصر ہیں نیز واضح کیا گیا ہے کہ

سچے رشیوں۔ پیغمبروں۔ سنتوں کی مذہبی تعلیم میں بیّن مشابہت ہے

امید ہے کہ متلاشیان حق اس نادر تصنیف کا بغور مطالعہ کرکے اپنے لئے فیصلہ کرسکیں گے کہ اصلی وسچا روحانی مذہب کیا ہے۔

کاغذ سفید چکنا حجم ۳۲۸ صفحہ سائز $\frac{۲۰×۲۶}{۸}$ مجلد

قیمت دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ

اسٹورکیپر دیال باغ۔ آگرہ

(نوٹ)

سکریٹری صاحبان برانچ ست سنگھ یہ کتب اپنے ہاں فروخت کیلئے رکھ سکتے ہیں اور قیمت فروخت ہوجانے پر بھیج سکتے ہیں۔

ایک روپیہ اور سوا دو روپیہ میں تمام دوافروشوں سے ڈبیہ ملتی ہے۔

خالص ترین جڑی بوٹیوں سے بنایا جاتا ہے

زمبک

Zam Buk

پیپس
PEPS

ہاف ٹون عکسی تصویریں

جن کی قیمتیں نصف کر دی گئی ہیں

رنگین فی تصویر ۱ر	سادہ فی تصویر آدھ آنہ
مسیح ابن مریم۔ نغمہ محبت	ڈاکٹر انصاری۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل
موسم سرما۔ باد بہاری	مصطفےٰ کمال پاشا کی ترکی کونسل
انتظار۔ خواب راحت	میراں صاحب۔ میر جعفر
گل بیچ روز۔ رفیق طفلی	دربار شاہ عباس
شکستہ امید۔ فضیلت۔ مشعل ہدایت	(موٹی تصویریں) چیت۔ بیساکھ
تار شکستہ۔ روح اور کمان	جیٹھ۔ اساڑھ۔ ساون۔ بھادوں
نورجہاں کا حسن۔ مدبر سیٹھ چمپالال	ماگھ۔ پھاگن۔ گوتم بودھ
شہنشاہ جہانگیر کی چوگان بازی	کالی داس۔ اکبر اعظم۔ مولانا شبلی
پیام محبت۔ کثرت میں وحدت	شمس العلماء ذکاء اللہ۔ سروجنی نیڈو
وقت نزع۔ کرشن جی جسودا جی	مرزا انشا۔ پنڈت بشن نراین در۔
نظیر کا آثار۔ راج آج کا ملاپ	ڈاکٹر نذیر احمد خاں۔ لارڈ ارون
بھکارنی۔ گنگا اور بھیشم	میر عشق لکھنوی۔ حضرت انیس
سمندر شانتی۔ امیدواری	حضرت سرمد۔ مولوی عزیز مرزا
مہاراجہ پرتھی راج۔ شیواجی	بابو بالمکند گپتا۔ منشی احمد علی شوق
اور اعماس۔ جنگ یورپ	مرزا سلطان احمد۔ مرزا رسوا
کا ایک منظر۔ ایک قدیم مشرقی	مولانا آزاد دہلوی۔ جناب چکبست
مدرسہ۔ عقل کی تیاری۔	حضرت صفی۔ ڈاکٹر اقبال۔
راجہ کمانڈ کے بچے کا قتل	سر سالار جنگ۔ مسٹر تلک۔ جسٹس محمود۔
باسدیو اور دیو کی نندن	نواب محسن الملک۔ جسٹس لالچند
اکبر اور چیتے کا شکار	مسٹر گوکھلے۔ مسٹر داس مرحوم۔
عہد مغلیہ میں شاہی سواری کا جلوس	مہاتما گاندھی۔ پنڈت موتی لال نہرو
محاصرہ چتوڑ۔ ٹیپو سلطان	لالہ لاجپت رائے۔ ڈاکٹر سپرو
پیدائش شاہزادہ سلیم	راجہ محمود آباد۔ لارڈ سنہا۔ سر آغا خاں
دربار جہانگیر میں سفیر فارس	مولانا محمد علی۔ سوامی شردھانند

ملنے کا پتہ منیجر زمانہ پریس کانپور

کسان

(اُس کے افلاس کے وجوہ اور اُن کا علاج)

مصنفہ

چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم-ایل اے، ایم-ایل سی

مترجمہ جناب محمود علی خاں صاحب جامعی

قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی؟ پھر کس طرح رفتہ رفتہ اس کو خوشحالی سے محتاج کیا گیا؟ کس طرح ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا گیا؟ اور کس طرح ایک صنعتی ملک کو زرعی ملک بنا دیا گیا؟ اب کسان کی حالت کتنی دردناک ہے کہ اُسے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھر کھانے کو دو وقت روٹی بھی نہیں ملتی اس کا اصل سبب کیا ہے اور کس طرح کسان پھر خوشحال ہو سکتا ہے؟

اِن سب چیزوں کا اگر آپ جواب چاہتے ہیں تو یہ کتاب ملاحظہ کیجئے۔ کسان کی مفلسی ملک کی مفلسی ہے، کسان کی خوشحالی ملک کی خوشحالی ہے۔ لہٰذا جو لوگ موجودہ درد کی دوا چاہتے ہیں انھیں کسان کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔ یقین ہے کہ اس موضوع پر اردو میں اس سے بہتر کتاب ابتک پیش نہیں کی گئی ہے۔ کتابت طباعت۔ کاغذ اعلیٰ۔ ضروری ہے کہ ملک کا ہر بہی خواہ اسے بار بار پڑھے اور اس پر عمل کرے تاکہ غریب ہندوستان کے دن دوبارہ پھر جائیں۔ کتاب پریس میں جا چکی ہے اور عنقریب شائع ہو جائیگی۔ فوراً فرمایش بھیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت عمر

قیمت پیشگی بھیجنے والوں کو محصول ڈاک معاف

ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ دہلی